منبر کا دوسرا نام

حالات رشید ترابی
شراب



ترتیب:
امیر حسین



امیر حسین

امیر حسین نہ صرف بلا کے خوش نگار ہیں بلکہ خوش خط اور خوش گو بھی ہیں۔

یہ نوجوان مجھے بہت عزیز ہیں اور اُن کے مستقبل سے مجھے بیحد دلچسپی ہے، ایسے احساسات کا اندازہ لگاتا ہوں تو لرز جاتا ہوں، ان کی استقامت اور تحمّل قابلِ داد ہے، انکی ذہانت، سعادتمندی اور فرض شناسی ایک دن ضرور رنگ لائے گی اور وہ بحیثیت قلمکار اعلیٰ درجے کا معیار قائم کریں گے۔

(احمد ندیم قاسمی)

امیر حسین ایک صالح نوجوان ہیں اور قابلِ رشک ادبی ذوق رکھتے ہیں، اُن کا اندازِ تحریر سادہ ہونے کے باوجود نہایت دلنشین اور پُر اثر ہے، اُن میں شوق بھی ہے اور عزم بلند بھی، ان کی جوانی نہ کاہل ہے نہ سہولت پسند۔ علامہ ترابی کے متعلق کتاب کا مواد مہیا کرنے میں جو انہوں نے کاوش کی ہے وہ لائقِ تحسین ہے، خدا ان کی محنت کو پروان چڑھائے، میں ابھی سے ان کے مستقبل کو روشن دیکھ رہا ہوں، اللہ انہیں نظرِ بد سے محفوظ رکھے اور ارادوں میں کامیاب کرے آمین۔

(احسان دانش)

منزل کا دوسرا نام

جلد اوّل

ترتیب : امیر حسین

ابوتراب (شعبہ مطبوعات) کراچی

اشاعت : اوّل

تعداد : ایک ہزار

سرورق : تنویر خضر

طباعت سرورق : کراچی جاب پریس

کتابت : غضنفر علی رحمانی

مطبع : مشرق پریس کراچی

تاریخ اشاعت : جنوری ۱۹۷۵ء 2016

قیمت : [redacted] (سفید کاغذ)

ناشران : ابوتراب انٹرپرائز (شعبہ مطبوعات)

۲۴۷/اے - النور چیمبر (دوسری منزل) پریڈی اسٹریٹ صدر کراچی۔



ہے ترے ذکر کی عطا ذکرِ رشید ہے یہاں
سب کو میں یاد رہ گیا صدقے تری یاد کے

ترتیب

ایسا خطیب جس پہ خطابت ہو خود نثار

(علامہ رشید ترابی کی رحلت پر ملک کی ممتاز شخصیتوں کا ردِ عمل)

وزیر اعظم بھٹو، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا کوثر نیازی، گورنر پنجاب،
مولانا احتشام الحق تھانوی، سابق گورنر جنرل موسیٰ، اسپیکر قومی اسمبلی، خان عبدالقیوم خان

بہت روؤ گے مجھ کو یاد کر کے

(قومی اخبارات کا اظہار تعزیت)

جنگ، مشرق، حریت، ڈان، مارننگ نیوز اور امروز (لاہور)

روشنی زاویے بدلتی ہے

(علامہ رشید ترابی مہد سے لحد تک)

لائف اسکیچ اور یادگار تصاویر

اب اسے ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لیکر

(تاثرات و احساسات)

فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی، احمد ندیم قاسمی، احسان دانش، ابراہیم جلیس
ڈاکٹر عالیہ امام، آغا شورش کاشمیری، علامہ عباس حیدر عابدی، احمد فراز، ہاشم رضا

حکیم محمد سعید دہلوی، مولانا احتشام الحق تھانوی، صدر آزاد کشمیر، سید محمد تقی، ضیا الحسن موسوی، نیر زیدی، علامہ محمد رضی، ریاض فرشوری، افتخار عارف، حسین اعظمی، ملنگ حیدری، بادشاہ حسین، مظفر علی شمسی، آغا مسعود حسین، مجنوں گورکھپوری، ملکہ بلتستانی، خادم علی، ناصر زیدی، شبیر نیازی، سچے، سحر انصاری، یاور مہدی اور منور عباس ایڈووکیٹ۔

آسماں تری لحد پہ شبنم افشانی کرے

(علامہ رشید ترابی فنکاروں کی نظر میں)

روبن گھوش، شبنم، آغا نذیر کاوش، خلیل احمد، کمال ایرانی، منور سعید، آغا طالش، ابراہیم نفیس، یوسف خان، دلجیت مرزا، لالہ سدھیر، اسد بخاری

اب خود تری آواز کو ترسے گی سماعت

(منظوم خراج عقیدت)

آغا شورش کاشمیری، رئیس امروہوی، نسیم امروہوی، صہبا اختر، دلاور فگار، سید آل رضا، ضیا الحسن موسوی، انوار عزمی، سرور بنجلی، مرزا فتح علی بیگ قزلباشی، سبط حسن انجم، آرزو اکبر آبادی اور دیگر

ترابیات

علامہ مرحوم کی منتخب تحریریں، تقریریں، کلام، ڈائری کے اوراق، بہادر یار جنگ قرجلا لوی، معاملۂ خصوصی اور بانیٔ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کے خصوصی خطوط اور ربولا علامہ کے معرکہ آلا را خط کا انگریزی ترجمہ۔

زندگی مسندِ گل اوروں کی ہو گی ہم لوگ
رقص کرتے ہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر

خوبصورت اور شاداب ذہنوں کے ادارے
ابوتراب انٹرپرائزز کی آرگنائزنگ کمیٹی

امیر حسین — شاہد حسین
تسنیم زیدی — آمنہ حسن

ہم خود تراشتے ہیں منازل کے سنگِ راہ
ہم وہ نہیں ہیں جن کو زمانہ بنا گیا

کہانی اور کہانی کا بیٹیا

نصیر ترابی

ہر انساں ایک قصہ ہے ترابی کیا سنے کوئی
سلیقے کی کہانی ہو تو دل مشتاق ہوتا ہے

صاحبو! سنا تم نے ہر انسان گویا ایک قصہ ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ کہانی خط سلیقے کی ہو اور اگر سلیقہ نہیں ہے۔ تو پھر اس کارخانۂ صوت وصدا میں دلوں کی دلدہی کے لئے اور بہت سے سلسلے بھی ہیں۔ سنا تم بھی تو ایک سلسلہ ہے دلدہی و دلداری کا انمٹ سلسلہ۔ صاحبو! میں تمہاری اس زمین کی ان گنت کہانیوں میں ایک سلیقے کی کہانی کا راوی ہوں۔

میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے۔ ؎

۱۵ جولائی ۱۹۰۸ء کو جب خورشید طلوع ہوا تب یہ کہانی شروع ہوئی ابتداء ہی سے اس کہانی کی تشکیل و ترتیب میں اور بہت سی کہانیوں کا حصہ رہا ہے اس کہانی میں ابو بکر شہاب، سید علی شوستری، مولانا سبط حسن، خلیفہ عبدالحکیم، نظم طباطبائی، نواب بہادر یار جنگ و مُلّا اعظم جیسی عظیم کہانیاں بھی شامل ہیں صاحبو! یہ کہانی کتابوں اور علمی صحبتوں کی کہانی ہے۔ یہ کہانی تختیوں اور مشقتوں کی کہانی ہے۔ یہ ایک تحریک کی کہانی ہے۔ یہ کہانی فکری انقلاب اور اجتماعی شعور کی کہانی ہے۔ یہ زندگی کے نصب العین سے دیانتداری اور ایثار کے ساتھ وابستگی کی کہانی ہے۔ یہ اردو زبان اور اسلام کی کہانی ہے۔

اس کہانی نے مجھے یہی بتایا کہ اے کہانی کے بیٹے تو اپنی زندگی کو دوسری زندگیوں کے درمیان محسوس کر۔ دیکھ یہ احساس تجھے کتابوں سے ملے گا۔ کتابیں تجھے خود غرضیوں سے دور رکھیں گی۔ اور اس طرح تیری اپنی کہانی دوسری بڑی کہانیوں سے ہمکنار ہو جائے گی۔ اے کہانیوں کے سننے والو! یہ کہانی در اصل میرے گھر کی چار دیواری میں ایک کل وقتی مدرسے کی کہانی ہے۔ میرا یہ مدرسہ ۱۸ مارچ ۱۹۷۳ء کی رات کو بند ہو گیا۔ لیکن فسردہ ہو تہیں کہ اس مدرسے کی دراز پرچھائیاں گردش طلوع وغروب سے بے نیاز اب میری روح کی گہرائیوں میں اتر گئی ہیں۔

اے بنجر زمینوں کو سرسبز کرنے والے! تو اس کہانی کی تازگی سے میری سانسوں کو اور معطر کر دے۔ اے روشنیوں کو آسمانوں سے نازل کرنے والے! اس مدرسے کی روشنی کو میری بینائی بنا دے۔ اے مدرسوں کے سب سے بڑے مدرسے! اے کہانیوں کی سب سے بڑی کہانی تو میرے وطن کے بہکتے شہروں اور ان بہکتے شہروں کے چمکتے گھروں کو ایسی ہی کوئی کہانی ایسا ہی کوئی مدرسہ عطا کر۔ ع

اپنی اضافتوں سے ہے کچھ تازگی رشید
انسان سن رہا ہے کہانی سنی ہوئی

سنگِ میل جو گزر گیا

آپ کے نام

ابوتراب انٹرپرائزز کے شعبہ مطبوعات کی پہلی کتاب آپ کے سامنے ہے اس کتاب کو منظرِ عام پر لانے کے لیے میں نے اور میرے رفیقِ کار شاہد حسین صاحب نے رات کے کن سناٹوں اور دن کے کن ہنگاموں میں کیا کیا سعی و جہد کی ؛ راستے کی کس کس سنگلاخ چٹان کو ریزہ ریزہ کر کے آگے بڑھے ؟ یہ ایک تفصیل طلب روداد ہے جس کا اظہار اس قدر عام ہوا کہ روایت بن گیا ، چونکہ ابوتراب انٹرپرائزز کا نصب العین تجارت کے ساتھ ساتھ اپنے معاشرے میں رائج "بری اور عام" روایتوں کی بت شکنی بھی ٹھہرا ہے۔ اس لیے اپنی جہد کی کہانی سنا کر ہم کسی بھی معاملے میں ، "رجعت پسند" نہیں کہلانا چاہتے ۔ ہم عباؤں ، قباؤں اور مقدس پیشانیوں سے آراستہ نہ سہی لیکن ہم آج کے انسان ہونے کے باوجود مذہب اور ملک کے کام آنے کا امکان کی حدوں تک حوصلہ رکھتے ہیں ۔ اور اپنے اس مشن کو آگے بڑھانے کے لیے ابلاغ کے ہر میڈیئے سے اپنا پیغام لوگوں تک پہنچاتے رہیں گے ۔ ہمارا مقصد اور نصب العین زیست کے اعلیٰ مقاصد کا حصول ہے ۔ ہم اپنے منتشر اور شکستہ معاشرے میں وفادار ، باشعور اور اچھا شہری بننے کی تحریک کو فروغ دینا چاہتے ہیں ۔

ہم مسلمان ہیں اور ابوترابی بن کر ملتِ اسلامیہ میں اتحاد کی ترویج چاہتے ہیں ۔

اس سے زیادہ فی الوقت ہم آپ سے کچھ نہیں کہیں گے اس لئے کہ محض باتیں کرنا ہمارے ادارے کا منشور نہیں، عمل اور عمل ہمارے ادارے اور ہماری زندگی کا آئین ہے اور اس آئین کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہم موسموں کے تغیرات اور ناموافق حالات کی پرواہ کئے بغیر اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہیں گے۔ "منبر کا دوسرا نام" ہماری منزل کے راستے کا ایک سنگِ میل تھا جو گزر گیا۔

بحیثیت مصنف، مؤلف یا مرتب' عالم اسلام کے لازوال خطیب حضرت علامہ رشید ترابی پر ان کی عظمتوں سے ہم آہنگ ایک بھرپور کتاب کا اجرا کرنا، میری کس قدر دیرینہ خواہش تھی اس کے شاہد میرے بچپن کے دوست محمد نصیر خان ذرسطِ نیشنل سٹی بنک عادی ہیں، ترابی صاحب پر کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں خود ان کی زندگی میں میری ان سے بارہا فون پر اور بالشافہ گفتگو ہوئی لیکن چونکہ علامہ مرحوم ایک روایت شکن خطیب، با اخلاق عالم، اور نام و نمود کی خواہشوں سے بے نیاز انسان تھے اس لئے وہ ہر بار کوئی نہ کوئی معروضہ پیش کر کے گویا اپنا پہلو بچا گئے میں نے دیکلی پیمان کراچی میں رہ کر اب تک ملک کے ان گنت نامور علماء، ادباء شعراء اور سیاسی شخصیتوں کے انٹرویوز کئے لیکن حیف کہ علامہ رشید ترابی کے انٹرویو سے محض اس لئے محروم رہا کہ اولاً عام مشہور لوگوں کی طرح انہوں نے اس معاملے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی، دوسرے، علامہ مرحوم کی ناسازئ طبع، مصروفیات اور ان کی دیگر ذمہ داریوں نے مجھے اس اجمال کی تفصیل میں نہیں جانے دیا۔ زیر نظر کتاب کو بھرپور بنانے کے سلسلے میں علامہ مرحوم کے صاحبزادے برادرم نصیر ترابی کے پُرخلوص تعاون کے لئے ادارہ ان کا ممنون ہے۔

"منبر کا دوسرا نام" کی دوسری جلد جو مستقبل قریب میں منظر عام پر آرہی ہے اسکے اجراء کی ضرورت محض اس احساسِ ذمہ داری کا پس منظر ہے کہ پہلی جلد میں جو

کمی رہ گئی ہے وہ دوسری جلد پوری کر سکے اور "منبر کا دوسرا نام" علامہ رشید ترابی پر حقیقتاً ایک تاریخ اور ایک دستاویز ثابت ہو۔

"منبر کا دوسرا نام" کا پہلا حصہ پیش خدمت ہے ہم اپنی کوششوں میں کس درجے کامیاب رہے اس کا فیصلہ ظاہر ہے آپ ہی کریں گے۔ از راہ نوازش ہمیں خط لکھ کر ہماری کوتاہیوں سے ضرور آگاہ فرمایئے گا۔

شکریہ!

امیر حسین

جنوری ۱۹۷۵ء

ایسا خطیب جس پہ خطابت ہو خود نثار

علامہ رشید ترابی کی رحلت پر ملک کی ممتاز شخصیتوں کا ردعمل

میرا دوسرا نام



حضرت علامہ رشید ترابی کی رحلت پر

وزیراعظم بھٹو کا خراج عقیدت

وزیراعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو نے خطیب عالم اسلام حضرت علامہ رشید ترابی کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے بیگم رشید ترابی کے نام اپنے تعزیتی تار میں کہا کہ آپ کے قابل احترام شوہر علامہ رشید ترابی کی وفات پر مجھے دلی صدمہ ہوا ہے۔ ہماری جانب سے دلی تعزیت قبول کیجیے۔ اللہ تعالیٰ علامہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور سوگوار خاندان کو یہ ناقابلِ تلافی نقصان برداشت کرنے کا حوصلہ عطا کرے۔

ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۵- اے ذیلدار پارک - اچھرہ
لاہور - (پاکستان)
فون نمبر : ۲۵۰۷ ۵
حوالہ ....
تاریخ ....

محترمی و مکرمی امیر حسین صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ مجھے بڑا افسوس ہے کہ آپ یہاں مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے مگر ملاقات نہ ہو سکی۔ دراصل میری صحت اب اتنی خراب ہو چکی ہے کہ دوسرے مشاغل کے ساتھ ملاقات کا سلسلہ بھی مجبوراً محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اگر طبیعت ٹھیک ہوتی ہے تو آنے والے اصحاب سے عصر کی نماز کے وقت یکجا مختصر ملاقات ہو جاتی ہے، ورنہ ناچار معذرت کر دی جاتی ہے۔

علامہ رشید ترابی مرحوم کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ یہ پسند کرتے تھے کہ اہلسنت اور اہل تشیع اپنے اختلافات کو اتنی اہمیت نہ دیں کہ اتفاق کی بنیادیں بالکل نگاہ سے اوجھل ہو جائیں۔ میں نے ان کی وفات پر تعزیتی پیغام ارسال کیا تھا۔ حیدرآباد دکن میں وہ ایک مدت تک نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے رفیق کار رہے اور انجمن اتحاد المسلمین کے پلیٹ فارم سے ان کی تقاریر ہوا کرتی تھیں۔ اردو اور انگریزی میں انہیں اچھی مہارت حاصل تھی اور فن خطابت میں اللہ تعالیٰ نے خاص ملکہ عطا کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جوار رحمت میں جگہ دے۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

مولانا کوثر نیازی

وفاقی وزیر مولانا کوثر نیازی جو اُس وقت اوقاف و حج کے علاوہ اطلاعات و نشریات کے وزیر بھی تھے، انہوں نے علامہ رشید ترابی کی وفات پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ اسلام اور پاکستان کے لئے مرحوم کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی اور ان کی یاد آنے والے طویل وقتوں تک باقی رہے گی انہوں نے کہا کہ موت نے ہم سے ایک ایسے خطیب کو چھین لیا ہے جن کی خطابت کے ساتھ ان کا تبحر علمی بھی شامل تھا، مولانا نے کہا کہ علامہ کی وفات میرا اپنا غم ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور سوگوار خاندان اور علامہ کے لاکھوں عقیدتمندوں کو ان کی جدائی کا غم برداشت کرنے کی طاقت عطا فرمائے۔

صادق حسین قریشی گورنر پنجاب

پنجاب کے گورنر جناب صادق حسین قریشی نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ مجھے علامہ رشید ترابی کی رحلت کی خبر سے شدید دلی صدمہ پہنچا ہے۔ علامہ رشید ترابی کی اہلیہ کے نام اپنے تار میں گورنر پنجاب نے کہا کہ مرحوم ہمارے ان علماء میں سے ایک تھے جنہوں نے اپنی زندگیوں کو اسلام کی بے لوث خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا ان کی وفات کا سوگ برصغیر پاک و ہند کے کروڑوں مسلمان منائیں گے، پاکستان ان کی وفات سے ایک عظیم اسکالر سے محروم ہو گیا

ہے، گورنر نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور سوگوار خاندان کو یہ غم برداشت کرنے کی ہمت عطا کرے۔

مولانا احتشام الحق تھانوی

ممتاز عالم دین مولانا احتشام الحق تھانوی نے علامہ رشید ترابی کی رحلت پر گہری تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ مرحوم کی وفات سے پاکستان اپنے ایک عظیم مذہبی رہنما اور خطیب سے محروم ہو گیا ہے۔ مولانا نے کہا کہ علامہ رشید ترابی کی قومی اور مذہبی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

سابق گورنر جنرل محمد موسیٰ

سابق گورنر جنرل محمد موسیٰ نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ علامہ رشید ترابی کا انتقال ملک اور قوم کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ علامہ مرحوم ایک عالم دین اور عظیم مفکر تھے جن کے برصغیر میں ہزاروں عقیدتمند موجود ہیں، ہرچند کہ علامہ رشید ترابی اب ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کے خیالات اور عالمانہ باتیں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

اسپیکر قومی اسمبلی

قومی اسمبلی کے اسپیکر صاحبزادہ فاروق علی خان نے علامہ رشید ترابی کی وفات پر اظہارِ غم کرتے ہوئے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہمیں ایک عظیم اسکالر سے محروم کر دیا ہے۔ وہ ہمارا قومی اثاثہ تھے، انہوں نے مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی اور پسماندگان سے دلی ہمدردی ظاہر کی۔

خان قیوم خان

وفاقی وزیر داخلہ خان عبد القیوم خان نے علامہ رشید ترابی کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم ایک ممتاز عالم تھے انہوں نے پاکستان اور اسلام کے لئے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

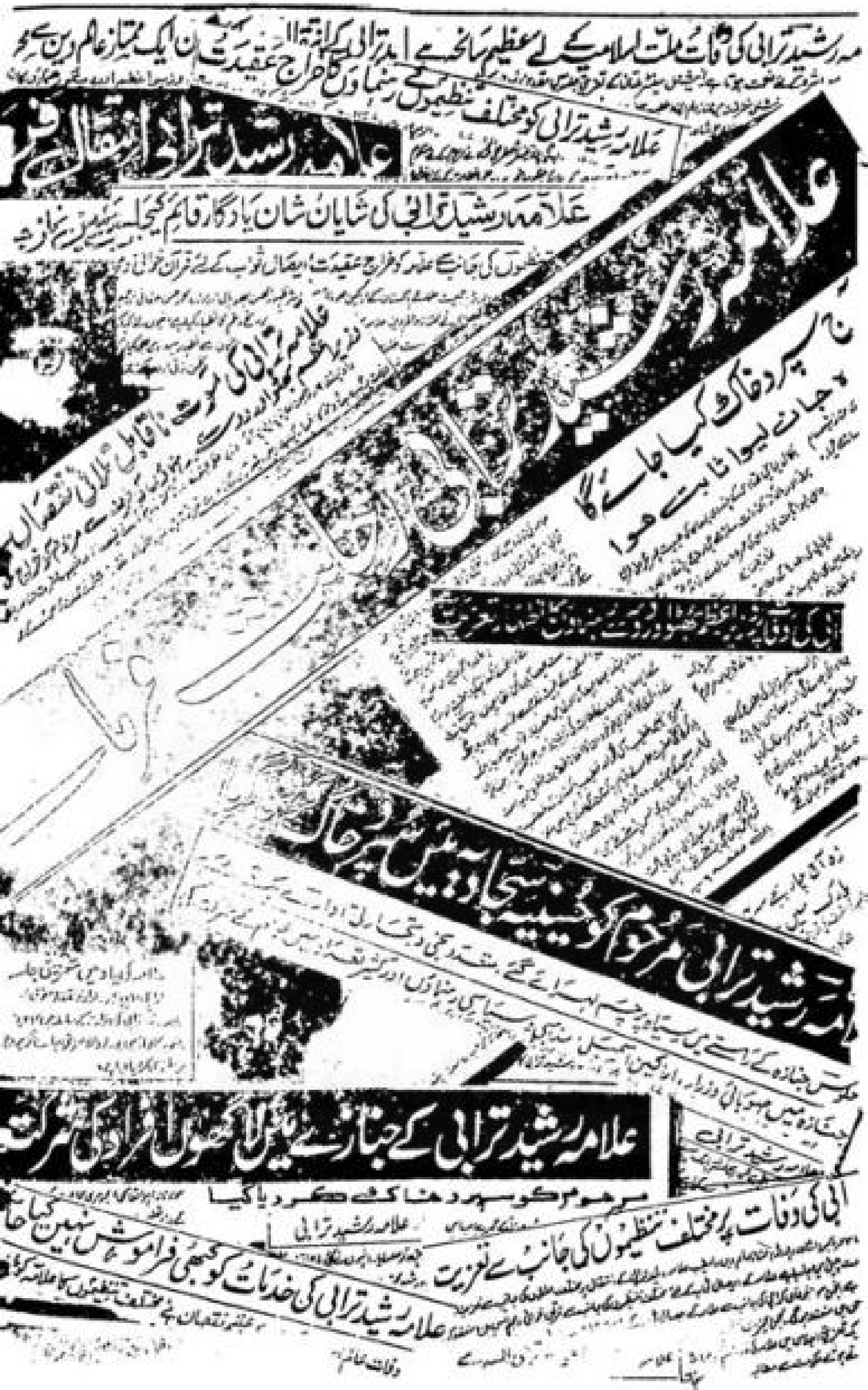
علاوہ ازیں

بیگم نصرت بھٹو، گورنر سندھ بیگم رعنا لیاقت علی خان اور دیگر قومی و مذہبی رہنماؤں نے بھی علامہ رشید ترابی کی موت پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے اسے ملک وقوم کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا۔

کارواں جاتا ہے نئی صبح ہوئی چونک رشیدؔ
اب کہیں اور جلا جا کے سرِ شام چراغ

بہت روئے گے مجھ کو یاد کر کے

قومی اخبارات کا اظہار تعزیت



علامہ رشید ترابی کی وفات ملت اسلامیہ کے لیے عظیم سانحہ ہے

علامہ رشید ترابی کو مختلف تنظیموں کے رہنماؤں کا خراج عقیدت

علامہ رشید ترابی انتقال فرما گئے

علامہ رشید ترابی کی شایان شان یادگار قائم کی جائے

سپرد خاک کیا جائے گا

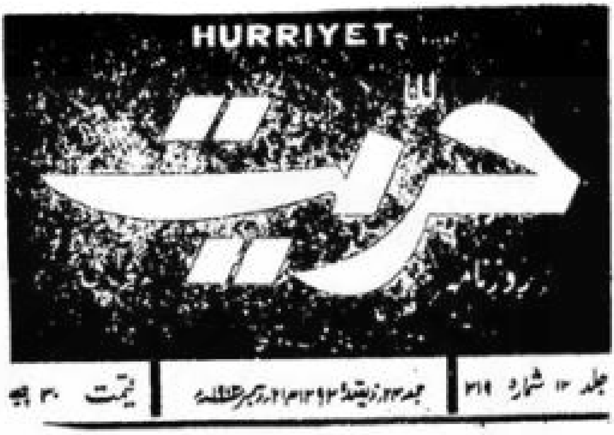
علامہ رشید ترابی مرحوم کو گلستان سجاد میں سپرد خاک

علامہ رشید ترابی کے جنازے میں ہزاروں افراد کی شرکت

مرحوم کو سپرد خاک کر دیا گیا

ترابی کی وفات پر مختلف تنظیموں کی جانب سے تعزیت

علامہ رشید ترابی کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا



آہ علامہ رشید ترابی

ایک جید عالم، ایک معجز بیان واعظ، ایک سحر طراز خطیب اور ایک مستند مُبلّغ ـــــ علامہ رشید ترابی اپنی ذات میں انجمن تھے۔ ان کی موت نے پاکستان کو ایک ہمہ صفت موصوف شخصیت سے محروم کر دیا۔ ان کی رحلت سے جو مقام خالی ہوا، شاید کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔ اور برسوں مرحوم کی یاد دلاتے گا۔

علامہ رشید ترابی کی عمر ایسی زیادہ نہ تھی کہ انھیں ضعیف کہا جا سکتا۔ لیکن علمی اور دینی مشاغل میں انہماک نے بالآخر ان کے جسدِ ناتواں سے خراج وصول کیا اور اللہ کو منظور نہ تھا کہ وہ زیادہ عرصہ اس عالم ناپائیدار میں رہیں۔

علامہ رشید ترابی خوش قسمت تھے کہ اپنے رب کی طرف لوٹے ہیں تو خدمتِ اسلام کے طویل برسوں کا توشہ ساتھ لے کر گئے ہیں۔ پاکستان میں اگرچہ وہ ایک خطیب بے بدل اور ذاکرِ اہلِ بیت کی حیثیت سے مشہور رہے۔ لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مرحوم کو اس سرزمین پاک کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنیوالوں کی صفِ اوّل میں رہنے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ حیدرآباد دکن میں جب نواب بہادر یار جنگ نے مجلس اتحاد المسلمین کے پلیٹ فارم سے اُمّتِ مُسلمہ کے اتحاد اور آزادی کا نعرہ بلند کیا تو علامہ رشید ترابی اس جدوجہد میں

ان کے دستِ راست تھے۔

آج پورا پاکستان علامہ رشید ترابی کی موت پر سوگوار ہے۔ یہ حقیقت میں ایک قومی صدمہ ہے۔ ہم مرحوم کے سوگ میں ان کے عقیدت مندوں کے شریک ہیں۔ ان کے اعزہ اور پسماندگان کے غم میں شریک ہیں۔ اور اللہ تعالےٰ سے دعا کرتے ہیں کہ علامہ مرحوم کو بلند درجات سے سرفراز



عوامی عدالت ملک کا وہ واحد جریدہ ہے جس نے حضرت علامہ رشید ترابیؒ کی رحلت کے فوراً بعد اور پھر مرحوم کی برسی پر یکے بعد دیگرے دو شاندار ترابی نمبر نکالے۔ مذکورہ نمبروں کے منتخب مضامین آپ زیرِ نظر کتاب میں بھی مطالعہ فرما سکیں گے۔ یہ ایڈیٹر پبلشر عوامی عدالت جناب ابراہیم جلیس کی خصوصی اجازت سے "منبر کا دوسرا نام" میں شامل کئے گئے ہیں۔

THE DAILY JANG KARACHI

جنگ

جلد ۳۷ | ہفتہ ۲۶ ذیقعدہ ۱۳۹۳ھ ۲۲ دسمبر ۱۹۷۳ء | نمبر ۳۲۳

عظیم سانحہ

علامہ رشید ترابی کی رحلت ایک عظیم سانحہ ہے اس سانحہ نے ملک کے اندر اور باہر بے شمار دلوں کو سوگوار اور ان گنت آنکھوں کو اشکبار کردیا ہے۔ ان کی جدائی کو نہ صرف اس برِ صغیر میں محسوس کیا جائے گا بلکہ دنیا میں جہاں بھی مرحوم کے عقیدت مند موجود ہیں وہاں صفِ ماتم بچھ جائے گی علامہ رشید ترابی ایک ممتاز عالمِ دین ہونے کے ساتھ خطابت کے میدان میں منفرد مقام رکھتے تھے، ان کی شہرت اور ہر دلعزیزی کا بڑا سبب یہی تھا۔ ان کی خطابت کے جوہر اس وقت خوب کھل کر سامنے آئے جب مرحوم نے حیدرآباد دکن میں اتحاد المسلمین کے پلیٹ فارم سے نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ تقریروں میں حصہ لیا۔ بعد میں علامہ نے اپنی اس فطری صلاحیت کو ایک ذاکر کی حیثیت سے کمال تک پہنچا دیا، ہر سال محرم کے مقدس مہینے میں جب وہ شہادتِ حسینؑ کا ذکر کرتے تو پورے پاکستان میں لاکھوں افراد ہمہ تن گوش بن جاتے ان کی مجلس اور ان کے ذکر میں علم و حکمت کی گہرائی کے ساتھ بلا کا سوز و گداز ہوتا جو سننے والوں کے قلب و روح میں اتر جاتا۔ علامہ نے اپنی اس صلاحیت سے کام لیکر وقتی طور پر صرف دلوں کو گداز ہی نہیں کیا بلکہ انھوں نے لاکھوں افراد کے ذہن و دل کو تبدیل کیا ہے اور مرحوم کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے اپنی خطابت کے ذریعے ملتِ اسلامیہ میں اتحاد و ہم آہنگی پیدا کی وہ شروع ہی سے اسلامی اتحاد کے پرجوش حامی تھے اسی مقصد کے تحت مرحوم نے بہادر یار جنگ مرحوم کے شانہ بشانہ کام کیا اور قیامِ پاکستان کی جد و جہد میں حصہ لیا، پاکستان آنے کے بعد وہ مسلسل ملتِ پاکستان کو متحد رکھنے کے لئے اپنی بہترین صلاحیتوں سے کام لیتے رہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی مغفرت و رحمت کے اعلیٰ ترین درجات عطا فرمائے اور ان کے تمام عقیدت مندوں کو صبرِ جمیل سے نوازے۔

روزنامہ
مشرق
کراچی

[illegible]

علامہ رشید ترابی کی رحلت

برصغیر کے ممتاز شیعہ عالم، مبلغ اور خطیب علامہ رشید ترابی گذشتہ روز حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے رحلت فرماگئے انا للہ و انا الیہ راجعون۔ علامہ رشید ترابی مرحوم کافی عرصہ سے عارضہ قلب میں مبتلا تھے۔ گذشتہ ستمبر میں ان کا علاج جناح ہسپتال کے شعبہ امراض قلب میں ہوا تھا۔ جس کے بعد سے ان کی طبیعت سنبھل گئی تھی لیکن کل رات ان پر دل کا شدید دورہ پڑا۔ جس کے بعد ان کے معالجین کو بلوایا گیا۔ جنہوں نے ان کے دل کی حرکت بحال کرنے کے لئے ڈیڑھ گھنٹہ تک جدوجہد کی اور اس میں کامیاب نہ ہوسکے

علامہ رشید ترابی مرحوم عالم دین، مبلغ، خطیب، شاعر، کئی کتابوں کے مصنف ہونے کے ساتھ آزادی وطن کے ایک پرجوش کارکن بھی تھے اور ریاست حیدرآباد دکن میں نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی رہنمائی میں انہوں نے آزادی وطن کی جدوجہد میں بھرپور حصہ بھی لیا تھا۔ ان کی رحلت سے جہاں پاکستان ایک ممتاز عالم دین، خطیب اور مبلغ کے ساتھ ساتھ آزادی وطن کی جدوجہد کے ایک مایۂ ناز کارکن سے محروم ہوگیا ہے وہیں عالم اسلام میں بھی ایک ایسا خلاء پیدا ہوا ہے۔ جسے عرصہ تک پر نہ کیا جاسکے گا۔ ان کی رحلت ایک قومی نقصان ہے جسے بڑی شدت کے ساتھ اور عرصہ تک محسوس کیا جائے گا۔

روزنامہ مساوات کراچی

جمعرات ۲۰ دسمبر ۱۹۷۳ء مطابق ۲۴ ذوالقعدہ ۱۳۹۳ھ

قیمت ۳۰ پیسے

ایک شمعِ خطابت اور گل ہوئی

علامہ رشید ترابی کی رحلت برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک سانحہ عظیم ہے تقسیم ہند سے پہلے ہی انہوں نے فن خطابت میں ایک بلند مقام حاصل کر لیا تھا انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد لکھنؤ میں باقاعدہ دینی تعلیم حاصل کی اس وقت کے جید عالم حضرت ناصر الملت قبلہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور نواب بہادر یار جنگ سے خطابت کی تربیت حاصل کی۔ ان کا انداز خطابت چونکہ انفرادیت اور جاذبیت کا حامل تھا اس لئے انہوں نے بہت جلد لکھنؤ میں اپنی مقبولیت کے جھنڈے گاڑ دیئے اور اپنے معاصرین سے اپنی خداداد صلاحیت کا لوہا منوا لیا وہ اگرچہ عملی سیاست سے ہمیشہ دور رہے اس کے باوجود قومی امور میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے اور جدوجہد آزادی میں اپنی شعلہ بیانی سے ایک نئی روح دوڑا دی۔

وہ برصغیر کے بلند پایہ شیعہ عالم اور ایک ممتاز مبلغ و خطیب ہونے کے علاوہ شاعر و مصنف بھی تھے انہوں نے متعدد تصانیف کے علاوہ ایک بڑی لائبریری بھی بطور یادگار چھوڑی ہے جو نادر قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے مالا مال ہے ان کی کئی ہزار تقریریں ٹیپ کی صورت میں محفوظ ہیں جو مذہبی موضوعات پر مشتمل ہونے کے باوجود عالمی مسائل کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ ایام عزا میں ایمان و یقین کی روشنی پھیلانے والی شمع اگرچہ گل ہو گئی لیکن رشد و ہدایت کی پھیلی ہوئی تابانی ہمیشہ ان کی یاد دلاتی رہے گی اور عقیدت مندوں کو سوگوار کرتی رہے گی۔ ادارہ بھی ان کے سوگواروں کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ اور مرحوم کے لئے دست بدعا ہے کہ پروردگار عالم انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے (آمین)

روزنامہ امروز لاہور

اداریہ امروز ۲۱ر دسمبر ۱۹۷۳ء

علامہ رشید ترابی

علامہ رشید ترابی کی رحلت وزیر اعظم بھٹو، دوسرے قائدین علماء و فضلاء اور دینی و عوامی حلقوں نے گہرے رنج و الم کا اظہار کیا ہے، موت العالِم موت العالَم کا مقولہ، ایسے ہی بزرگوں کی وفات پر صادق آتا ہے۔ مرحوم دینی و تعلیمات اور علوم جدیدہ پر یکساں گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کا شمار اتحاد بین المسلمین کے داعیوں میں ہوتا تھا۔ بڑے بلند پایہ خطیب اور ذاکر تھے۔ ان کو سننے کا لاکھوں کو اشتیاق رہتا تھا۔ منطق اور فلسفہ میں فرد تھے، تاریخ کے مطالعے میں بھی منطق، فلسفے کو رہنما رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خطبات، ندرت کے حامل ہوتے تھے،

انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد دکن) میں تعلیم پائی۔ فارغ التحصیل ہوئے تو دینی علوم کی طرف راغب ہوئے اور مختصر سے عرصے میں ایک منجھے ہوئے خطیب کی حیثیت میں معروف ہو گئے نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ کچھ عرصہ خارزار سیاست میں بھی گزارا، ۵۰ء کے بعد پاکستان آئے تو اپنی تمام تر توجہ دینی تبلیغ اور درس و واعظ پر مرکوز کر دی، ان کی مجالس میں تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی تھی۔ ان کے مداحوں کا حلقہ لاکھوں پر محیط ہے۔ علامہ مرحوم کی رحلت سے اہل پاکستان ایک صاحب الرائے علمی شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں۔

DAWN

Allama Turabi

THE death of Allama Rashid Turabi, an eminent scholar and matchless orator in his own field, has removed from the ecclesiastical scene a personality of outstanding merit. His fame in that capacity travelled beyond the frontiers of Pakistan and even the sub-continent. During Muharram Majalis in particular he drew large concourses of devotees who will miss the magic and magnetic touch that was his forte. Before specialising as a 'Zakir' he had made a reputation as a promising speaker from the platform of Ittehad-ul-Muslimeen, the representative forum of the Muslims in Hyderabad (Deccan). For the last few years, he had been seriously ailing but did not spare himself and continued to exert relentlessly in the chosen pursuit, which was all absorbing for himself. Lately, a series of heart-attacks left him very weak and vulnerable. He who mourned ceaselessly for the Martyrs of Karbala will surely be mourned by many and long remembered by those who heard him. May God bless his soul. Ameen.

MORNING NEWS

EDITOR: SULTAN AHMED

[illegible] KARACHI, FRIDAY, DECEMBER [illegible]

The death of a great orator

THE DEATH of Allama Rashid Turabi, scholar, poet, writer and, above all, a great orator, will be deeply mourned, not only in the country but also outside. Suffering long from a heart ailment, the 65-year-old Allama passed away on Tuesday night. And thus ended the life of a man who had, for over two decades, inspired people with his moving oratory which had an added lustre of being full of substance. The reason why the Allama always got an appreciative and full audience whenever he spoke on the tragedy of Karbala and the martyrdom of Hazrat Imam Hussain was his thorough command over Muslim history and theology which characterised his orations.

A Master of Arts in Philosophy from Allahabad University, he obtained religious training in Lucknow. Joining the Ittehadul Muslimeen in Hyderabad State, he learnt his greatest forte, oratory, from that master of the art, Bahadur Yar Jung, who was the founder of the Ittehadul Muslimeen. An avid traveller of Muslim lands, Allama Turabi always kept himself uptodate with the happenings in the outside world. For this reason he was able to present the teachings of Islam in the light of current political, economic and intellectual thought and make Islam's message come out in bold relief. Allama Turabi's Moharram orations in Pakistan have been mostly tape-recorded. It would be a fitting tribute to the genius of the Allama if these and his other works are preserved for the future.

روشنی زاویے بدلتی ہے

علامہ رشید ترابی مہد سے لحد تک

علامہ رشید ترابیؒ مہد سے لحد تک

اسمِ گرامی : رضا حسین۔

تخلص اور معروف نام :
علامہ رشید ترابی۔

پیدائش : ۱۹۰۸ء حیدرآباد دکن۔

والد ماجد : مولوی شرف الدین (تحصیلدار)

بھائی : ڈاکٹر مظہر علی خان مرحوم
(سابق وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی
اور صدر شعبہ انگریزی) ڈاکٹر زاہد حیدر (ڈاکٹر آف میڈیسن ایران) جناب تقی
سعید (لندن) جناب مصطفٰے خلیل مرحوم۔

ابتدائی تعلیم : علامہ سید علی
شوستری، آغا محمد محسن شیرازی، سید حسن اصفہانی
عربی کی تعلیم علامہ ابوبکر شہاب۔

شاعری میں شاگردی : حضرت
نظم طباطبائی، علامہ ضامن کنتوری۔

ذاکری کی تعلیم : علامہ سید
سبطِ حسن قبلہ مجتہد۔

فلسفے کی تعلیم : خلیفہ عبدالحکیم۔

خطابت کی ابتدائی تربیت : نواب
بہادر یار جنگ۔

ڈگریاں : عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے
اور الہ آباد یونیورسٹی سے فلسفے میں
ایم اے کیا۔

دینی تعلیم کی سندیں : علامہ نائینی
علامہ ہبت الدین شہرستانی۔ علامہ
آیت اللہ بروجردی مجتہد اعظم، آقائے
محسن الحکیم طباطبائی مجتہد اعظم صدر حوزہ
علمیہ نجف اشرف، علامہ شیخ بزرگ
تہرانی اور آیت اللہ العظمی آقائے
الخوئی سے دینی اسناد حاصل کیں۔

ذاکری : ۸ سال کی عمر میں منبر پر
بیٹھنا شروع کیا۔ دس برس کی عمر میں اپنے

بزمانے کے مشہور ذاکر مولوی سید غلام حسین
صدر العلماء کی مجالس کی پیش خوانی کرتے
تھے۔ ۱۶ برس کی عمر میں موضوع مقرر کرکے
تقاریر کرنی شروع کر دیں اور یہ سلسلہ
آخر عمر تک جاری رہا۔ ۱۹۴۲ء میں گئے
میں حضرت شہید ثالث کے مزار پر وہ
معرکۃ الآرا مجالس پڑھیں اور ہندوستان
گیر شہرت پائی۔

۱۳۶۱ء ہجری میں تیرہ سو سالہ یادگار
حسینی کے اجلاس کی بنیاد رکھی۔

سیاسی کیریئر: نواب
بہادر یار جنگ کے ساتھ اتحاد المسلمین
کی بنا ڈالی۔ خواجہ حسن نظامی، مولانا
ابوالکلام آزاد کے ساتھ مسلمانوں کو
بیدار کرنے کے لئے تقاریر کیں۔

آل انڈیا اسٹیٹ مسلم لیگ کے پریس
ریلیشنز آفیسر رہے۔ قائد اعظم کی ہدایت
پر نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ برصغیر
کا دورہ کیا، سابق ریاست حیدرآباد
کی مجلس قانون ساز کے ۱۹۴۰ء میں
رکن منتخب ہوئے۔ کچھ عرصہ سرکاری
ملازمت کی لیکن ۱۹۴۲ء میں نظام
حیدرآباد کی جانب سے زباں بندی
کے حکم پر ملازمت ترک کی اور قبلہ
ناصر الملت کے حکم پر لکھنؤ آگئے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں قانون کے
پہلے سال میں زیر تعلیم تھے کہ سیرت
کانفرنس میں تقریر سے متاثر ہو کر علامہ
سید حسن قبلہ مجتہد اپنے ساتھ لکھنؤ
لے گئے جہاں شیعہ کالج میں دینی علم
حاصل کیا۔

ہجرت: ۱۹۴۹ء میں
پاکستان آگئے، کراچی کو جائے سکونت
بنایا اور عملی سیاست سے کنارہ کش ہو
گئے اور خود کو ذکر حسینؑ کیلئے وقف کردیا۔

۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک "المنتظر"
کا اجرا کیا۔ اس سے قبل حیدرآباد سے
ہفت روزہ "انیس" کا اجرا کیا تھا
۱۹۵۶ء میں اسلامی ملکوں کی فلاسفیکل
کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کی۔
۱۹۵۷ء میں ۱۴ سو سالہ یادگار جشن
مرتضوی منانے کی اپیل کی اور کراچی میں

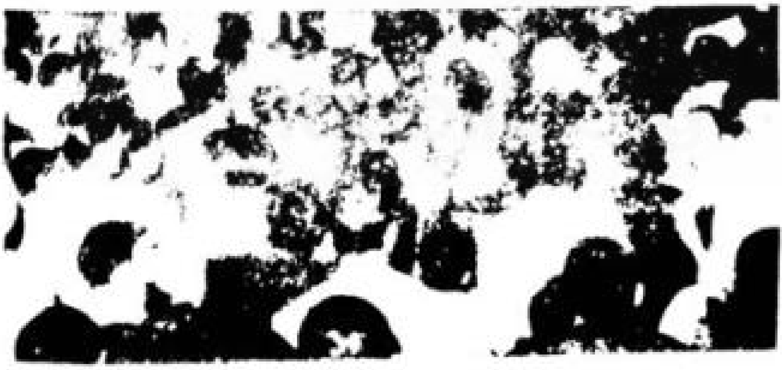
اور کراچی میں ہفتہ بھر تک بین الاسلامی کانفرنس جاری رہی۔ اجلاسوں کی صدارت اسکندر مرزا، حسین شہید سہروردی نے کی۔ راجہ صاحب محمود آباد صدر مجلس استقبالیہ تھے۔

سفر: ایران، عراق، برما، افریقہ اور یورپ کے سفر کیے اور مجالس پڑھیں۔

تصانیف: طیب معصومین، علم الرجال پر "وصل قول" مضامین محاضرات اور قصائد اور غزلوں کے مجموعے زیر طبع ہیں، کئی ہزار کتابوں اور تقاریر کے ٹیپوں کی لائبریری۔

اولادیں: علامہ کی ۱۳ اولادیں ہیں جن میں مولانا عقیل ترابی، نصیر ترابی ہادی ترابی، بتول ترابی، طہٰ ترابی اور ان کی صاحبزادی بیگم میر آف خیرپور زیا مشہور ہیں۔

لب و لہجے کا ورثہ: علامہ رشید ترابی نے مولانا عقیل ترابی کو اپنا لہجہ اور انداز خطابت منتقل کیا ہے انہوں نے اپنے صاحبزادے کی تربیت اپنے انداز خطابت کو جاری رکھنے کی غرض سے کی تھی۔ مولانا عقیل ترابی نے ۱۹۵۰ء میں میٹرک کیا۔ ۱۰ سال حوزہ علمیہ قم میں آیت اللہ العظمیٰ آقائے بروجردی اور حوزہ علمیہ نجف اشرف میں آیت اللہ العظمیٰ آقائے محسن الحکیم قبلہ سے علم حاصل کیا ہے اس کے بعد وہ اسکول آف اورنٹیل لنگویجز کیمبرج میں دو سال زیر تعلیم رہے۔





شرف حسین خاں علامہ مرحوم کے والد ماجد۔



علامہ رشید ترابی اوائل عہد شباب



ریاست حیدرآباد کی قانون ساز اسمبلی کے اراکین کا گروپ فوٹو ۔ دائیں سے چوتھے علامہ ترابی اور درمیان میں پاکستان کے موجودہ وزیر داخلہ خان عبدالقیوم خان بیٹھے ہوئے ہیں



سابق وزیر اعظم پاکستان حسین شہید سہروردی، مولانا سید محمد دہلوی، سرکار سعید ملت (لکھنؤ) ترابی صاحب
کی پشت سے (تصویر ۱۹۵۶ء)



دو عظیم شخصیتیں ——— جناب شہید سہروردی اور علامہ ترابی



علامہ رشید ترابی اور اسکندر مرزا



ہونے کے موقع پر حسین شہید سہروردی، آغا مرزا مہدی پویا اور علامہ ترابی
تابوت کو ملاحظہ کر رہے ہیں۔



تحریک پاکستان کے تین مجاہد — بانی پاکستان محمد علی جناح، نواب بہادر یار جنگ اور علامہ رشید ترابی



محوِ ماتم ہے منبر خاموش
کون مجلس سے ہو گیا روپوش

محفلیں ختم ہو رہی ہیں آج
مجلسیں اس کو رو رہی ہیں آج



بمبئی ریلوے اسٹیشن پر علامہ ترابی کا استقبال (تصویر ۱۹۳۹ء)



مشرقی افریقہ میں پاکستان کے سفیر نواب صدیق علیخاں کے ساتھ علامہ کا ایک گروپ فوٹو



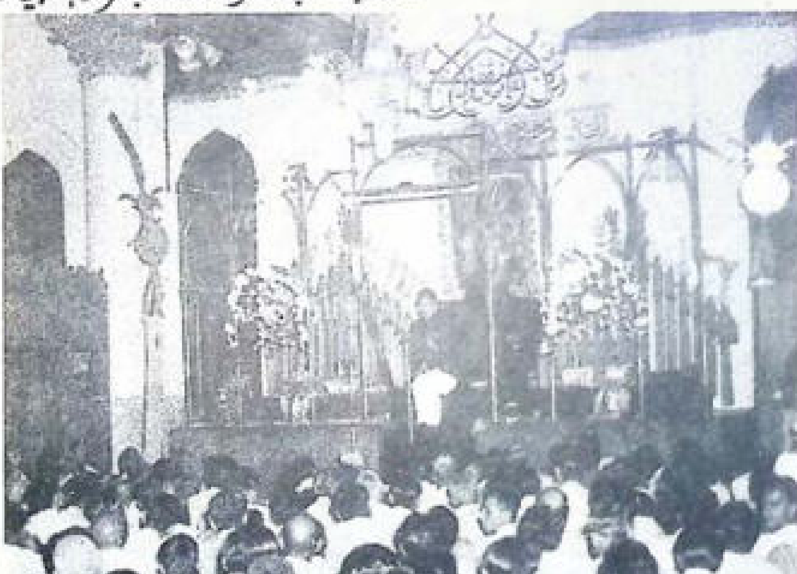
مسلم لیگ کے رہنما کی حیثیت سے جب علامہ مرحوم مدراس پہنچے تو ان کا شاندار استقبال ہوا (تصویر ۱۹۴۲ء)



مشرق وسطیٰ میں ایک مجلس سے خطاب



یادگار مرتضوی کے اجلاس میں اسکندر مرزا، آغا پرویز و آغا محمود عباس کرسیوں پر بیٹھے ہیں
اور ترابی صاحب حاضرین سے خطاب فرما رہے ہیں۔



علامہ ترابی ایران کی ایک اہم بارگاہ میں مجلس سے خطاب فرما رہے ہیں۔



علامہ ترابی اپنے فرزندوں عقیل ترابی اور ہادی ترابی کے ساتھ



علامہ ترابی کیپلا کے ایک مشاعرہ میں (تصویر ۱۹۵۳ء)



علامہ رشید ترابی علمار ایران کے ساتھ



حضرت علامہ
رشید ترابی کی
ایک یادگار
تصویر



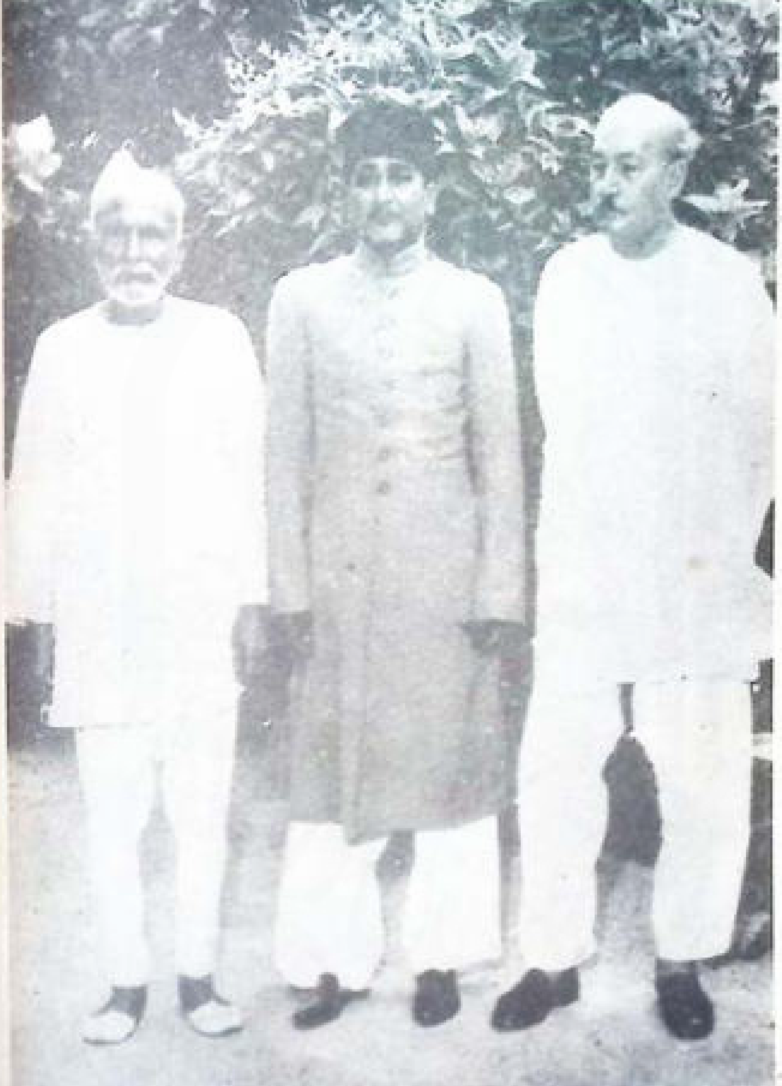
۵ ستمبر ۱۹۷۳ء بروز اتوار جشن ولادت کے موقع پر آخری مرتبہ امام بارگاہ میں تشریف لائے۔



علامہ ترابی کی مجالس کے لئے ان گنت لوگ ان کی تقریر ٹیپ کرنے کے لئے جمع ہیں۔



حضرت یگانہ چنگیزی اور علامہ رشید ترابی



جوش ملیح آبادی ، رشید ترابی ، استاد قمر جلالوی



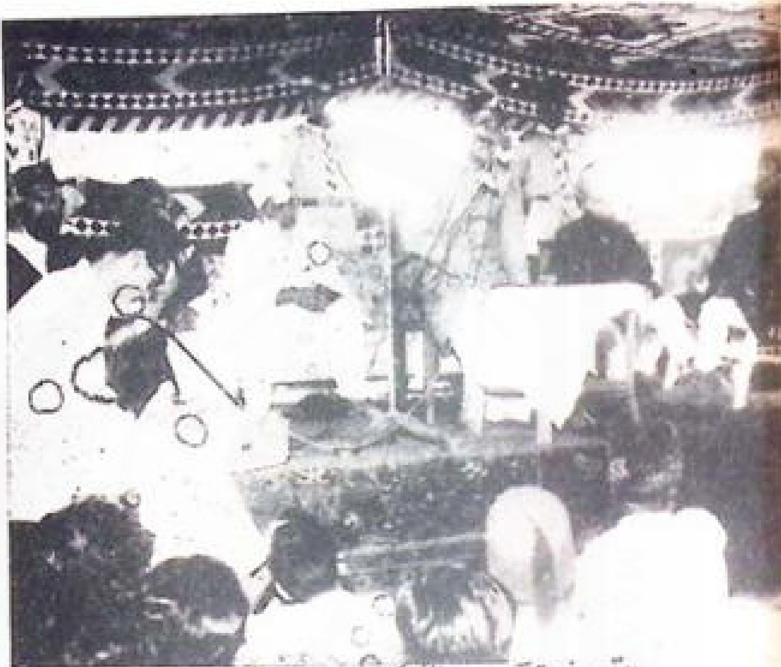
فیض احمد فیض، علامہ رشید ترابی، مجنوں گورکھپوری اور زیڈ اے بخاری



علامہ رشید ترابی کا نشتر پارک کی ایک مجلس سے خطاب



علامہ رشید ترابی نشتر پارک کراچی کی ایک مجلس سے خطاب کر رہے ہیں۔



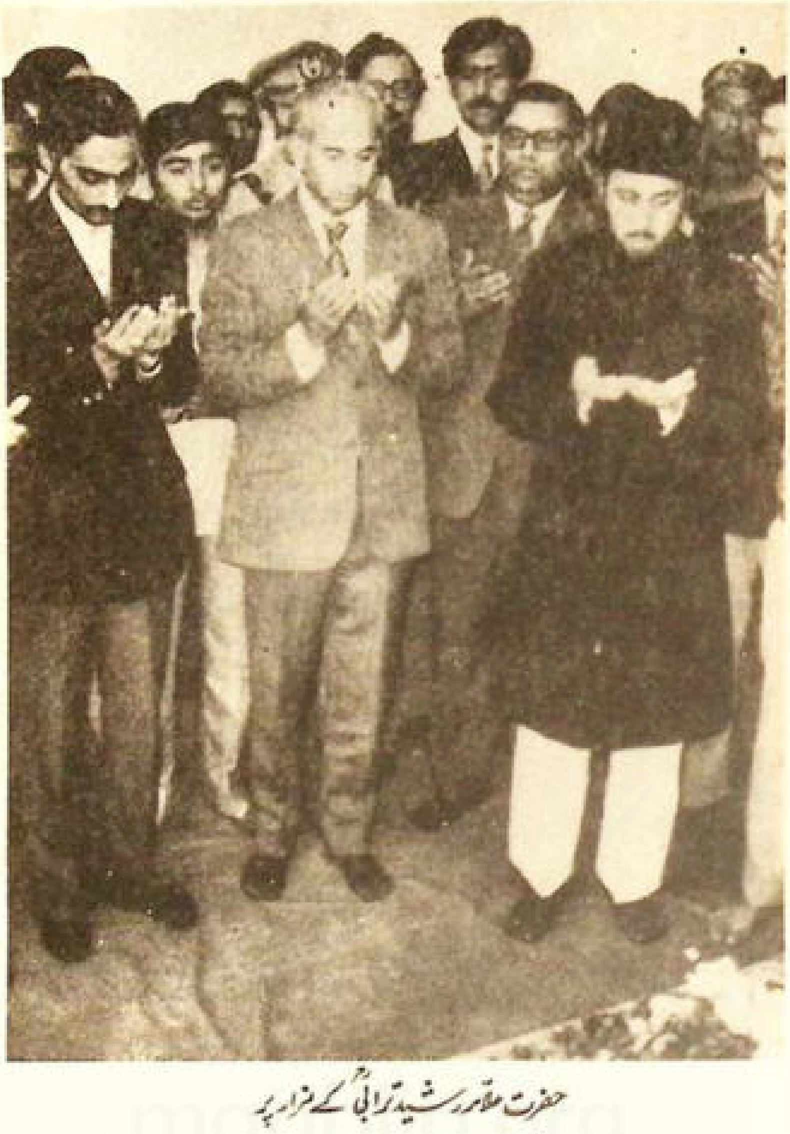
علامہ رشید ترابی سیرت النبی کے جلسے سے خطاب کر رہے ہیں۔



ٹیپ ریکارڈوں کا ہجوم اور علامہ رشید ترابی کی تقریر



کس کس سے رہیں دُور تو کس قرب کو ڈھونڈیں
دیتے ہیں محبت میں یہاں زہر بدل کر



حضرت علامہ رشید ترابیؒ کے مزار پر

وزیر اعظم بھٹوؒ عقیل ترابی اور نصیر ترابی کے ساتھ فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔



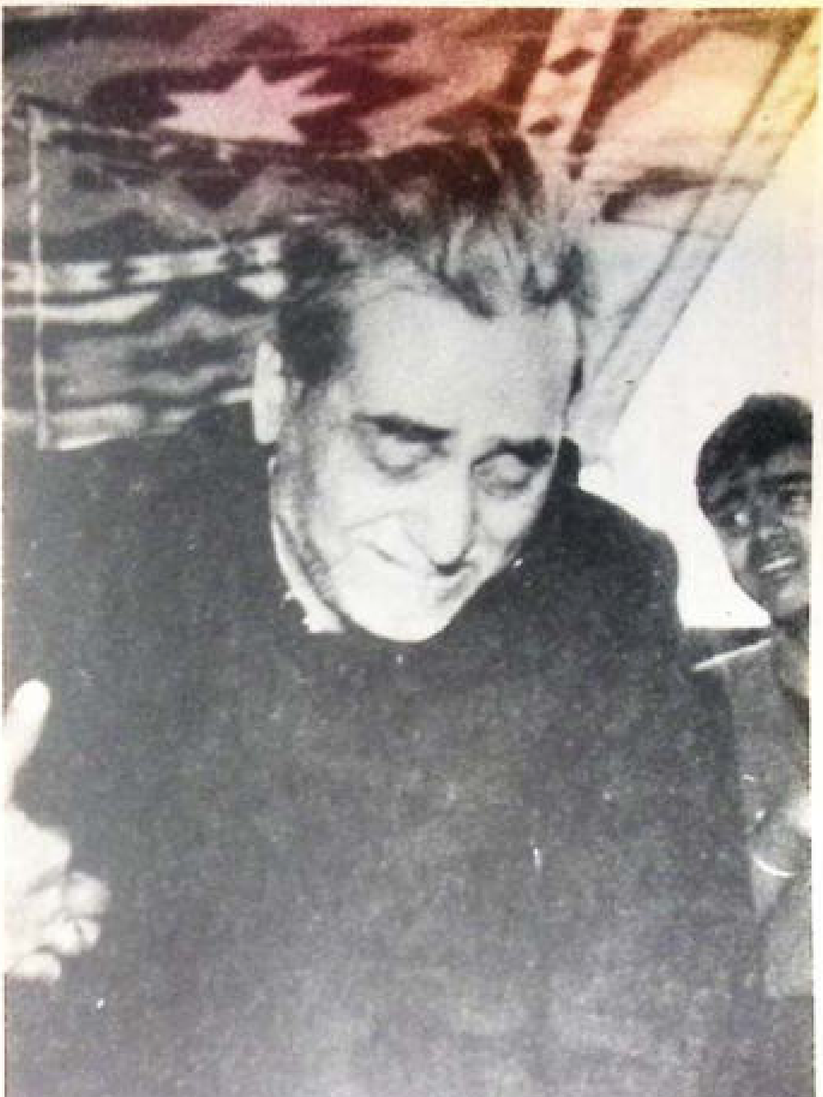
وزیراعظم بھٹو علامہ رشید ترابی کے مزار پر



مولانا احتشام الحق تھانوی علامہ رشید ترابی کی رحلت پر علامہ عقیل ترابی سے تعزیت کر رہے ہیں



جن کو خزاں میں صبر و سکوں سے ملا قرار
آئی بہار ان کا پتہ پوچھتی ہوئی



میں آپ کو ڈھونڈ آیا ہوں امکاں کی حدوں تک
اب آپ مجھے ڈھونڈنے جائیں کہیں اور

اب اسے ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لیکر

تاثرات و احساسات

کیا جانیے کیا حشر ہو گلشن کا سحر تک
اچھا ہے سرِ شام نکل جاؤں یہاں سے

مرتب کے نام

نصیر ترابی کا پیغام

امیر محترم۔

آشیرباد۔

اس آپا دھاپی اور قحط الرجالی کے موسم میں آپ یہ تحفہ سپاس لے کر کہاں نکل آئے۔ یہ تو گرچہ کم نظراں ہے یہاں اشارۂ مژگاں سمجھنے والے بہت کم رہ گئے ہیں۔

روحِ صد جاں دادگانِ ابر و باد آوارہ ہے
اس فضا میں شام سے پہلے ہی گھر آیا کرو

دیکھئے کیا زمانہ آگیا کہ زندگی کے ترازو میں اخلاقی ذمہ داریوں کا پلڑا احتیاج کے مقابل کمزور پڑگیا۔ اور میں اپنے بابا پر کچھ لکھنے کی بجائے آدھ سیر آٹے کی کاروباری مصروفیت کے باعث آپ سے شرمندگی اٹھا رہا ہوں۔ خیر میری اس شرمندگی میں منافقت کی چابکدستی بھی شامل ہے۔ لیکن اب چونکہ آپ کی کوئی نے مجھے مول لے کر چھوڑ دیا ہے لہٰذا اس منافقت کو قرض کے خانے میں درج فرمائیے میں آپ کا یہ قرض "منبر کا دوسرا نام" کی دوسری جلد میں چکا دوں گا۔

سردست ہمیں درگذر کیجئے۔ اے امیر یہ تو رہا میرا احساب لیکن میرے برادر مکرم علامہ عقیل ترابی مدظلہ ناسازئ طبیعت اور محرم کی مشغولیت کے سبب میری طرح اس بار آپ کی بزم سے غیر حاضر رہیں گے۔ ویسے مجھے امید ہے کہ میری توقعات کا لبادہ آپ کی قامت پر تنگ ہو گا۔

آفریں باد بریں ہمتِ مردانۂ تو

آپ کا مخلص

[illegible]

۵۹۲، مر کا پانچواں دن

فیضؔ کا پیغامِ تعزیت

نصیر ترابی کے نام

عزیزی۔ تسلیم اور دعا

علامہ صاحب مرحوم و مغفور کی علالت کی اطلاع مجھے انڈونیشیا میں ملی تھی۔ جہاں سے گزشتہ ہفتہ لوٹا ہوں، کراچی میں رکنا نہ ہو سکا۔ زیرِ وقت ان کی وفات حسرت آیات کی اطلاع پائی۔ ورنہ تعزیت کے لئے خود حاضر ہوتا۔ مرحوم کے حلقۂ عقیدت میں شرکت کا افتخار مجھے بھی حاصل تھا اور ان کے جملہ عقیدت مندوں کی طرح مجھے بھی احساس ہے کہ اہلِ دل کی محفل میں اب شاید ہی ان ایسا باکمال مسند آرا ہو سکے، رنجِ مفارقت کا تو مداوا نہیں۔ لیکن آپ کے لئے اس سے زیادہ وجہ تشفی کیا ہوگی کہ مرحوم کے سوگ میں ایک پورا عالم آپ کے ساتھ شریکِ غم ہے۔ میری جانب سے سب اعزاء کو بھی تعزیت پہنچا دیجیے۔ فقط

مخلص

فیض احمد فیضؔ

شہرِ ابلاغ

جوش ملیح آبادی کا پیغام۔ نصیر ترابی کے نام

میاں نصیر ترابی، سلامت رہو، ہر چند، اس کرۂ ارض پر، بلفظہٖ، ایک فرد بھی نہیں رہے گا ——————

جب کہ تمہارے نازشِ روزگار، عظیم باپ کی موت پر، خود میرا گریبان چاک، اور خود میری آنکھیں نم ناک ہیں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کریں، پھر کس منہ سے، تم کو صبر کی تلقین کروں، ——————

ایسے، قوّتِ برداشت کو سلب کرنے والے سانحے پر، جب کہ زندگی کی سانس اکھڑ کر رہ جاتی ہے، صبر کی تلقین کرنا، شقاوت نہیں تو اور ہے کیا۔؟

اور، اس بنا پر، میں یہ کہوں گا کہ رو، اے میاں نصیر، رو، جی بھر کے رو، اور روتے روتے، جل تھل بھر دو، —— اس موت پر زمین بھی رو رہی ہے، آسمان بھی رو رہا ہے، میں بھی، دل تھام کر روؤں، تم بھی سر پیٹ کر رو،

نظر اٹھا کر دیکھو کہ تمہارے باپ پر —— جو دینی خوش گفتاری کے پیغمبر

تھے۔ موت طاری کر کے، لیلائے فصاحت پر بیوگی کا عذاب نازل کر دیا گیا۔ عروسِ بلاغت کی چوڑیاں ٹھنڈی کر دی گئی ہیں۔ شہر! بلاغ کو، پامال کر ڈالا گیا ہے۔ نگارِ حرف و حکایت کی نبضیں ڈبو دی گئی ہیں۔ فضائے سوگ داری سے "واحسینا" کی صدا چھین لی گئی ہے۔ طلاقت کا جنازہ نکال دیا گیا ہے۔ معانی کی چاندنی، گہنا دی گئی ہے۔ الفاظ کی پنکھڑیاں توڑ دی گئی ہیں۔ خطابت کی رگوں کا خون جما دیا گیا ہے۔ جادو بیانی کی رگِ جاں تراش دی گئی ہے۔ محراب کی زبان کو کاٹ ڈالا گیا ہے۔ منبر کو گونگا بنا دیا گیا ہے اور لہکتے لہجے کی دھنک کو، توڑ کر رکھ دیا گیا ہے

جو ئے خون۔ آنکھوں سے بہنے دو، کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں

سوگوار جوش

اسلام آباد۔ ۱/۱/۱۹۷۴۔ قبلِ طلوع۔

بے مثال خطیبؒ

احمد ندیم قاسمی

لاہور

۴ار دسمبر ۱۹۸۷ء

عزیز مکرم امیر حسین

سلام مسنون

علامہ رشید ترابی مرحوم کے بارے میں ضرور کچھ لکھتا' مگر میں ان سے کبھی نہیں مل سکا حالانکہ ان کے صاحبزادے نصیر صاحب مجھے بہت عزیز ہیں علامہ مرحوم کو میں نے دو بار ٹیلی ویژن پر دیکھا اور ایک دو بار شام غریباں کے سلسلے میں ریڈیو پر سنا۔ اس سے زیادہ کیا عرض کروں کہ مرحوم بڑے عالم دین اور بے مثال مقرر تھے۔ سنا ہے وہ خود بھی شاعر تھے اور بلا کے شعر شناس بھی تھے؛ مگر میری بدقسمتی کہ میں ان سے نہ تو مل سکا اور نہ ان کی کسی تحریر کے مطالعہ کا موقع ملا۔ چنانچہ مجھے ایسے بے خبر آدمی کا ان کے بارے میں مزید کچھ عرض کرنا غلط ہوگا۔

میری دعا ہے کہ آپ سکون اور آسودگی کی زندگی گزاریں۔ آپ محنتی، فرض شناس اور نیک نیت نوجوان ہیں، اس لئے انشاءاللہ ہمیشہ کامیاب رہیں گے۔

دعا کے ساتھ اجازت

مخلص

احمد ندیم قاسمی

با اخلاق عالم

احسان دانش

علامہ رشید ترابی فاضل قسم کے انسان تھے، میں جب دکن گیا تو پہلی بار ان کا نام وہیں سُنا تھا، میں نے وہاں اس سے ملنے کی کوشش کی لیکن عجلتِ سفر کے باعث کامیاب نہ ہو سکا، پھر ایک بار مجھے ان کی ایک کتاب کی ضرورت پڑی تو میں نے انہیں خط لکھا اور انہوں نے کتاب بھجوا دی، میں مرحوم کے اخلاق سے بہت متاثر تھا۔ عموماً علماء میں یہ اخلاق کم پایا جاتا ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ پُر تکلف اور احترام کی زندگی اور رکھ رکھاؤ کے عادی ہو جاتے ہیں۔ علامہ ترابی ہر چند کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں فلسفہ و منطق کے طالب علم رہے تھے لیکن ان میں منطقیوں کی خشکی نہیں تھی، وہ نہایت خلیق اور ذہین قسم کے انسان تھے۔ وہ یوں تو علم دین میں اپنا پایہ بلند رکھتے تھے لیکن جب وہ عوامی زندگی میں آتے تھے تو معمولی سے معمولی انسان کا بھی احترام کرتے اور محبت سے پیش آتے، علامہ ترابی کی موت سے ایسا محسوس ہوا جیسا اچھے آدمی رفتہ رفتہ دنیا سے اٹھ رہے ہیں اور اب اس زمین پر امن و سکون ذرا مشکل سے ہو گا، علماء کا اس رفتار سے ختم ہونا بھی قربِ قیامت کی نشانی ہے، اللہ فضل و کرم فرمائے اور علامہ مرحوم کو جوارِ رحمت عطا کرے، ہر شخص زندگی کی قطار میں لگا ہوا ہے اور قدم قدم موت کی طرف چل رہا ہے۔

میرا احساس

راوی : مجنوں گورکھپوری

تحریر : امین حسین

علامہ رشید ترابی سے ابتداء میں میری کئی ملاقاتیں ہوئیں اور مجھے ان کے فنِ تخلیق سے مستفید ہونے کا بھی اتفاق ہوا لیکن اس کے باوجود میرا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ میں ان سے زیادہ قریب نہیں رہا، ممکن ہے میں اس کا اہل نہ ہوں، بہرحال جب ان کا انتقال ہوا تو مجھے حقیقتاً ایک دکھ کا احساس ہوا ان کی موت پر مجھے جو احساس ہوا اس سلسلے میں، میں کوئی دعویٰ تو نہیں کرتا تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ وہ میری ایج گروپ (Age Group) کے آدمی تھے۔ اور ممکن ہے مجھے ان کی موت پر یہ احساس ایک ہم عمر کے بچھڑ جانے کا ہوا ہو۔!!

علامہ مرحوم سے میری جو ملاقاتیں ہوئیں یا مجھے ان کی ہم نشینی کا جو موقع ملا اس میں کچھ شعرو شاعری بھی ہوتی تھی، اور کچھ علمی گفتگو بھی، ترابی صاحب جنہوں نے دراصل اپنے علم و ہنر کی بدولت گفتگو یا تقریر کو ایک فن بنایا تھا حقیقتاً اپنے فن میں ماہر اور سامعین کے نبض شناس تھے۔ اور اس اعتبار سے وہ بہت بلند مقام پر تھے۔ چونکہ ترابی صاحب مرحوم سے میرا بہر حال ایک ایج گروپ کا رشتہ ہوتا ہے جو اپنی جگہ پر ایک نازک رشتہ ہے۔ لہٰذا اس رشتے کے ٹوٹ جانے کی بنا پر مجھے ترابی صاحب کی جدائی کا بہت بڑا صدمہ ہوا، پچھلے دنوں نصیر ترابی سے میری ملاقات ہوئی تھی وہ شاید اسی کتاب کے مضمون کے لئے کچھ کہہ رہے تھے تو میں نے ان سے کہا تھا کہ جہاں میری زبان اور قلم عاجز ہو جاتے ہیں وہ یہی مقامات ہیں کہ کسی عزیز شخصیت کے ضائع ہونے کا احساس جان لیوا ہو جاتے اور دست و پا مفلوج۔

پتہ نہیں میں ترابی صاحب کی موت پر رسمی تعزیت بھی کر سکا یا نہیں! بہر حال یہ میرا ایک دلی احساس ہے، آج مجھے ترابی صاحب مرحوم سے اپنی پہلی ملاقات رہ رہ کر یاد آ رہی ہے جو ۱۹۸۸ء میں ہوئی تھی، غالباً انہوں نے کھانے پر مدعو کیا تھا، اس محفل میں فیض بھی تھے، ڈھائی تین گھنٹے شعر و شاعری پر گفتگو ہوتی رہی۔ یہی میری ان سے یادگار ملاقات تھی جو آج رہ رہ کر یاد آ رہی ہے۔!!

زندہ جاوید خطیبؒ

شورش کاشمیری

کوئی دس سال ادھر کا ذکر ہے، علامہ رشید ترابی لاہور آ چکے تھے اور کئی ایک مجالس سے خطاب کر رہا تھا۔ سید مظفر علی شمسی ادارہ تحفظ حقوق شیعہ کی طرف سے آپ کے اعزاز میں ایک اجلاس کر رہے تھے۔ انہیں اصرار تھا کہ میں اس تقریب میں علامہ صاحب کا خیر مقدم کروں۔ نہ جانے خیال انہیں کیونکر سوجھا، میں علامہ صاحب کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ بس سن رکھا تھا کہ وہ بے مثال خطیب اور لاجواب ذاکر ہیں۔ ان کے سامنے کسی کا چراغ مشکل ہی سے جلتا ہے۔ میر انیس نظم کے شہسوار تھے اور رشید ترابی نثر کے میر انیس ہیں۔ میں نے حامی بھر لی۔ ادھر اجلاس میں ابھی ایک روز باقی تھا۔ میں تذبذب میں تھا کہوں تو کیا کہوں؟ محض تعریف کر دینا تو کوئی بات نہیں کوئی چیز رسا کبھی جائے تو حسن سے خالی اور معنی سے بیزار ہوتی ہے۔

ماسٹر تاج الدین انصاری بزرگان احرار کی آخری یادگار تھے۔ انہوں نے علامہ صاحب کی بہت سی تقریریں اور کئی ایک مجلسیں سنی تھیں۔ وہ اچانک میرے پاس آئے اور دریافت کیا۔

"کہ تم رشید ترابی کے اجلاس سے خطاب کر رہے ہو؟" میں نے عرض کیا ——— جی ہاں کہنے لگے کبھی ان سے ملے ہو۔ ؟ انہیں دیکھا یا سنا ہے؟ میں نے تینوں صورتوں سے انکار کیا، کہنے لگے ———

"میرا خیال بھی یہی تھا، میں اسی لئے آیا ہوں کہ اپنے مضمون کی تیاری کر لو۔ سوچ کر بولنا اور اپنے اسلوب کی بہتر دہج سے بولنا۔ رشید ترابی بیان کا دھنی اور زبان کا غنی ہے۔ اس کے ہاں الفاظ و مطالب سحر آگیں وحدت رکھتے ہیں۔ انسان مبہوت ہو جاتا ہے۔ آواز میں

رعد کی کڑک ہے اور لہجہ میں رنگینی بھی ہے شستگی بھی اور شیرینی بھی اس کے سامنے بڑے بڑے دل کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔"

میں نے ماسٹر جی سے کہا ـــــ سوال کسی مقابلے یا مناظرے کا نہیں شمسی کو اصرار تھا، میں نے حامی بھر لی ہے۔ تقریر تو نہیں کرنا ہے۔ مجھے نہیں۔ میں خیر مقدم میں چند جملے کہہ دوں گا۔ وہ کیا ہوں گے، اس سلسلہ میں تردد نہیں ـــــ کہ

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

ماسٹر جی چلے گئے تو میں نے ایک لحظہ کے لئے سوچا۔ قدرے غور کیا، ایک دو شگفتہ جملے ذہن میں آ گئے۔ لیکن میں سوچ کو طرح دے گیا۔ یوں کہیئے کہ اپنے طور پر مطمئن ہو گیا۔ شام پانچ بجے اجلاس تھا، علامہ کے شیدائی اور فدائی ان کے لئے آنکھیں بچھا رہے تھے۔ بعض ابتدائی چیزوں کے بعد میں تقریر کے لئے اٹھا تو علامہ صاحب پر ایک استفہامیہ نگاہ ڈالی ابھی دو جملے ہی بولے تھے کہ مجمع داد پر آ گیا۔ میں نے آدھ گھنٹہ تقریر کی، علامہ صاحب کھڑے ہوئے تو میرے متعلق نہایت خوبصورت الفاظ کہے۔ اب جو رشتۂ سخن کھلا اور فلسفۂ شہادت بیان کیا تو مجمع لوٹ پوٹ تھا۔ شیعہ بھی تھے، سنی بھی، سبھی مسحور ہو گئے۔ کوئی فرقہ دار بول نہ تھا۔ کوئی اختلافی پہلو نہ تھا۔ کوئی جلی ذخفی طنز نہ تھی۔ نہ الفاظ کا خردش نہ آواز کا جوش الفاظ انگشتری تھے، معانی نگینہ۔ چشمۂ صافی بہہ رہا تھا۔ خوبی یہ تھی کہ ایک لالہ زار تھا جس میں بہت سی روشیں، انگنت شاخیں اور ان پہ کھلے ہوئے رنگا رنگ پھول تھے۔ لطف یہ کہ ـــــ کہ

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

کمال یہ تھا کہ سامعین کا ذہن پرستش کی بجائے پرستش کی طرف جا رہا تھا۔ استدلال تھا تو بے پناہ، جذبات تھے تو بے کراں۔ انداز یہ تھا کہ وہ ایک کارواں لے کر چلے جا رہے ہیں اور ہم ان کے ساتھ رواں ہیں۔

خطابت کیا ہے؟ ایک تخلیقی جوہر جو سامعین کو اکائی میں بدل دیتا ہے۔ اس کے بعد

حسبِ موضوع دماغوں میں یکسانی، دلوں میں طغیانی، آنکھوں میں پانی اور قدموں میں روانی آجاتی ہے۔ علامہ رشید ترابی اپنے فن کی اسی معراج پر تھے ـــــ ان کی تقریر لگ بھگ دو گھنٹہ رہی لیکن وقت تھا کہ سُن سے نکل گیا۔ انہیں اسی رات ایک مجلس عزا سے خطاب کرنا تھا لیکن اس سے پہلے فلیٹی ہوٹل میں ایک عشائیہ تھا جس میں تیس چالیس افراد مدعو تھے۔ علامہ صاحب کچھ دیر مختلف کھانوں کی ارتقائی شکلوں پر گفتگو کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں مختلف علاقوں کے ذائقے اور ذوق کا ذکر کیا۔ اور ان کے تفاوت پر روشنی ڈالی۔ ان کی یہ گفتگو انتہائی دلپذیر تھی۔ بجائے خود ایک طعام تھی۔ میں نے بات پلٹنے کے خیال سے تاریخ کے بعض رخنوں کا ذکر کیا آپ نے پہلے تو غالب کا یہ شعر پڑھا۔ ؎

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

پھر فرمایا: "تاریخ کی سچائیاں ایک خاص دور میں یا ایک خاص دور کے بعد داغدار کی گئی ہیں

ادھر انسان نے سیاست کی شاہراہ پر تاریخ سے شرارتیں کی ہیں جب ان شرارتوں کو فرمانروایانہ سرپرستی حاصل ہو تو قلم بھی دشنہ و خنجر ہو جاتے ہیں۔ میرے ایک فقرے کو نوازتے ہوئے کہا۔ "تمہارا وہ جملہ خوب تھا کہ تاریخ صحیفہ ربانی نہیں۔ لوگوں نے احادیث میں قلم لگایا۔ تاریخ کیونکر بچ رہتی جن لوگوں کی تلواریں اہلِ بیت سے انصاف نہ کر سکیں ان کے قلم کیوں کر انصاف کر سکتے تھے۔"

مجلس عزا کا وقت ہو رہا تھا۔ مجھے ہمراہ لے گئے۔ کئی ہزار کا مجمع تھا اور پسِ پردہ کئی سو عورتیں تھیں۔ آپ نے کلام پاک کی ایک آیت پڑھی۔ اس کے تحت حکیمانہ معارف بیان کئے۔ جعفرؑ کا تذکرہ کیا اور ذیل کا مصرعہ پڑھا ـــ ؎

پھر اُن کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

اس کے بعد کربلا کا حادثہ محزنہ بیان کیا۔ فضائل بیان کئے۔ فضا گوش بر آواز تھی۔ مصائب کی طرف آئے تو کہرام مچ گیا۔ ان کی اپنی آواز بھرا گئی۔ میری پلکیں بھیگ گئیں اور معاً وہ لوگ مجھے

یاد آ گئے۔ جو آنسوؤں کے سیل پر اعتراض کرتے لیکن خون کے دھاروں پر مسکراتے ہیں۔ ؎

سوچتا ہوں کہ اسی قوم کے وارث ہم ہیں
جس نے اولادِ پیمبرؐ کا تماشا دیکھا !!

علامہ صاحب دل کے ہاتھوں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ گلہ کیا کہ ہر شخص کے لئے موت ہے۔ ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے

لیکن بعض شخصیتیں وقت سے پہلے چلی جاتی ہیں۔ اور ان کے ساتھ محاسن کی ایک دنیا اٹھ جاتی ہے۔ انسان مرنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور ہم کسی کی موت کو روک نہیں سکتے۔ اگر قدرت استثنار رکھتی اور ہر دور میں کسی شخص کو اس کے حسن کی وجہ سے موت نہ آتی تو ذکرِ اہلِ بیت کی بدولت رشید ترابی نہ مرتے۔ انہوں نے ربع صدی سے زیادہ عرصہ اہلِ بیت کے فضائل و مصائب بیان کئے۔ اس ذکر نے انہیں زندۂ جاوید کر دیا۔ اور وہ مر کے بھی زندہ ہیں۔ ان کا جسم نہیں رہا لیکن ان کی روح باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو نہیں مرنے دیتے۔ جو ان کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اولاد علیہ السلام سے محبت کرتے۔ اور ان کے ذکر و افکار سے اپنے شب و روز کو زندہ رکھتے ہیں۔ رشید ترابی عمر بھر عشقِ اہلِ بیت میں مستغرق رہے۔ اب وہ چلے گئے لیکن ان کی یاد ہمیشہ رہے گی۔ اپنا گلہ یہ ہے کہ خاک سے یہ پوچھنے کا مقدور ہی نہیں کہ ؎

تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کئے

خطیبِ مشرق

علامہ سید محمد رضی صاحب قبلہ

آج میں علامہ رشید ترابی کو خطیب مشرق لکھ رہا ہوں یہ سمجھتے ہوئے کہ ڈاکٹر اقبال میں جو امتیازی صفت شعر و سخن کی دنیا میں شاعر مشرق ہونے کی حیثیت سے موجود تھیں ویسی ہی گوناگوں کیفیات حسن بیان اور میدانِ خطابت میں علامہ ترابی کی شخصیت کے اندر بھی پائی جاتی تھیں۔ ڈاکٹر اقبال نے شعری ادب کو ایک جدید اور انتہائی کامیاب رخ دیا تھا تو ترابی صاحب نے بھی طرز خطابت کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال دیا تھا جس میں جدید و قدیم علوم کی تمام لطافتیں سمٹ آئی تھیں۔

جہاں تک میں تاریخ شعر و خطابت کا تجزیہ کر سکا ہوں۔ میرے خیال میں یہ بات ایک کلیہ کی حد تک صحیح ہے کہ جو شخص بھی خطیب ہوتا ہے اسے فطری طور پر شاعری سے دلچسپی لازمی ہوتی ہے۔ چنانچہ علامہ ترابی کو بھی شاعری سے نہ صرف دلچسپی ہی تھی بلکہ وہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ ان کے مزاج میں مشکل پسندی ضرور تھی۔ وہ خطابت و شاعری دونوں میں زیادہ تر گہرے مضامین کے لئے دقیق زبان بولا کرتے تھے۔ اس کے باوجود ان کے طرز ادا میں بلا کا سحر تھا اور اپنی وسعت نظر اور وسعت زبان کے باوجود وہ اپنے سامعین کو چند لمحوں میں اس طرح مسحور کر لیتے تھے کہ ان کے ایک ایک فقرہ پر وہ تڑپ اٹھتے تھے۔ ان کی تقریروں میں ریسرچ اور علمی تحقیق کے عجیب رخ ہوتے تھے۔ انہوں نے رومی اور اقبال کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انہیں قرآن پاک کا بیشتر حصہ یاد تھا۔ وہ نہج البلاغہ کے تقریباً حافظ تھے۔ وہ انگریزی زبان اور جدید علوم پر پورا عبور رکھتے تھے۔

غرض ان کی شخصیت ایک مثالی شخصیت تھی اور انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی اپنے علم اور اپنی خطابت سے وہ معیاری خدمت انجام دی ہے۔ جو تاریخ کے اوراق پر ہمیشہ نمایاں رہے گی۔

اس سلسلے میں میری رائے یہ بھی ہے کہ علامہ مرحوم کے نام پر پہلی فرصت میں ایک علامہ ترابی اکیڈمی یا اسی طرح کے کسی دوسرے عنوان پر ایک علمی تنظیم قائم کی جائے جو ان کے متعلق ایک ایسی کتاب شائع کرے جس میں مشہور اہل قلم کے مضامین ہوں اور وہ ان کی زندگی کے ہر پہلو پر تبصرہ کریں۔ اور اس کا دوسرا کام یہ ہو کہ وہ علامہ کی تقریروں کو جمع کر کے کتابی شکل دے۔ یہ کتاب اور علامہ کے حالات کا مجموعہ عربی، فارسی، اردو، سندھی، گجراتی اور انگریزی میں الگ الگ شائع ہونا چاہیئے اس اکیڈمی کا تیسرا اور مستقل کام یہ ہونا چاہیئے کہ یہ مختلف ضروری اور اہم موضوعات پر اس وقت کی رائج زبانوں میں کتابیں تصنیف کرے اور تراجم کا بندوبست کرے

اس علمی تنظیم کے ساتھ ہی میری رائے یہ بھی ہے کہ علامہ کے نام پر جلد از جلد ایک "علامہ ترابی فاؤنڈیشن" کا قیام عمل میں لایا جائے۔ جس کی طرف سے ایسے طلبۂ اور طالبات کو خصوصی وظائف دیئے جائیں جو فن خطابت سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ تاکہ ملک میں زیادہ سے زیادہ ایسے لوگ تیار ہو سکیں جو میدان خطابت میں عملی طور پر حصہ لے سکیں۔ خطیبوں، دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں نے بڑی بڑی مسلح اور منظم فوجوں سے زیادہ مؤثر کام انجام دیئے ہیں۔ اور قوموں کی تقدیریں بدل دی ہیں۔ اس لئے اس فن سے غفلت برتنا کسی زندہ معاشرہ کے شایان شان نہیں ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم لوگوں کو یہ عادت پڑ گئی ہے کہ ہم اپنے لائق افراد کی زندگی میں ان کی قدر نہیں کرتے اور نہ ان کی خدمات اور صلاحیتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور صرف

ان کے مرنے پر مظاہرے کرتے رہتے ہیں۔ اور وہ بھی گنتی کے چند روز۔ اور پھر ان کو ذہن سے اسطرح بھلا دیتے ہیں جیسے وہ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے اگر ہم علامہ ترابی کے علمی خدمات کا اعتراف کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ٹھوس اقدامات سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو یہ ہمارے مستقبل کے لئے ایک درخشاں مثال ہوگی۔ سطحی اور رسمی باتوں سے کوئی مفید اور کارآمد نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

(امید واثق ہے کہ علامہ سید محمد رضی صاحب قبلہ کو ترابی صاحب پر زیر نظر کتاب پسند آئے گی کیونکہ یہ انہی کی تجاویز سے ہم آہنگ کتاب ہے)

چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک

ابراہیم جلیس

موت برحق ہے، یہی نظامِ فطرت ہے۔ ہر ذی حیات کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ خضر و مسیحا کو اس سے مفر نہیں ہے۔

بر ایں ہمہ کسی محبوب شخصیت کے وصال پر ہمارا سینہ کوبی بھی بشری تقاضے کے عین مطابق ہے۔ یہ ممکن بھی کیوں کر ہو کر ہماری متاعِ بے بہا ہماری نظروں کے سامنے لٹ رہی ہو اور ہم خاموش تماشائی بنے رہیں اجل کا ہم ہاتھ نہیں روک سکتے تو کیا ہوا، ہمیں دست و گریباں پر تو اختیار ہے۔

موتِ عالم، موتِ عالم! بلاشبہ رشید ترابیؒ ایسے عالم تھے جن کے وجودِ معنوی میں عالَمِ معنی کا بحرِ بیکراں موجزن تھا۔ ان کا تارِ نفس کیا ٹوٹا۔ سازِ محفل برہم ہو گیا۔

وہ ایسے شاعر تھے جنہوں نے جوابِ شکوہ لکھ کر علامہ اقبال کو ایک نئی جہت پر لگا دیا۔ وہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے صاحبِ طرز ادیب تھے۔ وہ بوقت غزا مردانِ حق کے قلب کے جنبجو اور صفِ اوّل کے معمارانِ پاکستان میں سے ایک تھے۔ گویا وہ جامع الصفات تھے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں نے متذکرہ بالا ہر میدان میں نئے امکانات پیدا کئے اور اپنے انمٹ

نقوش چھوڑے۔

ان جملہ سعادتوں سے قطع نظر وہ ایسی محبوب شخصیت تھے کہ برصغیر کے مختلف مذاہب مکاتب کے لوگ ان سے شیفتگی کا اظہار کرتے۔ ان کی خطابت میں شکوہِ جبال اور خروشِ بحرِ بیکراں کا عجیب امتزاج تھا۔ وہ جب ممبر پر آتے عالم الوان تو دے اٹھتا۔

وہ جامع الصفات من موہنی شخصیت ۱۸ دسمبر ۱۹۷۳ء کو زمان و مکان کی قید سے رہا ہو کر عالم قدس کے سفر پر روانہ ہوئی۔ اور ہم بہ تقاضائے بشری آہ و شیون کرتے رہ گئے۔

"منبر کا دوسرا نام" میں ہم پھر اس کی یادوں کی قندیل روشن کر رہے ہیں۔ تاکہ اس کی روشنی خیرِ جاریہ کی صورتِ مدام تابندہ و تابندہ رہے اور اس کے فکر و نظر کی روشنائی میں نہج الاست مانند کہکشاں تابناک بنی رہے۔

زیرِ نظر کتاب کی اشاعت پر میں اپنے نوجوان دوست عزیزم امیر حسین کو ہدیۂ تحسین پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے مشکل ترین حالات میں بھی عالمِ اسلام کے اس لازوال خطیب پر کتاب لانے میں پہل کی اور اس سلسلے میں ترابی صاحب کے بہت سے عقیدت مندوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اللہ انہیں سلامت رکھے۔

زمین سے ایک بار پوچھا گیا کہ
"وہ آسمان کے بارے میں کیا جانتی ہو"۔؟
تو زمین بڑے عجز سے بولی۔
چہ نسبت خاک را با عالم پاک

قارئینے ! آج میں بھی ایسا ہی سراپا عجز ہوں۔
کہاں علامہ رشید ترابی کی عظیم ترین شخصیت !
اور کہاں میں ان کا ایک ادنیٰ ترین عقیدت مند۔!!
وہ آسمان ———— میں زمین۔
وہ درسگاہ علم وفضل کے سب سے اونچے مینار
میں مکتب علم کی سیڑھی کا سب سے نچلا پتھر۔
وہ ہمالہ ———— میں سنگ ریزہ
وہ علم وحکمت کے بحرِ بیکراں۔
میں ایک ننھا سا قطرۂ بے مصرف۔

حضرت علامہ رشید ترابی کے ذکر کے لئے حضرت علامہ رشید ترابی جیسی ہی کوئی شخصیت موزوں ہو سکتی ہے۔ اس عاشق حسینؑ کے لئے کم از کم سید ہاشم رضا جیسا انیس ودبیر ہی ضروری ہے۔

میں تو صرف ان کی تا ابد چمکتی، دمکتی، چہکتی یاد پر اپنے احترام اور عقیدت کے خوش رنگ گلاب بکھیرنے کی سکت رکھتا ہوں یا ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ان کے غم کے اندھیرے میں چند یادوں، چند باتوں اور چند ملاقاتوں کی شمعیں جلا سکتا ہوں۔

اب سے برسوں دور میں سطح مرتفع دکن کے ایک چھوٹے سے شہر گلبرگہ میں ایک ایسا طالب علم تھا جو انٹر کالج تقریری مقابلوں میں ہمیشہ اوّل آیا کرتا تھا۔ ان دنوں ہمارے انگریزی کے استاد ڈاکٹر مظہر علی خان صاحب (مرحوم) تھے جو علامہ رشید ترابی کے سگے بھائی تھے اور جو پشاور یونیورسٹی میں شعبہ انگریزی کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ جن

سانحہ انتقال گزشتہ سال ہوا۔ ایک بار ڈاکٹر مظہر علی خان ہمارے کالج کے مقرروں کی ایک ٹیم لے کر انٹر کالج تقریری مقابلوں کے لئے گلبرگہ سے حیدر آباد شہر گئے۔ جس دن ہم حیدر آباد پہنچے اسی شام علامہ رشید ترابی ایک مجلس پڑھنے والے تھے۔ جناب مظہر علی خان کے ساتھ ہم بھی اس مجلس میں حاضر ہوئے۔

پہلی بار میں نے علامہ رشید ترابی کو بولتے سنا تو اپنی عمر میں پہلی ہی بار مجھ پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ انسانی آواز ایک سحر بھی ہوتی ہے ـــــ انسانی آواز ایک ایسا جادو بھی ہوتی ہے کہ سننے والے پتھر کے بتوں کی طرح ساکت وصامت ہو جائیں اور صرف اس آواز کے لئے سراپا گوش بن کر رہ جائیں

ایسی آواز سننے والا بولنا بھول جائے گونگا ہو جائے۔

چنانچہ میں جو کہ اس سے پہلے ہر تقریری مقابلے میں اوّل آتا تھا۔ علامہ رشید ترابی کو بولتا دیکھ کر جیسے ابھی تک گنگ ہو کر رہ گیا ہوں

سچ ہے ـــــ انسان بولے تو رشید ترابی کی طرح بولے ورنہ پھر ذکر وتقریر اور نطق وگفتار کی توہین نہ کرے ـــــ!

میں نے اپنی ساری زندگی میں صرف دو ہی آوازیں ایسی سنی ہیں جو صرف آوازیں ہی نہیں تھیں۔ بلکہ وہ شمشیریں تھیں جو غلام ہندوستان اور محکوم ہندی مسلمان کے ہاتھوں اور پیروں کی بیڑیاں اور زنجیریں کاٹتی تھیں ـــــ!

میں نے پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کٹتے تو نہیں دیکھا البتہ آواز کے تیشے سے غلامی کی آہنی بیڑیاں اور فولادی زنجیریں ضرور

کشتی دیکھی ہیں۔ !

وہ آوازیں، آوازیں نہیں بلکہ جلتے لپکتے شعلے تھے جس نے ہندوستان کے بھیانک سیاسی اندھیرے کو منور فروزاں اور درخشاں کر رکھا تھا۔

ایک آواز ـــــــ بہادر یار جنگ کی آواز۔

دوسری آواز ـــــــ علامہ رشید ترابی کی آواز۔

دونوں آوازیں ایسی کہ سننے والا محسوس کرے جیسے اس پر کلامِ الٰہی قرآن پاک اردو میں نازل ہو رہا ہے۔

دونوں آوازوں کا ایک ہی سرچشمہ ـــــــ کلامِ الٰہی ـــــــ دونوں نے بولنے کا اندازہ، لب و لہجہ اور مواد و متنِ قرآن پاک سے ہی لیا تھا۔

ہندوستان میں علامہ رشید کو صرف دیکھا تھا، صرف سنا تھا لیکن ملاقات پاکستان میں ہوئی۔

سنہ ۱۹۵۱ء کا ذکر ہے میں نے اپنے ایک دوست مرحوم فصیح الدین احمد کے ہفت روزہ "پیام مشرق" کے محرم نمبر میں سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کو خراجِ عقیدت اور سلام پیش کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"جب سے دنیا قائم ہوئی ہے اس وقت سے آج تک صرف حسین ابن علی وہ واحد انسان ہیں جن کے لئے انسانوں نے سب سے زیادہ آنسو بہاتے ہیں۔ دنیا میں اب تک تو سات سمندر ہیں لیکن اگر حسینؑ کے غم میں بہاتے جانے والے سارے آنسوؤں کو اکٹھا کیا جاتا تو دنیا میں ان ساتوں سمندروں

سے بڑا اور ذخار سمندر ٹھاٹھیں مارتا جس کا نام ہوتا۔

"بحرِ غم سیّد الشہداء"

حضرت امام حسینؑ صرف حضرت علی علیہ السلام کے جگر گوشے اور سرورِ کائنات کی آنکھوں کے نور ہی نہ تھے بلکہ عالمِ اسلام میں،

سچ کی سربلندی

ظلم کے خلاف جہاد

شخصی حکومت کے خاتمے

اور سلطانیٔ جمہور کے ظہور

کا مقدس، پیارا اور نہایت ہی مختصر نام ہے ــــــــ

ــــــــ "حسینؑ" علیہ السلام

میری یہ تحریر علامہ رشید ترابی صاحب کی نظر سے گزری تو انہوں نے فصیح الدین احمد سے کہا۔

"میں اس مضمون نگار سے ملنا چاہتا ہوں"

مجھے پیغام ملا تو میری خوشیاں، دنیا کی سرحدوں سے بھی زیادہ وسیع ہو گئیں کہ۔

"علامہ رشید ترابی نے مجھے بلایا ہے!"

خدمت میں حاضر ہوا تو فرطِ محبت سے گلے سے لگا لیا اور واہ واہ کرتے جاتے تھے۔

"کیا بات کہی ہے سات سمندر

چھوٹے ــــــ اور سب سے بڑا

بحرِ غم سیّد الشہداء واہ واہ۔"

پھر مجھے اتنا بڑا اعزاز عطا فرمایا کہ ایک شامِ غریباں کی عبری مجلس میں مجھ سے ناچیز کا نام لیکر میری عزت افزائی فرمائی۔

پھر جب کبھی بھی مجھ پر مصیبتیں ٹوٹیں انہوں نے مجھے بتائے بغیر میری ہر مصیبت دُور کی۔ آج میں علی الاعلان اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ یہ بات صرف مجھے، علامہ مرحوم اور خداوند لایزال کو معلوم ہے کہ علامہ نے میری بے روزگاری اور تنگدستی میں کس رازداری سے میری مدد کی۔ شاید اس کا علم ان کے بائیں ہاتھ کو بھی نہ ہوا ہو ــــــ انہوں نے دو بار مجھے جیل سے بچایا۔ مجھے بتائے بغیر ایک بڑے اخباری ادارے میں میری ملازمت طے کرا دی۔

انہی احسانات کے باعث میں ان سے اتنا شرمندہ رہتا تھا کہ بہت کم حاضرِ خدمت ہوا، وہ خود ہی کبھی کبھی فون پر یاد فرما لیا کرتے تھے۔

علامہ صاحب جب آخری بار مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو کارڈیو ویسکولر انسٹی ٹیوٹ کے ایک ماہرِ امراضِ قلب ڈاکٹر صاحب نے جن سے میں نے بھی بیماری دل کی شفا پائی ہے علامہ صاحب کے بارے میں بڑی تشویش کا اظہار کیا اور بڑے رازدارانہ لہجے میں بولے۔

"ذاکرِ حق کو اوجِ ثریا تک پہنچانے
والی پاکستان میں آخری آواز اب
ہمیشہ کے لئے خاموش ہوا چاہتی ہے
علامہ رشید ترابی اب آخری سفر کا رختِ

باندھ چکے ہیں۔ اب ان کی طرف
سے دیری نہیں ہے۔ دیری موت
کے فرشتے کی طرف سے ہو رہی ہے
اب صرف موت کے فرشتے کی
گاڑی کے آنے کی دیر ہے۔

میں دکھ سے دیک ہو کر رہ گیا۔ میں نے ایک دعائیہ مضمون لکھا اس میں یہ سوچ کر کہ اب علامہ کی آنکھیں بند ہیں وہ سارے احسانات اکٹھے کئے جو علامہ نے میری علم و اطلاع کے بغیر مجھ پر کئے تھے اور آخر میں یوں دعا مانگی۔

"اللہ تعالیٰ میری عمر کے باقی مرد
سال علامہ رشید ترابی کی عمر میں شامل
کر دے۔"

اس کے بعد علامہ نے ہر بیمار کی طرح آخری سنبھالا لیا ان کی نظر سے میری وہ تحریر گزری تو عزیزم نصیر ترابی سے کہا۔

"جلیس نے جو کچھ لکھا ہے اس کے لئے بڑا ظرف چاہیئے
بہت بڑا ظرف۔"

اور نصیر سے فون کروایا بڑی دعائیں دیں۔

اس دنیا سے ہر انسان کو جانا ہے۔ علامہ رشید ترابی بھی خدا کے حضور چلے گئے۔ لیکن وہ اپنے پیچھے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی ایک چمکتی، دمکتی، مہکتی یاد چھوڑ گئے ہیں۔

اب ان کی یاد کا دلآویز اجالا اسی دن ختم ہو گا جس دن کا آخری سورج غروب ہو گا۔

مجلسِ شامِ غریباں

افتخار عارف

شاعری اگر جزوِ پیغمبری ہے تو خطابت بھی کارِ پیغمبراں سے کم نہیں خطابت کا فن انسان کی طرح عظیم اور قدیم ہے۔ آج ہمارے عہد میں خطابت کی عظمت کا دوسرا نام علامہ رشید ترابی تسلیم کیا گیا ہے۔ علامہ کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت دراصل خطابت کے ایک منفرد مکتب کی علامت ہے ان کی ہشت پہلو شخصیت میں ایسے جوہر یکجا ہیں جو شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتے ہیں ان کے ذہن کی وسعتوں نے جلال و جمال کو اس طرح فروغ دیا ہے کہ خطابت کی ایک نئی دنیا آباد ہو گئی ہے۔ اس نئی دنیا کی سیر آتنی سحر آفریں ہے کہ سماعتوں کو اظہار و ابلاغ کے ایسے راستوں سے گذرنا پڑتا ہے کہ ذہن پرسش کے بجائے پرستش کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ یہ ہزار شیوگی اس لئے بھی ہے کہ انہوں نے ایک عمر کوہ کنی کے بعد پوری دیانت کے ساتھ اپنے خونِ جگر کو ہدیۂ سماعت کیا ہے۔ ان سے پہلے جراحتِ جاں کی یہ گلکاریاں ایوانِ خطابت کی دیواروں پر ناپید تھیں۔ قائد اعظمؒ اور بہادر یار جنگؒ جیسی ہستیوں کے دوش بدوش مسلمانوں کی سربلندی کے لئے اس کوچے میں قدم رکھنے والا اور خلیفہ عبدالحکیم سید ابو بکر شہاب عریضی نظم طباطبائی اور مولانا سبط حسن جیسے اساتذہ سے فیضیاب ہونے والا آج اپنے اسلوب اور پیرایۂ اظہار کے باعث ملت اسلامیہ میں یگانہ نہ

روزگار ہے۔ خطابت کے اس سمندر میں مغرب و مشرق کے فکری دھاروں کا وہ سنگم ہے جس سے تبحرِ علمی کا ایک سیلِ رواں اُمنڈتا دکھائی دیتا ہے۔ اور روانی اس بلا کی ہے کہ خود اپنے ساتھ سننے والوں کو بہت دور تک بہائے لئے جاتی ہے۔ یہ بہاؤ لہجے کے آتار چڑھاؤ کا مرہونِ منت نہیں ہے۔ بلکہ قرآنِ حکیم سے استنباط پر بھرپور قدرت کا نتیجہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تقریر گویا افکارِ عالیہ کی تقدیر ہے۔ تصرفِ شعری کا وہ کمال کہ ایسی مثال ہنوز نایافت تصور کی گئی۔ فلسفۂ تاریخ کا ایسا حکیمانہ ادراک کہ ذہنوں میں اسرار و معانی کے دریچے خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں۔ اور ان دریچوں سے آفاقی فکر کی روشنی دلوں کو منور کرتی چلی جاتی ہے۔ واقعۂ کربلا کی تفسیر کے لئے جدید اور عالمی موضوعات کے کوہِ گراں کو آبِ رواں بنانا انہی کا حصہ ہے۔ وہ خطابت کی ایسی سلطنت میں جس میں آورد نہیں بلکہ آمد کی فرمانروائی ہے۔ انیسؔ کے ہاں جو فصاحت ہے وہ ان کے لئے مشعلِ سخن اور دبیرؔ کے ہاں جو بلاغت ہے وہ ان کے قصرِ خطابت میں شمعِ تکلم کی حیثیت رکھتی ہے ملتِ اسلامیہ نے ایسا خطیب شاید ہی پیدا کیا ہو جس کی مقبولیت عامہ برصغیر سے نکل کر مشرقِ وسطیٰ، افریقہ اور یورپ تک اپنا یکساں اثر و نفوذ رکھتی ہے، مجلسِ شامِ غریباں کو آفاقی سطح پر لانے میں علامہ کی شخصیت اولیت کے منصب پر فائز ہے۔ اور پاکستان ٹیلی ویژن نے عامۃ الناس کے استفادے کے لئے اس شہکار کو پیش کر کے ایک مؤثر وسیلے کا فریضہ ادا کیا ہے۔

پہلودار شخصیت

حکیم محمد سعید دہلوی

حوالہ نمبر ذ/۵/۷

کراچی

۸ ــــ جنوری ــــ ۱۹۷۵ء

حضرت علامہ رشید ترابی بڑی پہلودار شخصیت کے مالک تھے۔ اکثر لوگ ان کو عظیم خطیب کی حیثیت سے جانتے ہیں اور واقعی ان کا زورِ خطابت مسلم مگر علامہ ترابی اس کے علاوہ بہت کچھ تھے اور وہ کیا نہ تھے!

شاعر و ادیب عالم و فاضل سیاست دان، دانشور۔ ایسا پہلودار انسان کسی ایک فرقے کا نمائندہ نہیں ہوسکتا۔ وہ مسلمان تھے اور ان کی عظمت یہی تھی۔ مسلم لیگ کے ایک سرگرم رکن تھے مگر پاکستان میں اچھا کیا کہ انہوں نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کی اور ملی کردار کی درستی و بحالی پر توجہ صرف کی کہ مثبت و موثر سیاست کے لئے بلند کردار ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اس میدان میں انہوں نے اہم نقوش چھوڑے ہیں۔ مجھے ایک واقعہ یاد ہے قومی پارلیمانی انتخاب میں جب میں نے حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا تو علامہ مرحوم نے عزیزہ ڈاکٹر عالیہ امام کو میرے مقابلے میں حصہ نہ لینے کا مشورہ دیا تھا اور میری تائید کا فیصلہ فرمایا تھا۔

تاریخِ اسلام کا چراغ

ریاض فرشوری

علامہ رشید ترابی صاحب بھی گئے۔ وہ دوسروں کے لئے علامہ تھے، عالم دین تھے، عاشق اہلبیت تھے، ذاکر تھے، شاعر تھے، الفاظ و فکر کے بادشاہ تھے لیکن میرے لئے ان کی ذات ایک روشنی تھی۔ انہیں دیکھ کر انہیں سلام کر کے دل کو سکون ہو جاتا تھا کہ نظریہ پاکستان زندہ ہے، تصور پاکستان زندہ ہے۔ انہیں سلام کر کے تاریخ اسلام کی تمام بڑی شخصیتوں کو سلام پہنچ جایا کرتا تھا۔ ان کے چلے جانے سے سلام کرنے والا ہاتھ نیچے گر گیا ہے۔ اس لئے پاکستان میں اب کوئی آدمی ایسا نہیں رہ گیا جسے سلام کر کے اپنی پوری اسلامی فکر کی تاریخ کو سلام پہنچا سکوں۔ اس ذاتی المیہ کے لئے نہ کوئی لفظ ہے نہ کوئی لہجہ ہے۔ آنسو ہیں لیکن آنسو خشک ہو جاتے ہیں۔ ترابی صاحب تو اپنے ساتھ میرا سلام بھی لے گئے۔

دنیائے اسلام میں ان کے بے شمار عاشق تھے۔ اس لئے کہ انہوں نے خدا سے بڑا پیار کیا تھا۔ یقین کیجئے خدا سے ایسا بھرپور پیار کرنے والا آدمی بھی میں نے نہیں دیکھا۔ وہ بات کرتے تھے حسینی قافلے کے سفر کی، لیکن موضوع ہوتا تھا ذرے کا آفتاب کی جانب سفر۔ آدمی کا خدا کی جانب سفر۔ وہ بات کرتے تھے رسول کے نواسہ کی پیاسوں کی، صبر کے امتحان کی، لیکن موضوع ہوتا تھا، آدمی کا خدا کے نام سجدہ، ایسا سجدہ کہ نہ کسی آدمی نے اس سے پہلے کیا تھا اور نہ اس کے بعد کوئی آدمی کرے گا۔ ان کی ہر تقریر میں اور ہر تحریر میں اہمیت سجدے کی تھی۔ شام غریباں رہتی دنیا تک اس

لئے بڑی ہو گئی ہے کہ آدمی نے اس شام کا سجدۂ شکر لیے بانکپن سے ادا کیا تھا کہ شام عاشورہ حسین کا سجدۂ شکر آدمی کی معراج بن گیا۔

ترابی صاحب کو دیکھ کر آدمی کی عظمت اور آدمی کی معراج یاد آتی ہے۔ اب کون ہے جسے دیکھ کر آدمی خود اپنی بڑائی اور معراج کو سلام کرے گا۔ حالی کو غالب کی وفات پر یہ دکھ تھا کہ شہر میں چراغ تھا جو نہ رہا۔ لیکن ترابی صاحب دنیائے اسلام کے ذہن کے چراغ تھے۔ ترابی صاحب نہیں گئے ہم خود بے چراغ ہو گئے ہیں۔

آج جب وہ ہم میں نہیں ہیں تو ان کی بہت سی باتیں یاد آرہی ہیں۔ ان کی وضع داریاں، ان کی بے تعصب بے پناہ محنتیں، ان کی ہمت افزائیاں، ہمدردیاں، وہ دھیمی مسکراہٹیں جو اعتماد دیتی تھیں۔ آج مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ ہم پھر سب عاشورہ میں خیمہ حسینی میں ہیں اور چراغ بجھا دیا گیا ہے۔ اور کوئی کہہ رہا ہے کہ جس کو جانا ہے چلا جائے۔ ترابی صاحب بجھا دیئے گئے ہیں۔ اور ہم امتحان میں ہیں، اے ہمارے رب ہم حاضر ہیں۔ لیکن آنسوؤں پر قدرت نہیں ہے۔،
بارالہٰ، روشنی، اے رب کائنات روشنی تیری ہی روشنی تھی۔ جو تیری طرف واپس چلی گئی۔ خیمہ حسینؑ کے آخری چراغ کو بھی سلام جو بجھ گیا اور ترابی صاحب آپ پر بھی آخری سلام جو میرے لئے اسلامی فکر کی پوری تاریخ کے آخری چراغ تھے۔ خدا آپ کو تا ابد منور رکھے۔؎

میرا آئیڈیل

علامہ عباس حیدر عابدی

ذہن کے جھروکوں میں یادوں کی شمعیں جھلملانے لگی ہیں۔ غم کا دھندلکا کم ہو تو کچھ دکھائی دے۔ ایک اثر و جلال سے بھرپور آواز جو وجد آگیں بھی تھیں اور کیف آور بھی جس سے قوم کے فکر و ذہن کی تربیت بھی ہوتی تھی اور تطہیر بھی۔ اب سنائی نہیں دیتی

آہ وہ اب کبھی سنائی نہیں دے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

وہ کون تھا جس کی آواز کا یہ ذکر ہے جس نے سماعت کی تواضع کے لئے دسترخوانِ تکلم کو نوع بہ نوع ذائقوں سے سجایا تھا۔ اور فکر کے طائر کو آگہی کی زنگارنگ وسعتوں سے روشناس کرایا تھا۔ جو دل بن کے ٹوٹ گیا ہے لیکن کسک بن کے ہمیشہ باقی رہے گا۔ جو پھول بن کے مرجھا گیا ہے لیکن مہک بن کے ہمیشہ مشامِ جان کو معطر کرتا رہے گا جو خود تو آفتابِ خطابت بن کے غروب ہو گیا ہے۔ لیکن اس کا اجالا برسوں جہانِ سماعت کی فضاؤں کو روشن رکھے گا۔ وہ مجھ سے دور ہو کر میرے کس قدر قریب ہو گیا ہے۔ ! اور میں اس سے قربت کی آرزو میں اس سے اس قدر دور ہو گیا ہوں کہ نہ اب اس کو دیکھ پاتا ہوں اور نہ مجھے اس کی آواز سنائی دیتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

ماضی کے دھندلکے میں یاد کا ایک دیا ٹمٹماتا ہے۔ اس کی ہلکی روشنی میں ایک تحریر ابھری ہے۔

"سیزدہ صد سالہ یادگارِ حسینی"

پیغمبر حریت اور سرخیلِ کاروانِ عرفانِ بندگی۔ ابن زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا کی

بشہادتِ عظمیٰ کے تیرہ سو برس مکمل ہونے پر اس جلسہ کا انعقاد کیا گیا ہے۔ موسیٰ ندی کے مقابل پر سالارجنگ کی بارہ دری کے وسیع و عریض میدان میں، مسلمانوں کا تاریخی اجتماع ہے۔ خطیبِ ملت نواب بہادر یار جنگ صدرِ جلسہ ہیں۔ میں اپنے چھوٹے چچا جن کو میں "عمو جان" کہتا ہوں۔ ان کی انگلی پکڑ کر جلسہ گاہ میں داخل ہوا ہوں۔ مجالس سے شغف اور مذہبی اجتماعات سے میری ذہنی قربت میں میرے عمو جان کا بڑا حصہ ہے، بلکہ یہ ان ہی کی توجیہہ کا فیض ہے۔

بہرحال جلسہ میں کسی شاعر نے اپنا کلام پڑھا۔ پھر بیرسٹر حیدرآباد رائٹ لا نے تقریر کی کچھ اور تقریریں ہوئیں مُعلن نے ایک بار نام پکارا۔ اب ناصرالدین علامہ رشید ترابی تقریر کریں گے۔ مجمع میں ہلچل سی ہونے لگی۔ لوگ آنکھیں مل مل کے سیدھے ہو کے بیٹھ گئے مائکروفون کے سامنے ایک جواں سال جواں ہمت . . . . . پہلے جھرنا پھوٹا پھر سیل چلا۔ اور پھر ارضِ سماعت، خطابت کے موج در موج دریا سے سیراب ہونے لگی۔ تقریر ختم ہوئی ہی تھی۔ کہ صدر نشین سے نواب بہادر یار جنگ فوراً اٹھے انہوں نے علامہ صاحب کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"اب رشید میاں کے خطاب کے بعد میرے لئے بولنے کو کیا باقی رہ گیا ہے"

مجالس میں شرکت تو ہر شیعہ بچے کی طرح میں بھی بہت چھوٹے سن ہی سے کیا کرتا تھا۔ لیکن صغیر سنی میں یہی ہوتا کہ ہم مجلس میں جاتے اور تھوڑی دیر کے بعد عمو جان کے زانو پر سر رکھ کر سو جاتے اس لئے کہ نہ مقرر کی بات کو سمجھنے کے لئے ذہن میں استطاعت تھی اور نہ عنوان میں دلچسپی، اور جاگتے اس وقت جب تبرک تقسیم ہونے لگتا۔ دراصل تبرک کی تقسیم حسینؑ اور پیغام حسینؑ سے بچوں کو بچپن ہی سے مانوس کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے بڑی مصلحت سے نیاز کی تقسیم کو مجلس کا جزو قرار دیا تھا۔ حیدرآباد میں جب مسلمان آسودہ حال تھے تو

مجلس کے بعد نان کباب، بریانی کے تھال، پھلوں کی ٹوکریاں، چینی کے برتن کونڈ کونڈ مٹھائی ڈال کر تقسیم کیا کرتے تھے۔ جس کے نتیجے میں بہت سے لوگ جو مجلس سے ناواقف ہوتے تھے، تبرک و نیاز کے شوق میں مجلس سے مانوس ہو جاتے تھے۔ لیکن مجھے اپنی زندگی کی سب سے پہلی مجلس جو اس طرح یاد ہے کہ پوری تقریر میں نے جاگ کر سنی اور ساری تقریر میں ایک لفظ بھی سمجھ میں نہ آنے کے باوجود اس طرح کھویا رہا کہ مجھے یہ پتہ ہی نہ چلا کہ کب تک تقریر شروع ہوئی کب ختم ہو گئی۔ یہ مجلس بہادر یار جنگ کی ڈیوڑھی میں علامہ علی اللہ مقامہ نے پڑھی تھی۔ اور میں منبر کے سامنے بیٹھا رہا تھا۔ خطابت کے جادو اثر نے مجھے مسحور کر کے رکھ دیا تھا۔

اِس کے بعد میں نے ان کی بہت سی مجلسیں سنیں، مجلس اتحاد المسلمین کے بہت سے جلسوں کی تقریریں سنیں۔ حیدرآباد دکن میں نواب بہادر یار جنگ جیسے عظیم خطیب اور دُور بیں مدبر نے مسلمانوں کے سیاسی جلسوں کا انعقاد "میلاد النبی" کے عنوان سے جلسے کروا کیا تھا۔ نواب مرحوم کی اس میں مصلحت یہ تھی کہ اس طرح مسلمان اپنی سیاسی بیداری اور جد و جہد میں بھی دامانِ محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وابستہ رہیں۔ اور میلاد کے اسٹیج کا خیال کر کے سیاسی اظہارِ خیال میں بھی جھوٹ اور منافقت سے جس قدر بچ سکتے ہوں بچے رہیں، اِتحاد المسلمین کے ایسے اکثر جلسوں کی روحِ رواں علامہ رشید ترابی ہوا کرتے۔

غرض جیسے جیسے میں ان کی تقریریں سنتا گیا ویسے ویسے میرا شوق و وارفتگی بڑھتا گیا، یہاں تک کہ منبر سے پھر سوائے ان کے کسی اور کی آواز سننے پر دل مائل ہی نہ ہوا۔

یادِ وطن کی لو تیز تر ہو گئی ہے۔ حیدرآباد دکن جو اس وقت برصغیر ہند میں عزاداری کے اعتبار سے لکھنؤ کے متوازی دوسرا مقام تھا۔ میری نگاہوں میں تصویر بن

کے اجاگر ہوگیا ہے۔

میں نے جب ہوش سنبھالا تو منبر کے افق پر ترابی کے سورج کا طلوع تھا یہ وہ وقت ہے کہ جب منبر کا مزاجِ بیان، ناخدائے سخن حضرت انیس کی معراجِ شاعری سے آشنا ہونے کے بعد نثر کی طرف مائل ہوگیا تھا۔ اپنے دور کے خطیب اعظم مولانا سبط حسن صاحب قبلہ اپنی عبارت آرائی، خیال آفرینی اور صنعتِ لفظی سے پربہار تقریریں کا جادو جگا کر یادِ ماضی بن چکے تھے اور مولانا مرتضیٰ حسین صاحب قبلہ کی تفسیر و علم کلام کے زور پر معراج والی تقریریں بھی زمانہ گزشتہ کے دامن میں لپٹی جارہی تھی دہلی اور رامپور میں حضرت مولانا سید محمد صاحب قبلہ دہلوی کے طوطیِ سخن کی دھوم تھی۔ لقاء علی صاحب قبلہ حیدری کی معرکۃ الآرا تبلیغی تقاریر کا شہرہ تھا۔

پورے ہندوستان میں ایک ہی مکتبِ خطابت تھا، اور وہ لکھنو کا، جس کا اسلوب یہ تھا کہ پہلے تقریر کی ضبطِ تحریر میں صورت گری کرلی جائے، اور پھر اسے ازبر کرکے منبر سے خطاب کی صورت میں دُھرا دیا جائے۔

ایسے میں خطاب و بیان کی انجمن میں ایک نئی شمع روشن ہوئی، اور وہ شمع انجمن علامہ رشید ترابی تھے۔ اگرچہ انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کے علاوہ کچھ دن شیعہ کالج لکھنؤ میں بھی گزارے تھے۔ لیکن ذاکری میں انہوں نے خود اپنے ایک نئے مکتب کی بنیاد رکھی۔ خود اپنا ایک نیا نہج ایجاد کیا۔ اور اپنے بعد آنے والوں کے لئے تتبع کا ایک نیا چلن چھوڑ گئے۔

حیدرآباد دکن میں علامہ علی اللہ مقامہ بعض مجالس ہر سال پابندی سے پڑھا کرتے تھے ان میں سے بعض مجالس کے لئے انہوں نے خاص رنگ اور خاص انداز مقرر کردیا تھا۔ مثلاً ماہ صفر میں ہر سال پروفیسر مجتبیٰ حسن صاحب جن کو علامہ صاحب پیار سے مُنّے بھائی اور میں ان کو مجتبیٰ چچا کہا کرتا تھا۔ اپنے گھر واقع ترپ بازار میں

ایک مجلس کرواتے تھے۔ اس مجلس میں بڑی ہی خوش ذائقہ اور خوش رنگ کشمیری
تقسیم ہوا کرتی تھی۔ علامہ مرحوم یہ مجلس ایک ہی دن نماز کا وقفہ دے کر دو حصوں
پڑھا کرتے تھے۔ اس کے لئے جو عنوان ہوتا وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے اساتذہ کی
فرمائش پر مقرر ہوتا اور عموماً ان مسائل سے متعلق ہوتا جو اس دور میں سائنس
مذہب کی نسبت کے بارے میں پیدا ہو رہے تھے، چنانچہ پروفیسر مجتبیٰ احسن صاحب
ان کی ایک تقریر کا اقتباس تکوین کے نام سے شائع کیا تھا۔

منڈی میر عالم میں مرغ خانے کی گلی میں وہ راحت جنگ کے بیٹے کی منعقد کردہ
مجالس پڑھا کرتے تھے۔ ان مجالس کی تاریخوں کے ساتھ ان کا وقت بھی مخصوص تھا
یعنی عموماً وہ شب کی مجالس آٹھ بجے پڑھا کرتے تھے۔ لیکن یہ مجالس وہ ساڑھے
دس بجے رات کو شروع کرتے۔ ان مجالس کے لئے جو عنوان وہ ہر سال تلاش کرتے
وہ معاشرتی مسائل سے متعلق ہوتا۔

خوجہ اثنا عشری جماعت کی طرف سے منعقد کردہ ۱۷، ۱۸، ۱۹ صفر کی مجالس
وہ علاوہ سر طوق مبارک میں پڑھا کرتے تھے۔ حیدر آباد دکن میں الاوہ امام باڑہ
کو کہتے ہیں اور الاوہ سر طوق وہ امام باڑہ ہے جس میں ایک بہت بڑا تقریباً تین فٹ
چوڑا اور ۶ فٹ لمبا پیتل کا علم ہے اور اس علم میں اس طوق کا ٹکڑا ہے جو امام زین
العابدین علیہ السلام کو پہنایا گیا تھا۔ اور خاندانِ قطب شاہیہ کی حکمرانی کے زمانے
میں جب یہاں گولکنڈے کی سلطنت تھی تو سید محمد شوستری نے دمشق سے یہ ٹکڑا لاکر
محمد قلی قطب شاہ کو دیا تھا۔ اس کے سچے ہونے کی تصدیق کا فرمانِ اورنگ زیب
آج بھی اردو عجائب گھر حیدر آباد میں موجود ہے اور یہیں یعنی الاوہ سر طوق ہی میں
وہ پوری قوم کی جانب سے منعقد کی جانیوالی ۲۰ صفر یعنی چہلم کی آخری اور الوداعی
پرسے کی مجالس پڑھتے۔ یہ مجالس خالصتاً تفسیر و علم کلام کی مجلسیں ہوتیں۔ اس کے علاوہ

بی بی کے الادہ کی مجلس جو ہر سال لائق عابدی مرحوم کراتے تھے۔ اس مجلس کا عنوان اقبال کا کوئی نہ کوئی شعر رکھتے۔

متذکرہ بالا چند واقعات پر غور کیجئے تو آپ کو علامہ رشید ترابی کے تخلیقی ذہن اور انفرادی مزاج کا اندازہ ہوگا۔ علامہ رشید ترابی علی اللہ مقامہٗ کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اتنی گہری نظر اور اتنے قربت احساس سے ان کی زندگی کا مطالعہ کرنے کا سبب شاید یہ ہو کہ میں نے ان کو اپنے ایک آئیڈیل IDEAL کی حیثیت سے جانا ہے۔

وہ نہ ہر کسی کو اپنا دوست بناتے تھے اور نہ ہی ہر کسی سے بے تکلف ہوتے تھے اسی لئے جو لوگ ان کو دور سے دیکھتے وہ انہیں انتہائی مغرور انسان سمجھتے تھے لیکن جب وہ کسی کو اپنے سے قریب کر لیتے تو پھر اس کے لئے وہ انتہائی سادہ مزاج اور باغ و بہار شخصیت تھے۔ طبیعتاً وہ کانوں کے کچے واقع ہوئے تھے، خصوصاً اگر کوئی ان سے کہتا کہ فلاں شخص ان کی برائی کرتا ہے یا مخالفت کرتا ہے تو فوراً یقین کر لیتے تھے۔

بڑے خوش پوش انسان تھے ایسا ویسا کپڑا تو ان کی نظر میں جچتا ہی نہ تھا۔ کھانوں کے معاملے میں بھی ان کا مذاق بہت اعلیٰ تھا۔ اپنے گھر میں خود طرح طرح کے لوازمات پکواتے اور کسی دوست کے گھر جاتے تو بھی خصوصی خوش ذائقہ کھانوں کی فرمائش کرتے لیکن جب دستر خوان پر بیٹھتے تو ان کی اپنی غذا تو چھٹانک ڈیڑھ چھٹانک ہی ہوتی۔ کہیں مہمان ہوتے تو کھاتے کم اور تعریف زیادہ کرتے البتہ اپنے حلقے کے لوگوں کو مجبور کر کے کھلاتے، ان کو خود کھا کر اتنی خوشی نہیں ہوتی تھی جتنی دوسروں کو کھلا کر ہوتی تھی۔

وہ بہت ہی کھلے ہاتھ کے انسان تھے۔ پیسے کو انہوں نے ہمیشہ ہتھیلی کا میل سمجھا

بہت سے لوگوں کی وہ زندگی بھر خاموشی سے مدد کرتے رہے۔ انتہا یہ تھی کہ اگر اپنے پاس نہ ہوتا تو وہ قرض لے کر لوگوں کے لیے خرچ کر دیتے تھے۔ شاید اسی لئے وہ زندگی بھر مالی مشکلات میں مبتلا رہے۔ ایک زمانے میں جب "المنتظر" روزنامہ بند ہوا تو وہ بے انتہا مقروض ہو گئے۔ اور اس کی وجہ سے دو تین برس تنگدستی اور مالی پریشانی میں مبتلا رہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اے ٹی نقوی کراچی کے چیف کمشنر اور اسکندر مرزا گورنر جنرل ہوا کرتے تھے۔ ہر وہ شخص جس کو ان دونوں میں سے کسی سے بھی ذرا سی قربت تھی یا ان تک پہنچ سکتا تھا، ہر طرح سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ رکشوں کے پرمٹ، بسوں کے پرمٹ، امپورٹ لائسنس، زمینوں کے الاٹمنٹ غرض لوگ جو بھی مانگ سکتے تھے مانگ رہے تھے اور امیر ہو رہے تھے۔ علامہ مرحوم اگر چاہتے ایک اشارے پر ان کو ایسی کوئی چیز مل سکتی تھی کہ سارے قرضے جمع ہوتے اتر جاتے۔ انہی دنوں ایک مرتبہ میں نے ان کو بہت پریشان دیکھ کر آہستہ سے کہا کہ آپ کی یہ فکر مندی دیکھی نہیں جاتی۔ آپ اے۔ ٹی نقوی یا اسکندر مرزا سے کہہ کر کوئی پرمٹ لے لیں انہوں نے بڑے غصے میں مجھ سے کہا کہ "تم چاہتے ہو کہ میں ہاتھ پھیلا کر اپنی جرأتِ اظہار بیچ دوں" صاحبانِ دُوَل و دولت کے سامنے وہ کبھی نہیں جھکے۔ جب انہوں نے ذاکری کی ابتدا کی اور ان کی خطابت کا چرچا ہونے لگا تو نظام دکن میر عثمان علی خان نے خوش ہو کر ان کو صرفِ خاص سے منصب مقرر کر دی لیکن ایک سال بعد محرم کا پہلا عشرہ پڑھنے کے لئے خوجہ جماعت کی دعوت پر وہ بمبئی گئے تو نظام دکن نے یہ کہہ کر جواب طلبی کی کہ "تم میری بغیر اجازت کے بمبئی کیوں چلے گئے" علامہ علی اللہ مقامہ نے جواب دیا کہ ذکرِ حسینؑ میری عبادت ہے۔ اس عبادت کی بجا آوری اور تبلیغ دین کے فرض کی ادائیگی کے لیے مجھے کسی سلطان یا امیر کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے منصب واپس کر دی اور پھر زندگی بھر نہ کبھی نظام دکن کے

سامنے گئے اور نہ ہی ان کی کوئی مجلس پڑھی۔

اگرچہ ان کے مزاج میں تصنع تھا، لیکن بہرحال وہ بہت ہی خوددار اور پر وقار شخصیت تھے، تمکنت و وقار کا شعور ان میں اس قدر بیدار تھا کہ جب وہ منبر پر بیٹھے تو اوروں کی طرح منبر سے لٹک کر نہیں رہ گئے، بلکہ انہوں نے منبر کے جاہ و جلال کو ایسی جِلا بخشی اور اس کی توقیر و طنطنے کو وہ سربلندی دی کہ ان کے ہم عصروں یا اسلاف روش میں اس کی مثال شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔

ان کے مزاج میں امیرانہ شباہت تھی۔ ذہنی طور پر وہ ایک دانشور بھی تھے اور مدبر بھی فلسفی بھی تھے اور عالم بھی، مفسر بھی تھے اور مفکر بھی اور شاعر بھی۔ انہوں نے اپنی خطابت کا گلدستہ قدرت کے دستِ فیاض سے ملی ہوئی صلاحیتوں کے ان رنگا رنگ پھولوں کو سجایا تھا۔ پھر ان کی پاس فکری جمود نہیں تھا۔ اللہ نے ان کو بڑا ہی تخلیقی ذہن دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تقریر کا مسودہ لکھ کر کبھی تقریر نہیں کی۔ وہ عنوان مقرر کرتے تو مطالعہ سے اس کی تیاری کرتے اور پھر منبر پر ہی اس کو DISCUSS کرتے۔ پھر وہ بعض بڑی ہی باریک باتوں کا خیال رکھتے تھے۔ مثلاً وہ کس ماحول میں تقریر کر رہے ہیں۔ ان کے سامعین میں کثرت کس کے مذاق کے لوگوں کی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی ہائیڈ پارک کی تقریروں کا مزاج کچھ اور ہوتا اور کھارادر کا کچھ اور ایرانیاں کا اس سے مختلف۔

پھر وہ اس بات کا خیال رکھتے کہ وقت کے تازہ ترین مسائل یا BURNING TOPICS کیا ہیں۔ وہ تازہ ترین مسائل کو زیر بحث لاتے، اچھوتے عنوانات کو بحث کے لئے منتخب کرتے۔ اور انوکھے انداز سے ان کو خطابت کا پیراہن پہناتے۔ اپنے ذوق کے تعلق سے جو تازہ ترین کتاب علمی دنیا میں آتی۔ وہ سب سے پہلے ان کے ہاتھوں ہوتی۔

ان تمام باتوں کے باوجود منبر کی روایت کی بنیادی حیثیت سے انہوں نے کبھی انحراف نہیں کیا۔ اس بنیاد پر نئی عمارت ضرور تعمیر کی! اس روایت کے چمن میں نئے پھول کھلائے۔ تازہ تختہ ہائے گل سجائے لیکن اس کی اساسی حیثیت کو کبھی نہیں بدلا۔

خود ایک عظیم خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ وہ فنِ خطابت کے اس قدر باریکیوں میں مزاج داں تھے کہ اکثر اپنی مجلسوں میں گنباروں (لاؤڈ اسپیکرس) اور مائیکروفون کی سمت و جا کا تعین خود کرواتے تھے۔ اور پھر جب بولتے تھے تو اپنے صوتی اثرات سے بہت سے الفاظ کے معنی بدل دیتے تھے اور بہت سے الفاظ کو نئے معنی دے دیتے تھے۔ انہوں نے منبر کی تجربہ گاہ میں خطابت کے نئے نئے تجربات کئے اس فن کی تجرید کی تحلیل کی تجزیہ کیا۔ اور اس میں نئی راہوں کی تخلیق کی۔

ان کی شہرت اور ان کی منفرد مقبولیت بہت سے لوگوں کے لئے ان سے ذاتی عناد اور شخصی مخالفت کا باعث بنی، مخالفین نے ان پر گندے سے گندے کیچڑ پھینکا۔ ہتک آمیز پمفلٹ چھپوا کر تقسیم کئے، پر ہجوم نظمیں شائع کیں، لیکن خود انہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے کسی مخالف کے لئے نہ کوئی پمفلٹ چھپوایا، نہ نظم لکھوائی، اور نہ ہی منبر سے کسی لمحہ بھی واضح طور پر تو کیا۔ اشارتاً یا کنایتاً بھی اپنے کسی مخالف یا دشمن کے بارے میں کوئی لفظ کہا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ تمام تر مخالفتوں کے باوجود وہ آگے ہی بڑھتے گئے، ترقی ہی کرتے گئے، وہ شمع بن کر روشن ہوئے، مہتاب بن کے طلوع ہوئے، آفتاب بن کے چمکے اور شباب بن کے ٹوٹ گئے۔ ان کی زندگی میں خطابت کا طلوع ہی طلوع ہے کہیں زوال نہیں۔

نثر کے انیس

سید ہاشم رضا

جس دن علامہ رشید ترابی مجھے اور اپنے کروڑوں چاہنے والوں کو داغِ مفارقت دیئے گئے۔ اس دن میں کراچی سے بہت دور لاہور میں تھا۔ جیسے ہی مجھے ان کے انتقال کی خبر ملی تو بے ساختہ میرے منہ سے یہ جملہ نکلا۔

"ہائے اب ہم میں کوئی دبیر نہیں"

مجھے دبستانِ انیس" کے ایک جلسے میں شرکت کے لئے راولپنڈی جانا تھا۔ اس جلسے میں ذکر انیس کا تھا تو ذاکر شہدائے کربلا علامہ رشید ترابی کا ذکر کیسے نہ آتا چنانچہ میں نے علامہ رشید ترابی کو صرف ایک جامع فقرے میں یوں خراج عقیدت پیش کیا کہ۔

"علامہ رشید ترابی اس دور میں نثر کے انیس تھے"

میں نے انیس ہوں اور نہ دبیر۔ لیکن دور حاضر میں اگر میں نے انیس و دبیر کو مجسم دیکھا اور بولتا ہوا سنا ہے تو وہ انیس اور وہ دبیر علامہ رشید ترابی ہی تھے اور اگر علامہ رشید ترابی کے دوست اور ہم مشرب نواب بہادر یار جنگ کو اس موقعہ پر یاد کر لیا جائے تو مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ۔

نواب بہادر یار جنگ اور علامہ رشید ترابی دونوں سیاست کے انیس و دبیر دونوں میں تین چیزیں بڑی مشترک تھیں۔

[illegible] اسلام اور پاکستان"

دونوں اسلام کے مبلغ، دونوں اقبال کے حافظ، دونوں نظریہ پاکستان کے عاشق جانثار، بہادر یار جنگ پاکستان نہ دیکھ سکے۔ البتہ علامہ رشید ترابی اس اعتبار سے شادکام عاشق ہیں، کہ بالآخر انہیں ان کے محبوب یعنی پاکستان کی مٹی نے ہمیشہ کے لئے اپنے آغوش میں بھینچ لیا۔

کہتے ہیں کہ "ذکر حق میں نہ زبان کبھی تھکتی ہے اور نہ ذاکر کو کبھی تھکن محسوس ہوتی ہے" یہ قول بلا شبہ علامہ رشید ترابی پر صادق آتا ہے۔ ایک ایک دن میں تین تین مجلسیں پڑھتے تھے لیکن اس کے باوجود تر و تازہ اور مزید بولنے کے لئے پھر سے تازہ دم۔

بڑے دل والے تھے۔ دل سے بولتے تھے اسی لئے ان کی بات سننے والوں کے بھی دل میں اتر جاتی تھی۔ اور ان کی دلآویز باتیں سن کر سننے والا حیرانی سے سوچتا تھا کہ۔

> میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

دل والے بالآخر بیماری دل ہی سے فریش ہوتے ہیں علامہ بھی دل کے مرض بلکہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔

> میں عیادت کے لئے گیا اور ان سے عرض کیا
> "اب بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ دل
> پر پہلا حملہ قدرت کی طرف سے پہلی
> وارننگ ہوتا ہے کہ اب آگے احتیاط سے
> زندگی بسر کرو۔"

پھر میں نے انہیں یہ شعر سنایا۔

> بدن سا شہر نہیں دل سا بادشاہ نہیں
> دواس تخت سے بڑھ کر کوئی سپاہ نہیں

مگر دل والے کب کسی کی نصیحت سنتے ہیں ان کی بے احتیاطی کا ایک واقعہ سننے سے تعلق رکھتا ہے۔

میں گذشتہ سال چہلم کی مجلس میں ایک غلط فہمی کے باعث نہ جا سکا۔ غلط فہمی علالت کے باعث پیدا ہوئی تھی۔ علامہ صاحب جناح اسپتال کے شعبۂ امراض قلب کے ایک بستر پر دراز تھے میں نے سوچا، علامہ تو چہلم کی مجلس پڑھنے نہیں جاسکیں گے۔ لیکن دوسرے دن مجھے بہت سے دوستوں نے بتایا کہ علامہ رشید ترابی نے مجلس پڑھی اور خوب پڑھی۔

میں حیران کہ کہاں جناح اسپتال کا بستر اور کہاں مجلس کا منبر۔ مجھے یقین نہ آیا تو میں انہی سے تصدیق کرنے سیدھا جناح اسپتال کے کارڈیو ویسکولر انسٹی ٹیوٹ پہنچا۔ علامہ بستر پر لیٹے تھے۔ میں نے مجلس پڑھنے کی بابت پوچھا تو بولے۔

"ہاں میں مجلس پڑھنے گیا تھا۔ ہر چند کہ میرا ارادہ نہ تھا لیکن موضوع تھا "حج قیدی" امام عالی مقام بھی تو اسیر تھے۔ آل رسولؐ بھی اسیر اور اب امت رسولؐ کی اسیری کا ذکر، دل نہ مانا۔ چلا گیا۔"

میں نے پوچھا۔

"مگر آپ اسپتال سے نکلے کیسے؟"

مسکراتے ہوئے بولے:

"میں نے دیکھا کہ سامنے میدان صاف ہے۔

ڈاکٹر کوئی نہیں تھا نرسیں مریضوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھے میں چپکے سے لفٹ تک پہنچ گیا۔ لفٹ مین نے حیران ہو کر پوچھا

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔

نیچے ۔ ہمیں بھی نیچے لے چلو"
لفٹ میں نے سوچا کہ شاید نیچے ٹہلنے جا رہا ہوں ۔ اس نے نیچے پہنچا دیا باہر میرا ڈرائیور مجھے دیکھ کر حیران ۔ اس نے پوچھا تو میں نے بتادیا کہ مجلس پڑھنے جا رہا ہوں۔
ڈرائیور نے کہا " مگر آپ کے جسم پر نہ شیروانی اور نہ سر پر ٹوپی ۔ مجلس کیسے پڑھنے جائیں گے آپ ۔ ؟"
تو میں نے ڈرائیور سے کہا۔
" تو جاؤ پھر اوپر سے میری شیروانی اور ٹوپی لے آؤ مگر احتیاط سے کہ کسی کو پتہ نہ چلے ۔"
ڈرائیور ٹوپی اور شیروانی لے آیا ۔ ہم گئے اور مجلس پڑھ آئے۔
آخر کیا کرتا۔

لا پکارتی تھی اسیری مجھے ندامت تھی ۔
ے جب آنکھ بند کیجئے عابد کے دھیان میں
آواز تازیانوں کی آتی ہے کان میں

میں نے عرض کیا۔
انیس کا ایک شعر اس کے نام کے بجائے آپ کے اسم گرامی سے پڑھتا ہوں تاکہ آپ اس شعر ہی کے پیش نظر اپنی صحت کے بارے میں محتاط ہو جائیں کہ ۔

ے رشید دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

شعر سن کر بس مسکرا کر رہ گئے۔
مسلمان کی حیثیت سے یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ علامہ رشید ترابی کی موت نا وقت ہوئی ۔ پچھلے دنوں یہاں لیاقت علی خان مرحوم کے لئے ایک جلسہ ہو رہا تھا تو کسی مقرر نے کہا

لیاقت علی خان کی موت ناوقت ہوئی،" میں نے تصیح پیش کی۔
ناوقت نا کہا جائے۔ بلکہ ناگہاں کہا جائے۔ تو زیادہ بہتر ہوگا موت برحق ہے۔
فوق البشر رسول اکرمؐ ۶۳ برس کی عمر کے تھے تو وصال پا گئے۔ یعنی ان کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ لہذا موت کا شکوہ کیا جو برحق ہے۔ لازم ہے۔ ہاں البتہ موت کا غم اور ماتم تو فطری ہے۔ اس لئے علامہ ترابی کی موت کا شکوہ کیا۔ ان کی موت کا الم یقیناً بے پایاں ہے۔

علامہ رشید ترابی کا حافظہ واقعی خداداد تھا آپ کتابیں پڑھ کر علم کو بڑھا سکتے ہیں لیکن حافظہ کیسے بڑھا سکتے ہیں۔ حافظہ تو یقیناً خدا کی دین ہے۔ ہر موضوع کے لئے ان کا حافظہ مددگار رہتا۔

ایک بار میرے بھائی کاظم رضا مرحوم کی مجلس میں پوچھا۔

"کس موضوع پر بولوں"

میں نے عرض کیا۔

"ادب"

انہوں نے ادب کے موضوع پر ادب کا دریا بہانا شروع کر دیا۔ کلام پاک میں شاعروں کے بارے میں ایک آیت ہے کہ۔

"شاعر مجنوں ہیں ان کے قریب نہ جاؤ" علامہ نے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

"شاعر مجنوں ہیں ان کے قریب نہ جاؤ
سوائے ان (شاعروں) کے جو ظلم کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔

علامہ ترابی بھی ظلم کے خلاف سراپا احتجاج تھے۔ وہ آزادی فکر اور آزادی اظہار کے سب سے بڑے علمبردار تھے انہوں نے اس معاملے میں ایک سخت گیر آمرانہ حکومت

کی بھی پرواہ نہیں کی۔

۱۹۵۸ء میں جب پہلی بار مارشل لاء کی حکومت پاکستان پر مسلط ہوئی تو اس
کے سیکرٹری اطلاعات نے حکم جاری کیا کہ۔

"جب تک علامہ رشید ترابی کی تقریر کا مسودہ پہلے ریڈیو پاکستان کے حکام
منظوری حاصل نہ کرے مجلس شام غریباں ریڈیو پاکستان سے نشر نہ کی جائے"

علامہ رشید ترابی نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ۔

"میں لکھ کر تقریر نہیں کرتا۔ اور حاضرین کو دیکھنے کے بعد میں تقریر کے مو
کا انتخاب سر منبر کرتا ہوں۔ اس لئے پہلے سے کیا بتلا سکتا ہوں کہ میں کیا تقریر کروں گا
چنانچہ دو سال ۱۹۵۸ء اور ۱۹۵۹ء ریڈیو پاکستان سے شام غریباں نشر نہ ہو سکی
حق کی آواز کسی ریڈیو کی محتاج نہیں ہوتی البتہ ریڈیو حق کی آواز کا محتاج ہوتا ہے ا
محکمۂ اطلاعات اور ریڈیو پاکستان کو ہار ماننی پڑی اور ۱۹۶۰ء سے علامہ رشید ترا
مجلس ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے ہر سال سنی اور دیکھی جاتی رہی۔

مگر اب ۱۹۷۳ء سے شامِ غریباں علامہ رشید ترابی کی آواز کو ترستی رہے گی
ہر چند کہ علامہ رشید ترابی ہمیں یقین دلاتے رہیں گے کہ۔

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو
در سینہ ہائے مردم عارف مزار ما

یعنی۔ میں بعد مرگ بھی بزم وفا میں زندہ ہوں
تلاش کر میری محفل مرا مزار نہ پوچھ

میری ڈائری کا ایک ورق ملاحظہ فرمایئے!

۱۴ر جون کو علامہ رشید ترابی پر دل کا شدید دورہ پڑا۔ ۱۶ر جون کو ان کا بلڈ
پریشر نقطۂ صفر تک پہنچ گیا۔ میں نے جب کارڈیو ویسکولر انسٹیٹیوٹ میں ان کی

پرسی کی تو انہوں نے فرمائش کی کہ ان کی طرف سے ایک مناجات لکھوں۔ میں نے دوسرے دن ان کی خدمت میں یہ اشعار پیش کر دیے۔ مجھے ان اشعار کا بڑا صلہ ملا یعنی اُن کی پُرخلوص دعائیں ملیں۔ وہ اشعار یہ ہیں۔

حکمت میں اپنی شانِ کریمی دکھا تو دے۔
تو کارساز ہے، مری بگڑی بنا تو دے۔
تو نے دیا ہے خلق کو مال و منال و زر۔
اے ربِّ ذوالجلال مجھے آسرا تو دے۔
دلداریوں سے تیرے زمانہ ہے فیضیاب۔
میرے دلِ حزیں کی حرارت بڑھا تو دے۔
طوفانِ ابر و باد نے گھیرا ہے چار سو۔
کشتی میری، بچا کے کنارے لگا تو دے۔
مخلوق کہہ رہی ہے کہ خالق کوئی نہیں۔
اک اور آب و گل کا تماشہ بنا تو دے۔
اک شور ہے کہ بعد فنا زندگی نہیں۔
ان غافلوں کو حشر کا منظر دکھا تو دے۔
دکھلا دے منکروں کو جھلک روزِ حشر کی۔
بلا کے لئے حجاب کے پردے گرا تو دے۔
گو مستحق نہیں ہیں دیے جا رہا ہے تو۔
جو تجھ سے پھر گئے ہیں انہیں کچھ سزا تو دے
جنت کو لوگ کہتے ہیں خوش فہمی خیال
کوثر اک موج جہاں میں بہا تو دے

کہسار میں بہار بھی ہے آبشار بھی۔
دو چار ریگزار میں چشمے بہا تو دے

یوسف کا حسن قصہ پارینہ ہو گیا
دنیا تڑپ اٹھے کوئی ایسا بنا تو دے

عقلِ رسا ہر ایک کو حاصل ہو جب تلک
محکم یقین گر نہیں خوئے وفا تو دے

صدیوں سے سب کو عیسیٰ دوراں کی ہے تلاش
ربّ مسیح تھوڑے سے مردے جلا تو دے

صدقہ ترے رسولؐ کا آلِ رسولؐ کا۔
برسوں کی ذاکری کا مجھے کچھ صلا تو دے

دنیا کو آستانۂ وحدت پہ پھیر دوں
صرف اک شہید حق کا مجھے خونبہا تو دے

اپنے فن کا ماہر

صدر آزاد کشمیر

ترابی صاحب کا نام تو دیر سے پاکستان میں سنا جا رہا تھا اور میرے حلقۂ واقفیت میں جو اہل تشیع حضرات ہیں وہ جن شیعہ اکابر علماء کا ذکر کرتے تھے ان میں علامہ ترابی مرحوم کا ذکر نمایاں ہوتا تھا۔ جس سے ظاہر ہے کہ مجھے بھی ان سے ملنے اور انہیں سننے کا اشتیاق تھا۔ اتفاق سے ان سے جو ایک دو ملاقاتیں ہوئیں ان میں ایک ملاقات ایک جلسے کے دوران ہوئی جس میں علامہ کی تقریر سننے کا پہلی اور آخری بار اتفاق ہوا۔ ان کی تقریر کی جو خوبیاں میں نے ان کے سامعین کی زبانی سنی تھیں وہ تقریر ان سے کچھ بہتر ہی تھی۔ علامہ مرحوم کو اپنے فن میں جو مہارت تھی وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوگی، محض فن تقریر ہی نہیں بلکہ ان کی علمی و فکری سطح اور زبان پر قدرت بھی ہمارے دوسرے معروف مقرر علماء کی نسبت سے بلند تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کو جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ حضرات کو ان کی صحیح جانشینی کا اہل بنائے

محمد عبدالقیوم

(سردار عبدالقیوم خان)

صدر حکومت آزاد کشمیر

وُہ جس کی موت پہ روتے ہیں اُسکے دشمن بھی

ضیاء الحسن مُوسوی

علامہ رشید ترابی کی موت ایک ایسے باب کا خاتمہ ہے جس کا آغاز وہ خود تھے، اور انجام بھی وہی، وہ متعدد صفات و امتیازات و خصوصیات کے علاوہ علوم کی متعدد شاخوں اور کئی زبانوں سے مناسبت رکھتے تھے۔ اسی لئے انہیں علامہ کہا گیا ہے۔ دنیا میں بالعموم بڑے لوگ کسی ایک خصوصیت کے لئے شہرت پاتے ہیں اور ان کی بہت سی اہم خصوصیات پردۂ اخفا میں رہ جاتی ہیں۔ مگر علامہ رشید ترابی کی "وجہ شہرت" میں ان کی اکثر خصوصیات نمایاں ہیں، یعنی خطابت، وہ علوم و افکار جدیدہ سے براہ راست واقف تھے۔ وہ مذہب کے ابدی حقائق کی گہری بصیرت کے مالک تھے وہ علوم اسلامیہ کی بلندیوں سے مانوس تھے۔ ہزاروں کتابیں ان کی نظر میں تھیں۔ ان کا حافظہ اتنا غیر معمولی تھا کہ قرآنِ مجید، نہج البلاغت، کلام انیس اور کلام اقبال کے مفہوم شناس "حافظ" کہے جا سکتے ہیں۔ اور یہ سب خزانے انہوں نے اپنی خطابت میں سمو لئے اور اس خطابت کی دولت کو اتنی سخاوت سے لٹایا کہ حاتم کی سخاوت بھی ماند پڑ گئی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ بقول بابُ المدینۃ العلم دولت خرچ کرنے سے کم ہوتی ہے اور علم تقسیم کرنے سے زیادہ ہوتا ہے اور یہی ان کا عمل بھی تھا۔

انہوں نے اپنی دانشوری اور آگاہی کو بارش کی طرح عام کیا اور اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ دولتِ دنیا کو انہوں نے جمع کرنے کے قابل نہ سمجھا مگر وہ بارش کی طرح ان کے قدموں پر برستی رہی۔

علامہ رشید ترابی کی خطابت فقط زور روانی اور ولولہ انگیزی کی خطابت نہ تھی وہ علم آموز اور فکر آمیز خطابت تھی اور یہ ان کا کمال تھا کہ انہوں نے لاکھوں سامعین کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچا۔ ان کو اپنی فکر اور مقصد کی طرف بلند ہونے کی تربیت دی اور پھر ایسے مضامین اور علمی نکات ان کو سمجھائے جو فقط درسگاہوں کی اعلیٰ تعلیم کے نصاب کی سطح کے ہوتے ہیں اور پھر سامعین کو اس پُرمغز گفتگو کا اتنا دلدادہ شیدا بنا دیا کہ وہ دیوانہ وار اس کی تلاش میں گھوما کریں۔

عام خطیب سامعین کی سطح پر آ کر اپنا مقصد واضح کرتے ہیں مگر علامہ رشید ترابی نے ہمیشہ سامعین کو تربیتِ علمی سے فکر و فہم کی سطح بلند کرنے کی دعوت دی اور یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے برصغیر کے تقریباً پچاس لاکھ مسلمانوں کو اپنی مجالس کے ذریعے علم و عرفان سے مالا مال کر دیا۔ ان کا مذاق اتنا بلند کر دیا کہ وہ سطحی تقاریر سے اب کبھی مطمئن نہ ہوں گے۔

علامہ رشید ترابی نے عہد جدید کے علوم اور انسانوں کو مذہب کی کڑی سے مربوط رکھا۔ انہوں نے مذہب کو زبردستی علوم جدیدہ پر منطبق کرنے کے بجائے عہد جدید کے گرویدہ انسانوں کو یہ سمجھایا کہ علم و فکر دریاؤں کے پانی کی طرح آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ اب ان کو مسخر کر کے فلاح انسانیت کے لیے کس طرح استعمال کیا جائے یہ بات ہمیں مذہب حق سے معلوم ہوتی ہے۔ اور اگر ہم مذہب سے یہ بات نہ سیکھیں تو یہ دریا اپنی طغیانی سے ہمارے عمران کو تباہ بھی کر سکتے ہیں۔

علامہ رشید ترابی نے عہد جدید کے تمام ذرائع ابلاغ و مواصلات مثلاً

لاؤڈ اسپیکر، ٹیپ ریکارڈر، ٹیلیفون، ریڈیو اور ٹیلیویژن وغیرہ کا سوچا سمجھا استعمال کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک عالمگیر تحریک تعلیم و تدریس اطفال و نوجوانان و بالغان کے ایک عظیم منصوبے پر عمل کر رہے تھے اور اس کے لئے انہوں نے ایک عظیم قربانی یہ دی کہ وہ سیاست کے اسٹیج سے جہاں وہ اپنی ایک ممتاز جگہ بنا چکے تھے ہٹ آئے۔ اس کو بھول گئے اور اپنی ساری توجہات انہوں نے منبر و مجلس تک محدود کر لیں۔ وہ استقلالِ پاکستان سے قبل اسٹیٹس مسلم لیگ اور اتحاد المسلمین کے صف اوّل کے قائدین میں سے تھے اور پاکستان میں ان کے لئے سیاست و حکومت و اقتدار کے کئی راستے کھلے ہوئے تھے مگر انہوں نے یہ دیکھا کہ ان کا مشن اور مقصد زندگی ان راستوں پر چلنے سے پورا نہیں ہوگا۔ حکومتیں بدلتی رہتی ہیں سیاسی جماعتوں کو مقبولیت اور عدم مقبولیت کی وادیوں سے گزرنا پڑتا ہے اور پھر پاکستان میں اسوقت ان کو کوئی ایسی جماعت نظر نہ آئی جس کا کوئی پروگرام ہو اور اس کی تکمیل کے لئے وہ جمہوری ذرائع سے کوشاں ہو یا کوئی مشقت اٹھانا چاہتی ہو۔ زیادہ تر لوگوں کے پیش نظر حکومت مقصد تھی خدمت کا وسیلہ نہ تھی۔ ان حالات میں جبکہ مختلف جہات سے عہدے پیش ہو رہے تھے اور ایوانوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے علامہ رشید ترابی نے اپنے سیاسی ماضی کو یوں فراموش کر دیا جیسے کبھی اس سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو اور مقصد تبلیغ اسلام اور نشر حق و صداقت میں ہمہ وقت مصروف رہے اس کے باوجود انہوں نے ایک اچھا روزنامہ "المنتظر" نکالا اور اپنی سرپرستی میں اسکو پروان چڑھانے کی کوشش کی مگر ایک وقت ایسا آیا کہ اس روزنامے نے ان کو چیلنج کیا کہ اگر وہ خود آگے بڑھ کے اس کی راست ذمہ داریاں نہ قبول کریں تو وہ بند ہو جائے گا۔ یہ بہت سخت مرحلہ تھا اگر وہ صحافت سے راست وابستگی اختیار کر لیتے تو پھر مطالعہ علم و خطابت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے بہت کم وقت ملتا۔ یہاں بھی

انہوں نے ثابت قدمی کا ثبوت دیا اور روزنامہ المنتظر بند کرنا گوارہ کر لیا مگر جو فرض اخبار نویسی کی حیثیت کا انہوں نے اپنے ذمہ لیا تھا اس کو ترک نہ کیا۔

میں علامہ رشید ترابی کو سنہ ۱۹۴۱ء سے جانتا ہوں۔ جب میں لکھنؤ سے حیدرآباد دکن منتقل ہوا تھا اور حضور نظام کے حکم سے محکمۂ امور مذہبی میں ملازم ہوا تھا۔ میں نے حیدرآباد کے علاوہ بمبئی میں بھی ان کی بہت سی مجالس سنیں۔ ان کی سیاسی اور اجتماعی مصروفیات کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ نواب بہادر یار جنگ اور علامہ رشید ترابی کے ساتھ مذہبی اجتماعات میں خدمت کا بھی موقع ملا اور ان حضرات کی جادو بیانی سے لطف اندوز ہونے کا بھی۔

سنہ ۱۹۶۵ء میں میری ہی گزارش پر علامہ رشید ترابی آگرہ اور لکھنؤ تقاریر کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ کراچی میں مجھے ان کے روزنامہ المنتظر کے نیوز ایڈیٹر ہونے کا بھی شرف حاصل رہا ہے اور جمہوریت ترکی کی نمائندگی کے ساتھ کئی ماہ میں نے ان کے حکم سے المنتظر کے لئے ادبی ادارت بھی کی۔ میرا اُن سے دوست کا بہت قریبی ربط بھی رہا اور تعلقات میں خاندانی روابط بھی شامل رہے۔ مجھے ان سے بعض معاملات میں مخالفت اور شدید مخالفت کا بھی تجربہ ہے اور سرد مہری کے تعلقات کا بھی۔ اس لحاظ سے مجھے تھوڑا بہت حق ہے کہ میں ان پر قلم اٹھاؤں اور اگر خدا نے چاہا تو میں اس حق کو پورا کروں گا۔ ان مختصر سی سطور میں جب کہ ابھی ان کی موت کا صدمہ تازہ ہے اور میرے اپنے فرائض منصبی شب و روز کی مصروفیت کے طالب ہیں اپنے افکار اور مشاہدات کو جمع کرنا مشکل ہے۔

علامہ رشید ترابی کی موت ایسا سانحہ ہے جس پر دوست تو کجا اُن کے دشمن بھی آبدیدہ ہیں وہ اچھے دوست ہی نہ تھے ایک شریف دشمن بھی تھے۔ اور میرا خیال ہے کہ انسان کو پہچاننے کے لئے دوستوں سے زیادہ اس کا دشمنوں سے سلوک

دیکھنا چاہیئے۔ جب کوئی شہرت کے آسمان پر ستارے سے آفتاب بنتا ہے تو اس سے حسد اور دشمنی کرنے والے بھی ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو طرز عمل کی شکایت بھی ہوتی ہے۔ اسلام نے ہمیں دوستی اور دشمنی دونوں کے آداب سکھائے ہیں. قرآن مجید نے دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف کا حکم دیا ہے اور یہی وہ مسلک ہے جس کے علامہ رشید ترابی مبلغ تھے۔ اللہ نے ان کی عظیم مساعی کو بار آور کیا ان کو لائق اور سعادتمند اولادیں عطا کیں جن میں جناب ہادی ترابی صاحب مولانا عقیل ترابی مدظلہ اور عزیزم نصیر ترابی صاحب سے مجھے بڑا انس ہے۔ علامہ رشید ترابی مرحوم کے بھائی مرحوم مظہر علی خاں صاحب سے بھی میں نے استفادہ کیا جو انگریزی کے عظیم استاد اور اردو ادب کے رسیا تھے۔ کیا یہ تعلقات ذاتی حرمان و نقصان کے لئے کافی نہیں اس پر مزید علمی اور مذہبی نقصان ہے۔ ایک دور تھا جس کے علامہ رشید ترابی بانی تھے اور وہ اس کو خود ہی اپنے ساتھ ختم کر گئے۔ ایک بستی اور بہت بڑی بستی تھی جو ان کے بعد ویرانہ اور صحرا میں بدل گئی۔ آج محفل خراسان، حسینیہ ایرانیان نشتر پارک اور خالقدینا ہال ہر ایسی عمارت جہاں سے ان کی صدا بلند ہوتی تھی۔ آنسوؤں کی محرک بن گئی ہے۔

ان کی صدہا مجالس اور تقاریر ہزاروں گھروں میں محفوظ ہیں۔ یہ بھی ان کی ایک خدمت ہے مگر وہ کہاں ہیں وہ علامہ رشید ترابی جو راتوں کو دیر تک علمی گفتگو کرتے تھے۔ ادبی لطائف پر ہنستے تھے۔ اصرار کر کے کھلاتے پلاتے اور خوش ہوتے تھے وہ جو اچانک گھر پر آجائے اور کوئی تحفہ عطا کر کے چلے۔ جو عالم بھی تھے ادیب بھی شاعر بھی تھے خطیب بھی سیاستداں بھی اور سیاست سے دور بھی جو دوست تھے، تو دوستی نباہنا جانتے تھے اور مخالفوں سے مخالفت بھی دوستی میں شامل سمجھتے تھے۔

جادوگر ایک پر اپنا عمل آزماتا ہے۔ علامہ رشید ترابی کے حلقۂ سحر البیان میں افراد

بھی تھے اور لاکھوں کے مجمے بھی وہ سننے والوں کے سامنے نہ ہوتے مگر معلوم ہوتا کہ مجمع کو گیند کی طرح جس طرف چاہیں پھینک دیں چاہیں تو اپنی مٹھی میں رکھیں، وہ شخص نہ رہا وہ جادو ختم ہو گیا۔ مگر وہ مقصد باقی ہے جس کے لئے انہوں نے اپنی حیات صرف کر دی۔

اُن کے سلام کے ایک مقطع پر یہ گفتگو ختم ہو تو اچھا ہے۔

اے تراؔبی مفت ہے آبِ حیات
موت کے ہاتھوں سے کوئی جام لے

اس سلام کا مطلع تھا۔

ہے یہی وقت ان کا دامن تھام لے۔ گرنیوالے اب علیؑ کا نام لے

یہ کون حضرتِ آتش کا ہمزباں نکلا

علامہ رشید ترابی غزل کے آئینے میں!

سحر انصاری

علامہ رشید ترابی خطیب شعلہ نوا، ادیب بے مثل اور عالم باحکمت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شاعر شیریں مقال بھی تھے، بلکہ ان کی شاعری کے مطالعے اور ان کے مزاج کی مجموعی کیفیت کے تجزیے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایک شاعر باشعور ہی تھے لیکن ان کی دیگر حیثیتیں اس قدر معروف و ممتاز ہو گئیں کہ ان کی شاعری نظروں سے اوجھل ہو گئی اور خود علامہ نے بھی خود شاعری کے ادّعا اور اشاعت کو چنداں ضروری نہ دیکھا علامہ کی اس روش کو سمجھنے کے لئے ان کے ذہنی پس منظر کو سمجھنا بھی ضروری ہے جس کے بنیادی چراغ بہادر یار جنگ اور علامہ اقبال تھے۔ علامہ اقبال نے بھی اس دور میں یہی نکتہ ملحوظ خاطر رکھا کہ۔

جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے۔

علامہ ترابی بھی شاید یہی سمجھتے تھے کہ وطن کی آزادی اور بہتر انسانی معاشرے کی تعمیر کا کام زیادہ مقدم ہے اور اس میں شاید وہ ادیب و شاعر کے بجائے ایک خطیب و مقرر کی حیثیت سے زیادہ بہتر منصب ادا کر سکتے تھے۔ سو اسی منصب کو انہوں نے اپنی شخصیت کا تعارف بنالیا۔

طالب علمی کے زمانے میں علامہ ترابی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کی تعلیمی فضا پر چھائے ہوئے تھے لیکن اس وقت بھی انہیں تقریر و خطابت سے نسبتاً زیادہ لگاؤ تھا اور اگر نظمیں یا غزلیں کہتے بھی تھے تو دوسرے ہم عصروں کے نام سے مشتہر کر دیتے تھے۔

علامہ ترابی نے اپنے مزاج کے شاعرانہ عنصر کی ہمیشہ حفاظت کی اور خطابت کے نازک سے نازک مقامات پر بھی ان کی سخن فہمی اپنا جادو جگاتی رہی۔ فن شعر گوئی کے سارے آداب انہوں نے ابتداء ہی سے پیش نظر رکھے۔ وہ جس عہد کے نوجوان تھے اس میں اچھے شاعر کے لئے کسی مستند استاد کا شاگرد اور ایک شاعرانہ تخلص کا حامل ہونا ضروری تھا۔

اس وقت حیدرآباد میں علم و فضل، تجربے اور استناد کے لحاظ سے حضرت نظم طباطبائی سے بہتر کوئی اور استاد شاید میسر آ سکتا تھا۔ نظم طباطبائی بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کی صحبت میں بیٹھنا گویا غالب اور میر انیس کی صحبتوں سے فیض حاصل کرنے کے مترادف تھا۔ علامہ رشید ترابی رضا حسین سے رشید ہو گئے۔ اور نظم طباطبائی کو وسیلۂ فیضان سخن بنا لیا۔ کچھ عرصے بعد نظم صاحب ہی کے ایماء سے وہ اس وقت کے ایک اور جید اہل فن ضامن کنتوری سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔

اس وقت کا حیدرآباد جہاں سیاسی طور پر ایک نئے شعور کا ہمرکاب تھا وہیں شعر و ادب کی محفلوں کا بھی ایک خاص رنگ دکھا رہا تھا۔ اس وقت جامعہ عثمانیہ کے قیام کے طفیل سارے برصغیر کے مشاہیر علم و فن وہاں یکجا ہو رہے تھے اساتذۂ قدیم سے قطع نظر، فانی بدایونی، جوش، ملیح آبادی اور یگانہ چنگیزی نے وہاں کی ادبی فضا کو ایک نیا رخ اور ایک نیا مزاج دیا جس نے اسے مقامی حدود سے نکال کر بند صبا چل کے اس پار کی فضاؤں سے ہمرشتہ کر دیا۔

علامہ ترابی نے غزلیں، نظمیں، قصیدے، رباعیات اور مثنویات کا ایک قابل قدر سرمایہ چھوڑا ہے۔ ان کے قصائد نظمیں اور مثنویات کسی نہ کسی علمی اور فلسفیانہ موضوع کی منظوم صورت ہوتی ہیں۔ مثلاً امام مہدیؑ کی شان میں انہوں نے ایک معرکے قصیدہ لکھا ہے جس میں غیب و شہود اور زمان و مکان کے اس جدید تصور فلسفیانہ اظہار کیا ہے جو آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت کے بعد فکر انسانی کا جزو بنا ہے۔

اس صحبت میں مجھے علامہ ترابی کی غزلیات کے باب میں کچھ عرض کرنا ہے علامہ مرحوم کی بیاض میں مجھے ان کی منتخب کی ہوئی ۳۰۸ غزلیں ملیں جنہیں میرے عزیز دوست اور علامہ کے فرزند ارجمند نصیر ترابی جو خود بھی ایک خوش فکر شاعر ہیں طباعت و اشاعت کے مرحلے میں لا رہے ہیں۔ بیاض کے ابتدائی صفحے پر علامہ ترابی کے یہ الفاظ درج ہیں: "منظوم افکار کا مجموعہ" ترابی صاحب کی شاعری کا اس سے اچھا کوئی خاکہ ممکن ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ افکار جن کا وہ اپنے خیالات اور تقاریر میں اظہار کرتے ہیں۔ بسا اوقات اشعار کے قالب میں بھی بڑی خوبی سے ڈھل جاتے ہیں۔

یگانہ سے علامہ ترابی کا بہت قریبی ربط رہا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دونوں کے یہاں شاعرانہ لہجوں کی مماثلت بھی محسوس ہوتی ہے۔ علامہ ترابی غزل کے لہجے کی جس روایت سے قریب نظر آتے ہیں اسے دیکھ کر یگانہ ہی کا یہ مصرعہ دہرانا پڑتا ہے۔

یہ کون حضرتِ آتش کا ہم زباں نکلا

علامہ رشید ترابی کی غزل میں ان کے علم و شعور کا عکس بڑے نفیس خط و خال کے ساتھ نظر آتا ہے۔ عربی، فارسی فلسفہ اور جدید و قدیم علوم پر دسترس کے باوجود

ان کا کلام بوجھل نہیں ہے۔ بلکہ نہایت شستہ اور متوازن انداز بیان کا حامل ہے۔ یہاں تک کہ بعض سنگلاخ زمینوں میں بھی انہوں نے اپنے اشعار کی دل نشینی اور لطافت برقرار رکھی ہے

علامہ رشید ترابی کی غزل میں ایک ایسے انسان کے قلب و نظر اور جذبہ و شعور کا پرتو ملتا ہے۔ جسے مبادیاتِ حیات کے باب میں سوچنا، تجزیہ کرنا اور کسی نتیجے پر پہنچ کر دوسروں تک اس شعور کو منتقل کرنا خوب آتا ہے ان کی غزل کے استعارے اور علامتیں وہی ہیں جو اردو غزل کے ادبی سرمائے کی جان ہیں۔ لیکن ان کے توسط سے انہوں نے غم، خوشی، وقت، عقل، جذبہ، نفرت، ثبات، فنا، زیست اور مرگ جیسے موضوعات پر انتہائی منفرد انداز میں شعر کہے ہیں۔ اس مختصر سی صحبت میں پورے کلام کے محاسن پر روشنی ڈالنا ممکن نہیں۔

علامہ رشید ترابی کا مسلک روایتی مذہبی شخصیتوں سے بہت مختلف تھا۔ وہ روشن خیال روایت میں درایت کے قائل اور کشف کے بجائے علم اور جذب کے بجائے عقل کے داعی تھے۔ وہ علم کو پیمانۂ عقل انسانی اور عقل کو پیمانۂ علم انسانی سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنی مجالس میں بھی اپنے اسی مسلک کو برقرار رکھا اور شعر گوئی میں بھی جس طرح خطبات میں میرؔ، غالبؔ، انیسؔ اور اقبالؔ کے کلام کو وہ معانی کی نئی جہات سے آشنا کرتے تھے۔ اسی طرح کربلا اور اسوۂ امام حسینؑ کے بعض لطیف گوشوں کو نہایت خوبی سے شاعری کے پیرائے میں بھی مستور کر دیتے تھے۔ ان کی ایک غزل کا یہ شعر دیکھئے اور حضرت حسینؑ کے سفرِ کربلا سے اس کا رشتہ ڈھونڈتے ہوئے اس کا تصور کیجئے جو اس شعر کی غایت ہے

رشید شمع کے بجھتے ہی یہ بھی ممکن ہے

بہت قریب جو آیا تھا اجنبی ہو جاتے

اندھیرے اور چراغ کی نسبت سے ایک اور شعر علامہ نے یوں کہا ہے

کچھ اندھیرا ہٹے تو حال کھلے

ہے یہی تو چراغ کا مصرف

سہل ممتنع میں معنی آفرینی علامہ ترابی کا حقیقی کمال ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں مطالعے اور تجربے میں کس حد تک توازن ملتا ہے چھوٹی بحروں کی غزلوں میں جب الفاظ آہستہ روی سے مصرعوں میں سفر کرتے نظر آتے ہیں تو کیف تاثر میں معتدبہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک غزل کے چند شعر دیکھئے

ہر آن خوشی کی جستجو میں	غم سے غم کا مقابلہ ہے
اے رسم حیات تھک گیا ہوں	اب کتنے نفس کا فاصلہ ہے
کیا کوئی بچائے اپنا دامن	بجلی کی پسند فیصلہ ہے

علامہ رشید ترابی اپنی آخری علالت سے قبل تک شعر کہتے رہے۔ ان کی آخری غزل وسط ۱۹۷۳ء کی ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔ ؎

کیا دور ستم آیا زمانہ وہ ہی بدل کر

سمجھے تھے کہ آرام سے ہیں شہر بدل کر

افکار سے ہشیار کہ یہ وقت کی موجیں

پیغام بدل دیتی ہیں خود لہر بدل کر

کس کس سے رہیں دور تو کس قرب کو ڈھونڈیں

دیتے ہیں محبت میں یہاں زہر بدل کر

مرحوم [illegible] ترابی جس [illegible] تھے اس طرح اپنا کلام پڑھتے

میں بھی ایک خاص انداز رکھتے تھے۔ نجی صحبتوں میں نہایت اصرار کے ساتھ، انکسار اور ایک مجوبانہ تبسم کے ساتھ بیاض کھولتے اور ڈوب کر نہایت صاف لہجے میں شعر پڑھتے تھے۔ الفاظ کے معنوی مزاج کے ساتھ ساتھ ان کی ہیئت اور جمالیاتی ساخت سے بھی خوب واقف تھے۔ اسی لئے ان کی زبان سے شعر سننے میں لطف سخن دوبالا ہوجاتا تھا۔ الفاظ کی ادائیگی اس انداز سے کرتے تھے کہ شعر کی تہہ در تہہ معنویت خود بخود آشکارا ہونے لگتی۔ غزل میں رشید اور کہیں کہیں ترابی بطور تخلص استعمال کرتے۔ اشعار غزل میں عموماً اور مقطعوں میں خصوصاً حیاتِ انسانی یا تجربات زیست کے ضمن میں جو بات کہتے کلیا اصول سازی کے انداز میں کہتے تھے۔ حضرت جوش ملیح آبادی عموماً غزل کے قائل نہیں لیکن انہیں علامہ رشید ترابی کا کلام پسند تھا خصوصاً علامہ کا یہ شعر تو آج بھی ان کے پسندیدہ اشعار میں شامل ہے۔ ؎

درد اندازۂ درماں سے سوا ہوتا ہے
ہائے وہ عقل جو نرغے میں ہو نادانوں کے

اسی غزل کا ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے۔

پردۂ رونقِ بازار اٹھا کر دیکھو
حسرتیں روٹھتی ہیں بھیس میں انسانوں کے

مجھے یقین ہے کہ جب علامہ ترابی کا مکمل کلام منظر عام پر آئے گا تو انہیں ہمارے ادب کی تاریخ میں بحیثیت شاعر ایک مستقل حیثیت حاصل ہوگی اور ہونی بھی چاہیئے کیوں کہ وہ اپنی ذات کے خلوت کدے میں سرتاسر ایک متفکر

شاعر ہی تھے۔!

ہم منکر تسلیم تھے آغاز سفر میں.
انجام غریبی، وہی تسلیم، وہی ہم
صحرا کے بگولے کی یہ گردش بھی ہے قانون
اور اس کو سمجھتے رہے بے راہ روی ہم

نفرت شناس رفیقوں کا ساتھ جب چھوٹا
چمن کا ذکر جو کرتے تھے روز شب چھوٹا
ہمارے اور بھی ساتھی تو اس قفس میں تھے
ذرا سی دیر کو سوچو کر کون کب چھوٹا
کیا سحر تک کوئی جلنے کی تمنا کرتا
بجھتے دیکھے ہیں اسی دل نے سر شام چراغ
کارواں جاتا ہے لے بیچ بھول پھونک رشید
اب کہیں اور جلا جا کے سر شام چراغ

شعلہ نوا خطیب

مولانا ماہر القادری

اب سے ۳۵ برس پہلے کی بات ہے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے کہ روزنامہ "رہبر دکن" میں جلسۂ عام کا اعلان نظر سے گزرا کہ فلاں تاریخ کو نمازِ عشاء کے بعد محلہ جدید ملک پیٹھ کے میدان میں لسان الامت نواب بہادر یار جنگ کی زیرِ صدارت جلسہ ہوگا۔ جس میں "رشید ترابی بی ایس سی" تقریر کریں گے، عوام و خواص کے لئے بالکل نیا نام! پھر مقرر کے نام کے ساتھ مولوی مولانا، حضرت قبلہ، مدظلہ غرض تعظیم و تکریم کا کوئی لقب نہ تھا، مشرقی امتحانات اور دینی علوم کی کسی ڈگری کی بجائے "بی ایس سی" لکھا ہوا — جسے پڑھ کر ذہن اس طرف جاتا تھا کہ سائنس کا گریجویٹ مذہب و شریعت پر کیا بولے گا! سائنس والوں سے عام طور پر تقریر و خطابت اور تحریر و انشاء کی روایتیں وابستہ نہیں رہیں۔

جلسۂ عام میں لوگوں کے لئے سب سے بڑی کشش کا مرکز نواب بہادر یار جنگ کا نام اور شخصیت تھی۔ ان کی تقریر سننے کے لئے لوگ دور دور سے پیدل چل کر آئے۔ جدید ملک پیٹ کا میدان بجلی کے قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ اسٹیج پر نواب صاحب (مرحوم) کے قریب ایک خوش پوشاک اور خوبرو جوان شخص بیٹھا ہوا نظر آیا۔ عمر بہت سے بہت چوبیس پچیس سال ہوگی۔ مگر شیخ سعدی کے بقول۔

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

تلاوت کے بعد یہی جوان اس جلسہ کا پہلا مقرر تھا۔ اس نے آغاز میں حمد و

صلوٰۃ پر مشتمل عربی خطبہ اس انداز میں پڑھا کہ اس کا چہرہ سامعین کی نگاہوں کا مرکز بن گ
تقریر کا موضوع اچھوتا مگر ساتھ ہی انتہائی خشک۔ وضو کرتے ہوئے جو ناک میں پانی لے
ہیں یعنی استنشاق، تقریر کا عنوان تھا! تھوڑی سی دیر میں سامعین کو اندازہ ہوا
یہ تو بلبل ہزار داستان ہے جس کی چہک کانوں میں رس گھول رہی ہے اور یہ صرف
لب ولہجہ اور الفاظ ہی نہیں، استدلال بھی، معلومات بھی، تقریر وخطابت کے فن کا بھی
مظاہرہ بھی، ! ترابی صاحب نے دماغی اعصاب، ناک اور حلق کی ساخت اور اس
سائنسی فنکشن عمل۔

(scientific Function) کی نہایت ہی دلچسپ اور عالمانہ انداز
میں تشریح فرمائی اور پھر طب مغربی کے اصولوں کی روشنی میں ثابت کیا کہ پانی لے
(استنشاق) اسے دماغ کے کن امراض کا ازالہ ہوتا ہے۔ اور وضو کا یہ عمل صحت ک
لئے کس قدر مفید اور فطرت کے عین مطابق ہے۔ مجمع سے سبحان اللہ، جزاک اللہ
اور نعرۂ تکبیر کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ سارے شہر میں اس تقریر کی دھوم مچ گئی! او
دن علامہ رشید ترابی کے تعارف کا پہلا دن تھا۔ بس پھر ان کی شہرت اور مقبولیت
بوئے گل کی طرح پھیلتی چلی گئی۔ اتحاد المسلمین کے ہر بڑے جلسہ میں ان کی تقریر ہوتی
اور ان کی خطابت سے سماں بندھ جاتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے سعید الملک سر احمد سعید
نواب چھتاری جب صدر اعظم ہوتے ہیں تو میں بلدۂ حیدر آباد کے شہریوں
نے ان کے اعزاز میں بڑے پیمانے پر ضیافت کا اہتمام کیا۔ اس ضیافت پر جناب رشید
ترابی نے مختصر سی تقریر کی اور لوگوں کے اصرار پر اپنے اشعار بھی سنائے، شعر سنانے
سے پہلے فرمایا کہ تقریر مقام اختیار تھا اور شعر خوانی تقاضائے جبر ہے۔!

بلدۂ حیدر آباد کے عظیم الشان جلسوں میں نواب بہادر یار جنگ اور علامہ ترابی کی
تقریروں کے ساتھ میری نظم بھی ہوتی تھی۔ اس طرح مرحوم سے ملنے جلنے کے مواقع

ملتے رہتے۔ جب بھی آمنا سامنا ہوتا تو مصافحہ کے ساتھ معانقہ بھی کرتے، اس پر ان کا محبوبانہ تبسم دل میں اتر جاتا۔

قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ کے انتقال سے دو ڈھائی سال پہلے اتحاد المسلمین کے جلسوں میں علامہ رشید ترابی بہت ہی کم دیکھے گئے۔ اس کا سبب ان کی گوناگوں مصروفیات بھی ہو سکتی ہیں۔ اور یہ بھی ہے کہ یہ دنیا ہے روابط و تعلقات میں مد و جزر بھی آتے رہتے ہیں۔

نواب بہادر یار جنگ کی تقریر میں ایسا محسوس ہوتا جیسے بادل برس رہا ہے۔ علامہ ترابی کی تقریر میں ایسا لگتا جیسے کوہ آتش فشاں حرکت میں آ گیا ہے۔ پاکستان میں علامہ رشید ترابی کی تقریر و خطابت اور ذہانت و قابلیت کے جوہر پوری طرح ظاہر ہوئے، مجالس عزا میں بس انہی کا طوطی بولتا تھا۔ ادبی اصطلاح میں جسے فضا پر چھا جانا کہتے ہیں وہ چیز ان کو حاصل تھی۔ وہ جب تقریر کرتے تو مجمع ان کی مٹھی میں ہوتا جہاں چاہا رلا دیا اور جہاں چاہا دلوں کو گرما دیا۔ اسی کا نام سحر خطابت ہے۔

راقم الحروف نے شیعہ مقررین میں علامہ علی حائری، مولانا سید سبط حسین، حکیم مرتضیٰ حسین، علامہ کفایت حسین، مولانا سید محمد دہلوی، علامہ ابن حسن جارچوی، مولانا کلب عباس لکھنؤ اور مولانا لقا علی بدایونی کو سنا ہے۔ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ کے پرنسپل مولانا سید سبط حسن تو تقریر و خطابت کے بادشاہ تھے۔ دوسرے مقررین کا اپنا اپنا انداز تھا۔ مگر رشید ترابی مرحوم کی خطابت میں جو انفرادیت پائی جاتی تھی وہ انہی کا حصہ تھی۔ اپنی ذہانت سے نئے نئے موضوعات ایجاد کرتے اور ان پر الفاظ و بیان اور استدلال کی عمارت کھڑی کر دیتے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ خالقدینا ہال، میں جوان کے مواعظ ہوتے تھے ان میں تقریر کا عنوان "حسین اور اقتصادیات" بھی تھا، اس موضوع پر بولنا اور بھانا بس انہی کا کام تھا، تقریر میں الفاظ کی وہ پر جوش روانی جیسے بپھرا ہوا دریا اور متلاطم

صند! اس عرفان میں بعض اوقات اتنے دور نکل جاتے کہ خود ہی چونک کر موضوع کی طرف واپس آ تے۔

علامہ مرحوم حیدرآباد دکن میں مجلس اتحاد المسلمین کے جلسوں میں ملت اسلامیہ کے مشترک مسلم اور متفق علیہ عقائد و مسائل پر بولتے۔ مگر کراچی کی مجالس عزا میں اختلافی مسائل بھی چھیڑ جاتے۔ اس رواداری کو سراہا جائے گا کہ اس کا ردِ عمل صرف چپ سیگوئیوں تک محدود رہا۔ اللہ تعالیٰ اختلاف عقائد کے باوجود ملت کے اتحاد کو قائم رکھے۔ دائمی کہ ہم سب ایک ہی شجر طیبہ کی شاخیں اور پھول پتے ہیں۔

رشید ترابی مرحوم نے ، خاندانی منصوبہ بندی ، کی زبان سے نہیں عملاً قانون شکنی اور خلاف ورزی کی کثیر الاولاد اور کثیر الازدواج شہرت کے ساتھ خوشحالی اور ترفہبی انہیں میسر آیا، اتنا بڑا کنبہ رکھنے کے باوجود معاشی طور پر غیر مطمئن نہیں رہے، انہیں ہر طرح کا آرام میسر تھا چونکہ پراگندہ روزی، نہ تھے۔ اس لئے پراگندہ دل' بھی نہ تھے جمعیت خاطر اور اطمینان قلب بڑی کام کی چیز ہے۔

ملک کے سیاسی حالات پر اخباروں میں ان کا ردِ عمل عوام کے سامنے نہیں آتا تھا اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ سیاسیات کے خارزار سے اپنے دامن کو بچائے رکھا۔ ان کی اس روش کے سبب کسی بھی دور حکومت میں ان کو خطرناک نہیں سمجھا گیا۔

خود صاحب کمال اور اہل کمال کے قدردان بھی تھے۔ مشہور شاعر استاد قمر جلالوی کو برسوں اپنے یہاں مہمان رکھا اور ان کی ہر طرح کی خاطرداری اور پذیرائی کی۔ استاد قمر رشید ترابی مرحوم کی مہمان نوازی اور سیر چشمی کے بڑے مداح تھے۔

اس بات کو سات آٹھ سال ہوئے ہوں گے جوش ملیح آبادی صاحب کے یہاں صبح کے ناشتہ کے بعد شعر و شاعری کی محفل گرم ہوئی۔ اس میں علامہ مرحوم نے اپنی دو نظمیں سنائیں جن میں خاص روانی اور رفعتِ فکر پائی جاتی تھی۔ شاعری پر پوری طرح وقت صرف

کرنے اور توجہ دینے کا انہیں موقع نہیں ملا۔ مگر پھر بھی ان کا کلام بعض مشہور شاعروں کے کلام کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

سال ہوا، ان کے صاحبزادے نصیر ترابی صاحب غریب خانہ پر تشریف لائے۔ اپنی شادی کا دعوتِ ولیمہ کا رقعہ دیتے ہوئے بولے بابا نے کہا ہے کہ ملے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں آپ اس دعوت میں ضرور آئیں گے۔ ان دنوں میری بعض مصروفیات بھی تھیں اپنے رسالہ کی تیاری اس پر مستزاد! مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ علامہ رشید ترابی محبت سے یاد فرمائیں اور میں طرح دے جاؤں! چنانچہ میں حاضر ہوا۔ دوسروں سے تو مصافحہ کرتے رہے مگر مجھے دیکھ کر بے ساختہ آگے بڑھے اور گلے سے لگا لیا ——— مگر اس المیہ کا اظہار کن لفظوں میں کیجیے کہ وہ جسم جو چلتا پھرتا دبستان علم و ادب تھا قبر میں محوِ خواب ہے بے حرم کی اے شامِ غریباں تجھے کس جا سے پرسا دوں!" رہے نام اللہ کا۔

خطیب کامل

راوی : ریٹائرڈ جنرل محمد موسیٰ

تحریر : امیر حسین

۱۹۴۷ء میں جب میں ڈپٹی چیف آف اسٹاف تھا، تو آپ صاحب کو اسوقت سے جانتا ہوں، مرحوم سے ان گنت ملاقاتیں ہوئیں اور ہر ملاقات ایک یادگار ملاقات ثابت ہوتی رہی، بحیثیت خطیب کس حد تک کامیاب رہے یہ ایک تفصیل گفتگو ہے لیکن اس تفصیل میں جانے سے پہلے ایک خطیب کی تعریف جاننا زیادہ ضروری ہے۔

میری دانست میں ایک لازوال خطیب میں ان صفات کا ہونا لازمی ہے۔

۱۔ خطیب میں بلا کی خود اعتمادی ہو۔

۲۔ خطیب جس موضوع پر بول رہا ہے اس کے ہر پہلو سے واقف ہو اور اس سلسلے میں اس کا علم کامل ہو۔

۳۔ انداز خطابت میں اس درجے تاثیر اور تاثر ہو کہ خطیب جن خیالات کا اظہار کر رہا ہے سامعین ان سے اتنا ہی استفادہ کر سکیں جتنا خود خطیب چاہتا ہو۔

۴۔ سامعین کی جملہ نفسیات سے آگاہ ہو یعنی مجمع کے شعور کا مزاج سمجھتا ہو۔

۵۔ اس میں خود غرضی نہ ہو، خود ستائی نہ ہو بلکہ اسے صرف اور صرف ایک خطیب ہونا چاہیئے۔

۶۔ خطیب حاسد نہ ہو اور اس کا فن تقریر اس کی تقریر پر حاوی ہو۔

۷۔ خطیب میں یہ خوبی بھی ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے سامعین میں خود اعتمادی پیدا کر سکے۔

۸۔ موضوع کچھ بھی ہو، تقریر کرے تو اس میں مبالغے کی جھلک تک نظر نہ آئے اور سامعین کا وقت ضائع کئے بغیر کم سے کم مدت میں وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ سامعین کے حافظے کے سپرد کر دے۔

۹۔ اس کی آواز، اس کی حرکات و سکنات اور طرز بیان میں زیادہ سے زیادہ کشش ہونی چاہیئے۔

۱۰۔ خطیب جس موضوع پر بول رہا ہے اُسے سوائے دلائل کے کسی اور ذریعے سے نہ منوائے۔

۱۱۔ اپنی تقریر کے خاتمے پر کوئی ایسا نکتہ ضرور چھوڑے جس سے سامعین کے ذہنوں کو تحریک ملے اور وہ اپنے طور پر مزید کچھ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔

۱۲۔ خطیب کی ذمہ داری ہے کہ وہ مجمع میں یا تنہائی میں کبھی کسی سطحی بات کا نوٹس نہ لے، ایک اچھے خطیب کو چھوٹی چھوٹی باتوں سے بالاتر ہونا چاہیئے۔

میرے خیال میں بحیثیت خطیب ترابی صاحب میں یہ تمام صفات بدرجہ اتم موجود تھیں۔

آج کا دور جو بیسویں صدی کہلاتا ہے، اس میں لوگ زیادہ فہیم اور ذہین ہیں۔ اس لئے اس دور میں ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن کریم کو دلائل سے سمجھایا جائے، ترابی صاحب نے قرآن کریم کو سمجھانے کا یہی طریقہ اختیار کیا تھا، میں نے ترابی صاحب کی مجالس میں بارہا نوٹ کیا کہ وہ منبر پر بیٹھ کر اپنی ذمہ داریاں سمجھتے تھے وہ جانتے تھے کہ وہ جس مقام سے بول رہے ہیں وہ ذوونٹ کی لکڑی

کا کوئی روایتی منبر نہیں ہے بلکہ وہ منبرِ رسولؐ اور منبرِ علیؑ ہے جہاں بیٹھ کر صرف اور صرف دین و دانش کے فرائض پورے کئے جاتے ہیں۔ ویسے بھی انسان زندگی کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتا ہو، وہ ایڈیٹر ہو، لیڈر ہو، افسر ہو، وکیل ہو، خطیب ہو، غرض کچھ بھی ہو اُسے ہر دم اپنی ذمہ داریوں کا کامل احساس رہنا چاہیے اور یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے خدا اُسے دیکھ رہا ہے، یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ذمہ دار خطیب عطا کیا تھا جو ایک طویل عرصے تک اپنے سننے والوں کی فہم و ادراک کا مرکز و محور بنا رہا۔

علامہ ترابی مرحوم سطحی ذہن کے انسان ہرگز نہیں تھے، انہوں نے ہمیشہ اسلامی اخوت اور عالمِ اسلام کے اتحاد کو اپنا مشن بنائے رکھا۔ اس سلسلے میں اگر میں یہ کہوں کہ وہ خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مذہبی فلاسفر اور اسکالر بھی تھے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اگر انہیں منبر سے ہٹ کر دیکھا جائے تو وہ ایک خوش اخلاق، مہمان نواز اور انسان دوست شخص بھی نظر آتے ہیں، جن لوگوں کی علامہ مرحوم سے وابستگی رہی ہے وہ جانتے ہوں گے کہ ان میں مذکورہ صفات تو جیسے کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔

علامہ مرحوم نے لوگوں میں دین اور مذہب کی بابت جو بیداری اور خود اعتمادی پیدا کی یہ اسی کا اثر ہے کہ ان کی موت کے بعد ان کی کمی کو اس قدر شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے لوگوں میں اپنے ذہن سے سوچنے کی عادت ڈالی اور لاکھوں افراد میں دین سے متعلق عزت و احترام اور خود اعتمادی پیدا کی یہ انہی کی ذات کا کرشمہ ہے کہ ہزاروں لاکھوں افراد میں مطالعہ کا شوق بیدار ہوا اور شعور کی بہت سی راہیں کھلیں۔

ترابی صاحب نے شیعہ دینیات اور مطالبات کے سلسلے میں بھی اپنے

طور پر بہت کچھ کیا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں "برسرِ اقتدار" تھا تو انہوں نے مجھ سے ذاتی طور پر اس جانب توجہ دینے کی تاکید کی تھی، ترابی صاحب کا ایک اور بہت بڑا کارنامہ مالک اشتر کے نام مولا علیؑ کے خط کا انگریزی کا ترجمہ ہے جسے میں فخر کے ساتھ ایک مثالی چیز کہوں گا۔ اس کے بارے میں خود علامہ موصوف اور ایوب خان دونوں نے مجھ سے ذکر بھی کیا تھا۔ بلکہ ایوب خانصاحب کو تو وہ تر۔۔۔ اس قدر پسند آیا کہ مملکت کے انتظامی امور میں اس سے ہر ممکن استفادہ کیا گیا۔

میری اپنی رائے میں ان کی موت کے بعد جو خلا پیدا ہوا ہے اسے مستقبل قریب میں پُر کرنا بہت مشکل ہے۔ اگرچہ ہمارے ہاں اور بھی عالم ہیں لیکن پھر وہی بات آجاتی ہے کہ صرف بے پناہ عالم ہونا دیگر بات ہے اور بے پناہ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایسا خطیبِ کامل ہونا جس سے ہر سننے والا استفادہ کر سکے دوسری بات ہے، ملتِ جعفریہ کے دوسرے خطیب ہر چند کہ بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں لیکن ظاہر ہے وہ اپنی ہی علمی سطح سے بول سکیں گے، علامہ رشید ترابی تو پھر بھی نہ بن سکیں گے، تاہم ان کے صاحبزادے عقیل ترابی اپنی بساط سے زیادہ کام کر رہے ہیں اور ان سے کچھ توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

آخر میں ترابی صاحب کے سلسلے میں یہ کہنا بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ مرحوم نہ صرف ایک گرانقدر قومی شخصیت تھے بلکہ بین الاقوامی حیثیت کے حامل تھے۔ ایران اور انگلینڈ میں، میں نے خود بے شمار لوگوں کو ترابی صاحب کی محبت میں سرشار دیکھا ہے، یہ سب ذکرِ حسینؑ کی برکت ہے کہ ترابی صاحب مر کر بھی زندۂ جاوید رہیں گے، سچ ہے واقعۂ کربلا یوں تو ہر ذاکر دہراتا ہے اور اس واقعہ کو سب جانتے ہیں لیکن اس واقعہ کو بیان کر کے اس سے سوچ کی نئی نئی شمعیں جلانا صرف ترابی صاحب ہی کا حصہ تھا۔

مشہور خطیب

مولانا احتشام الحق تھانوی

علامہ رشید ترابی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے گریجویٹ تھے اور انہیں ابتداً سے دین و مذہب سے لگاؤ تھا جس کی بنا پر دینی و مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا اور اس طرح وہ قدیم و جدید علوم کے فاضل ہو گئے، خطابت و تقریر میں یہی جامعیت نمایاں تھی۔ وہ بڑے مشہور خطیب تھے اور دلائل میں علم کلام کا رنگ غالب تھا مجھے کچھ زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا تاہم سیرۃ النبی کے جلسوں میں کئی مرتبہ ملاقات بھی ہوئی اور تقریر سننے کا اتفاق بھی ہوا۔ مغرب زدہ مرعوب ذہنوں سے انہیں بڑی ضد تھی۔ عام طور پر مشرقیت کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتے تھے پاکستان کے سلسلہ میں ان کی سیاسی خدمات کی تفصیلات کا مجھے علم نہیں ہے۔ انکی اعلیٰ صلاحیتیں لوگوں میں یادگار رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اہلِ علم کی صحیح قدردانی کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین۔

احتشام الحق تھانوی

16.1.75

میرا آقا

راوی : خادم علی (علامہ مرحوم کے ملازم خاص)

تحریر : امیر حسین

مجھے تراؔبی صاحب کی سولہ برس تک خدمت کرنے کی سعادت حاصل رہی ہے، تراؔبی صاحب کے روز و شب کیونکر گزرتے تھے؟ اس سلسلے میں بہت سی باتیں یقیناً ان کے عقیدتمند نہیں جانتے ہوں گے۔ مطالعہ علامہ صاحب کی سب سے بڑی کمزوری تھا، رات ہو یا دوپہر مطالعہ کے بغیر انہیں نیند نہیں آتی تھی، مرحوم دوپہر کا کھانا گیارہ بجے تناول فرمایا کرتے تھے، اتنی جلدی کھانا کھانے کی وجہ یہ تھی کہ علامہ صاحب فجر کے بعد نہایت مختصر سا ناشتہ کرتے تھے اور پھر گیارہ بجے ایک ڈیڑھ چپاتی اور ایک دو چمچے چاولوں کے کھا کر گویا دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو جایا کرتے تھے۔ رات کو عموماً ڈیڑھ دو بجے تک مطالعہ کرنا ان کی برسوں پرانی عادت تھی۔

تراؔبی صاحب نے مرنے سے چند روز پہلے مجھ سے کہا تھا کہ پاڑو میاں (خادم علی صاحب کی عرفیت) مرنا تو سب کو ہوتا ہے لیکن ہم مر گئے تو ہماری چند باتیں یاد رکھنا، گھر کا خیال رکھنا، بچوں کو کوئی تکلیف نہ ہونے دینا اور ہمارا جنازہ عزاخانہ زہرہ سے اٹھا کر نشتر پارک لانا اور پھر اس کے بعد ہم حسینیہ سجادیہ جائیں گے۔

علامہ مرحوم محرم کے دنوں میں خصوصیت کے ساتھ رات گئے گھر آتے تھے، ان دنوں ان کی خوراک اور بھی کم ہو جاتی تھی یعنی صرف چائے کے ساتھ ڈبل توس

کھلتے تھے اور پھر کچھ دیر نیند لینے کے بعد رات ½۲ بجے اٹھ جاتے، نماز فجر ادا کرنے اس کے بعد ۱۱ بجے دن تک کے لئے سو جاتے۔ مصروفیات کے ان ایام میں بھی مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھتے اور دوران مطالعہ اگر کبھی جی چاہتا تو مجھ سے کافی یا چائے وغیرہ کے لئے کہہ دیتے۔

علامہ مرحوم کی عزا خانۂ زہرہ کے لئے خاص وصیت تھی کہ وہاں زندگی بھر نوحہ خوانی کا سلسلہ جاری رکھنا، موت سے چھ ماہ قبل مرحوم کا یہ معمول بن گیا تھا کہ ہر جمعرات کو ظہر کی نماز سجادیہ میں اور مغرب کی نماز عزا خانۂ زہرہ میں جا کر ادا کرتے تھے اور بعد مغربین ایک مختصر سی مجلس سے خطاب فرمایا کرتے تھے۔

تراب صاحب نے مجھ سے زندگی بھر بالکل اپنوں کا سا سلوک کیا اور مجھے گھر کا ایک فرد کی طرح سمجھا، وہ میرے تمام اخراجات خود اٹھایا کرتے تھے اور میرا اس قدر خیال رکھتے کہ بعض اوقات میں شرمندہ ہو کر رہ جاتا تھا، مرحوم میرے اچانک کہیں چلے جانے سے سخت ناراض ہوتے تھے۔ وہ کہتے بھئی تمہاری تمام ذمہ داری مجھ پر ہے: جہاں جاؤ کم از کم مجھے فون پر اطلاع تو کر دیا کرو کہ میں فلاں جگہ پر ہوں یہ کیا کہ بغیر بتائے ہی چلے گئے۔

تراب صاحب کی رحلت کے بعد اُن کے صاحبزادے نصیر ترابی مجھ سے ویسا سلوک کرتے ہیں جو ان کے والد ماجد کیا کرتے تھے۔ نصیر میاں میرا ہر ممکن خیال رکھتے ہیں اور حقیقتاً مجھے سوائے علامہ صاحب کے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتے۔ علامہ صاحب کو بھول جانا جب ایک عام آدمی کے بس میں نہیں تو میں تو پھر ان کا ملازم خاص ہوں۔

حیدر آباد دکن میں میرے ماموں مرزا عباس علی بیگ سے علامہ صاحب کے مراسم تھے اور علامہ صاحب انہی کی وجہ سے میرا خاص خیال رکھتے تھے، میں جب بھی

بیمار پڑتا، مرحوم میری ہر ممکن تیمارداری کرتے۔ ۱۹۶۶ء میں علامہ صاحب نے مجھے زیارت کے لئے بیرون ملک بھیجا، اس کے بعد دوبارہ ۱۹۶۸ء میں انہی کے ایما پر دوبارہ زیارتوں کے لئے گیا اور پھر ۱۹۷۰ء میں علامہ صاحب کے ساتھ مشہد گیا، جہاں علامہ صاحب پانچ روز ٹھہرے اور مجھے آگے جانے کا حکم دیا اور میں زیارتیں کر کے واپس آ گیا۔ علامہ موصوف مجھے عام لوگوں میں میری عرفیت یارڈو میاں کے نام سے پکارتے تھے اور خاص محفلوں یا خاص اجتماعات میں خادم علی کہتے تھے۔ علامہ مرحوم کے بچوں میں میری یادوں تراب سے زیادہ بے تکلفی ہے۔ گھر پر علامہ مرحوم سے ملنے والوں کی تعداد بہت ہوتی تھی لیکن وہ ناسازی طبع یا اپنے آرام میں خلل پڑنے کے باوجود ہر ایک سے ملتے تھے، انہوں نے کئی لڑکیوں کی شادیاں کرائیں، کئی مومنین کی دشواریوں میں بھرپور تعاون کیا اور بے شمار لوگوں کو روزگار کے مواقع مہیا کئے۔

علامہ مرحوم اس بار بیماری کے دوران میری خدمت سے بہت متاثر ہوئے تھے اور گھر کے تمام افراد سے وصیت کی تھی کہ یارڈو میاں کا خیال رکھنا، آخری دنوں میں علامہ صاحب مجھ سے دور اندیشی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ مجھے سمجھاتے آخری وقت ہے میری باتوں کو دھیان سے سنا کرو۔ جہاں کھانا کھاؤ سوچ سمجھ کر کھاؤ، کسی کا بھی گھر ہو اطمینان ہو تو وہاں کھانا کھا لینا ورنہ بغیر کھائے لوٹ آنا، اسی سلسلے میں یاد آیا کہ میں اپنے آقا کو کوئی بھی چیز اس وقت تک نہیں کھلاتا تھا جب تک ان سے پہلے اپنے طور پر خود چکھ کر نہ دیکھ لیتا۔ کاش ان کی موت کا ذائقہ بھی میں ان سے پہلے چکھ سکتا !!!

چھپ گیا چاند رات باقی ہے

ڈاکٹر عالیہ امام

کل جب تک علامہ رشید ترابی کی جگمگاتی اور نکہت ریز ساتی ہوئی شخصیت ہمارے درمیان موجود تھی۔ اس وقت بھی ان کی زندگی کی بلندی، قوت اور عظمت کا بھی گہرا احساس تھا لیکن یہ احساس آج زیادہ گہرا ہو گیا ہے اور کچھ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے چاند چھپ گیا ہو اور رات باقی ہے۔

علامہ صاحب نے دکن کی سونا جیسی زمین سے جنم لیا اور کندن بن کر زمانے پر چھا گئے۔ جس وقت ان کا شعور پروان چڑھا اس وقت دکن کی فضا کانگریس کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ مسلم لیگ تناور درخت بنی تھی، مسلمانوں کے حقوق پر حملے ہو رہے تھے۔ علامہ کے شعور میں آگ لگ گئی جس کے شعلے مسلمانوں کی سربلندی کے لئے زبان و بیان سے لپکنے لگے۔ مسلم لیگ کی قیادت سنبھال لی۔ بہادر یار جنگ کی ہم مشربی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ علامہ اپنی حکیمانہ قیادت و خطابت کے حسن کا خراج زمانے کو جھکا کر وصول کر رہے تھے۔

تاریخ نے کروٹ بدلی، پاکستان تخلیق ہوا، دکن کا ماہ نو پاکستان کی مقدس سرزمین کو چودھویں کا چاند بن کر منور کر گیا۔ تاریخ خطابت انسان کی طرح قدیم بھی ہے اور عظیم بھی، ہمارے عہد میں حسن خطابت کی علامت علامہ رشید ترابی قرار پائے جن کی فکر کا ایک سرا قرآن حکیم ہے، اور دوسرا ارسطو، ہیگل اور مارکس سے جڑا ہوا ہے۔ اس طرح ان کی خطابت مغربی اور مشرقی دھاروں کا سنگم ہے۔ لیکن اس عنوان سے کہ مشرقی فکر پر مغربی فکر حاوی نہیں ہونے پاتی۔ یہ قرآن حکیم سے استنباط پر بھرپور قدرت کا تجربہ ہے۔

علامہ صاحب نے [illegible] کا نہ بانداز عنوانات کے تحت بنایا۔ ایک طرف سورت کے دھاگے

اور دوسری طرف ریشم کے تار لگائے۔ لیکن اس طرح کہ جس وقت چاہا سوت کے دھاگے کو نکال لیا اور جب مرضی ہوئی ریشم کے تار کو کھینچ لیا۔ دونوں دھاگے کسی مقام کسی موڑ اور کسی منزل پر ایک دوسرے سے خلط ملط نہیں ہو سکے یہ (CLHRITY OF CLARILY) اور THOUGHT ERPRESSOIN سے الگ بین دلیل ہے (یہ موضوع اور طرز بیان پر عالمانہ گرفت کا منطقی نتیجہ ہے!

خطابت و تحقیق کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تحقیق کے معنی صرف مواد کی ترتیب و پیشکش کے نہیں بلکہ اسے نیا مفہوم اور نئے INTERPRETATION دینے کے بھی ہیں۔ علامہ کے نزدیک خطابت کا مقام صرف واقعات کی ترجمانی نہیں بلکہ کاروانِ حیات کی رہبری کا بھی ہے۔ ایک مقام پر صبر کے موضوع پر محققانہ نگاہ ڈالی اور فرمایا "یاد رکھو صبر کے معنی سپردگی کے نہیں۔ ظلم سے ٹکرانے اور باطل سے حق چھین لینے کے ہیں۔"

اس منطق کو سمیٹ لیجئے کربلا بن جائے گا پھیلا دیجئے تو دیت نام بن جائے گا۔ فکر کے اشجار میں تازگی کے لئے جڑوں میں تری کا ہونا لازم ہے۔ علامہ صاحب کی نگاہیں ایک بلند مقصد، مسلک اور نصب العین سے جڑی ہوئی ہیں لیکن قدم ان انسانوں سے ملے ہوئے تھے جن کی نا آسودہ آرزوئیں اور نا امید حسرتیں ہیں۔ انہیں سے قوت لے کر ان کے ماتھے پر وقار برس رہا تھا۔ زور جابر کو ٹھوکر ماردی تھی۔ قوت احساس کو سلب ہونے سے بچا لیا تھا۔ اور جرأت اظہار کی دولت کو سمیٹ لیا جس جرأتِ اظہار نے منبر پر بے باکی کے صد ہزار جلوے دکھائے۔ رزق پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا۔ "رزق میں اگر کمی ہے تو اس کا شکوہ رزاق سے نہیں اپنے معاشی نظام سے کرو جو ناقص اور نا تراشیدہ ہے۔"

علامہ صاحب صرف خطیب اعظم نہیں ایک بیدار مغز ادیب بھی تھے۔ ان کے سلام، رباعیات قصیدے اس کے گواہ ہیں خصوصیت کے ساتھ اقبال و غالب انیس و مولانا روم پر ان کی تقاریر ادب کا شاہکار قرار دی جاسکتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اردو زبان کے پاٹ کو بھی چوڑا کیا

ہے۔ ایک نئی روش، نیا مزاج اور نیا آہنگ دیا۔ انہیں فارسی، عربی کے علاوہ دکن کی اردو کے ساتھ ساتھ میر و غالب کی زبان پر بھی عبور تھا اور انیس و دبیر کی زبان پر بھی قدرت حاصل تھی۔ ریسرچ کے طلبہ اور لغت مرتب کرنے والوں کے سامنے نمونۂ زبان کا ایک نیا میدان کھول دیا تھا۔

شاعری و موسیقی شعر کے دو مصرعوں اور گیت کے دو بول کی طرح آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔ موسیقی زندگی کی لہروں کو ابھارتی، جذبۂ حسد کو نکالتی اور آدمی کو انسان کی منزل تک پہنچا دیتی ہے بقول ابوالکلام آزاد۔

"اگر ہماری خشک زندگی میں تری کہیں سے آتی ہے تو وہ موسیقی ہے۔"

لیکن موسیقی و حسن کا اثر قبول کرنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے بہت گہرا رشتہ درکار ہے۔ ایک زمانے میں ہندوستان میں گن چرچے کا رواج تھا۔ علماء موسیقی پر بحث و مباحثہ کرتے تھے۔ اور موسیقی کی درستی اور نادرستی کی سند دھرپد یا سوز سے لی جاتی تھی۔ کیوں کہ دونوں فن موسیقی میں کمالِ صحت کا نمونہ سمجھی جاتی تھیں۔ علامہ کی ذات میں موسیقی کی جڑیں کہاں تک پیوست تھیں۔ ان کا ذوقِ سماع کس مقام پر تھا۔ اس کے متعلق فی الوقت کچھ کہنا ممکن نہیں۔ جس سماج میں نفرت کا پرچار عبادت اور محبت و حسن کے ترانے گانا بدعت تصور کیا جاتا ہے۔ جہاں اخلاقیات کے جغادری بھی بات سن کر گھوڑے کی طرح ٹاپیں مارنے لگتے ہوں جہاں چاندنی رات اور بادِ صبا پر بھی پابندی عائد کرنے کی خواہش سینے میں موجزن ہو وہاں حسن کی بات کرنا گناہ ہے۔ لیکن میرے ذوق اور فکر کی پرورش میں علامہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ حق گوئی اور بیباکی کی دولت انہوں نے مجھے بخشی تھی اس لئے یہ کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ ترنم آواز خواہ وہ جھرنے کی ہو یا انسان کی۔ علامہ رشید ترابی کی زندگی کا بڑا اور دماغی کاوشوں کا سہارا تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں علامہ رشید ترابی وہ پہلے انسان تھے جنہوں نے اپنے تمدن کی خوبصورت روایت "سوز خوانی" کی انجمن کی داغ بیل ڈال اور اس کی صدارت قبول فرمائی۔ اپنی محبتوں میں اگر ایک طرف فیض، جوش، زیڈ اے بخاری اور مجھ ناچیز کو یاد کرتے تو دوسری جانب معشوق علی خاں صاحب اور عظمت لکھنوی جیسے فنکار جگہ پاتے

دماغ کی یہ شیرینی فنکارانہ ذہن کی غمازی کرتی ہے۔!

طنز و مزاح کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ طنز و مزاح کے توازن کو برقرار رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ مزاح میں اگر طنز کا عنصر بڑھا تو جملہ تیر و نشتر بن کر کلیجے میں پیوست ہو جاتا ہے اور اگر مزاح کا پہلو غالب ہو جائے تو پھکڑپن سے قریب ہو جاتا ہے۔ شائستہ ہنسی صرف اسی کا حصہ ہے۔ جو حسن و قبیح حرکت اور جمود، قول و فعل، سماج اور فرد کے تضاد اور بنیادی حرکات پر نگاہ رکھتا ہے۔ ایک مرتبہ میں علامہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ سر پر دوپٹہ تھا لیکن پھٹا ہوا۔ ناقدانہ نظر ڈالی اور فرمایا۔

"دیکھئے آج کل شوہر نامدار کیا کر رہے ہیں؟" میں نے کہا۔ "بزنس۔"

اں "خیر بات کاٹتے ہوئے فرمایا۔ "امارت کا اظہار تو لباس سے ہو رہا ہے۔" علامہ صاحب اور میرے والد کے مابین تعلقات کی نوعیت عاشق و معشوق کی سی تھی۔ میرے والد کو ۔۔۔۔

وہ ماہر میر انیس کے نام سے یاد کرتے۔ ایک مرتبہ موضوع زیر بحث تھا خطابات "سلسلہ" کلام جاری تھا کہ اچانک میں نے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا یہ بتائیے ہماری اور آپ کی خطابات میں کیا فرق ہے۔" محبت بھری بلیغ مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا "معمولی فرق صرف اتنا ہے کہ ایک منبر کو زینت دیتا ہے اور دوسرے کو منبر زینت بخشتا ہے۔"

بہن کے حادثے نے میری شخصیت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میری حیثیت آج بھی نونا لگی دیوار کی طرح ہے۔ قہقہوں کی تہوں میں آنسوؤں کی جوئے خوں، جو بہہ رہی ہے۔ علامہ کو میری بہن کی پرکشش شخصیت سے گہرا لگاؤ تھا۔ انہیں میرے صدمے کا بھی علم تھا۔ مجھے ملول دیکھتے تو فرماتے "وہ تم آمد سے ثریا کی سوانح عمری کا مطالعہ ضرور کرو ۔۔۔۔۔۔۔ اس کا خیال ہے خوش رہنا محض ذاتی حیثیت ہی نہیں بلکہ اخلاقی و سماجی ذمہ داری بھی ہے۔ دیکھو ستار کا اگر ایک تار ٹوٹ جائے تو سارا ستار بے آواز ہو جاتا ہے۔ تمہارا افسردہ چہرہ ہزاروں کے چہروں کو افسردہ کر دیتا ہے اس لئے اگر سماجی شعور کی بات کرنی ہو تو اس ذمہ داری کو نبھانا بھی سیکھو۔"

حقیقت یہ ہے کہ علامہ کی پوری شخصیت میں گہرائی و گیرائی رنگینی و رعنائی نہیں بلکہ گداز بھی تھی۔ ایسی گداختگی جو شیش محلوں سے نکل کر پوری انسانیت کے درد کو سمجھنے سے پیدا ہوئی ہے۔ علامہ کی ذات مولسری کی لمحاتی مہک و رنگ نہیں بلکہ کدم کے پھولوں سے لدے ہوئے درخت کی گھنیری چھاؤں ہے۔ جس میں تازگی بھی ہے اور مہک بھی ہے اور چھاؤں بھی۔!

(پاکستان نیشنل سنٹر میں ڈاکٹر عالیہ امام کی فی البدیہہ تقریر جو شارٹ ہینڈ میں مرتب کی گئی)

بارگاہِ ترابی میں

تحریر: منیرمندیمی

خطابت ایک فن ہے اس میں ریاض کی بھی ضرورت ہے اور ذریعہ اظہار کی تمام وسعتوں کا احاطہ کرنے کی بھی۔ سامعین کی سماعت اور نگاہ دو بڑی طاقتیں ہیں جو خطابت کو اپنے اندر سمو کر اس کے معیاری یا غیر معیاری ہونے کے بارے میں فیصلہ کرتی ہے۔ خطیب کا ایک چھوٹا سا جملہ لہجہ کے زیر و بم میں معمولی سی تبدیلی سے اپنے معنی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔ خطابت لہجے کے جس معیار پر اپنی بنیادیں استوار کرتی ہے اس کی گرد کو تحریر کبھی نہیں پہنچ سکتی۔ کہا جاتا ہے کہ تحریر زندہ رہتی ہے اور تقریر مر جاتی ہے تحریر کی عمر طویل ہوتی ہے اور تقریر بہت تھوڑی عمر کی حامل ہوا کرتی ہے، یہ بات درست ہے مگر تاثر کے جس منصب پر خطابت فائز ہے اس تک پہنچنا تحریر کے بس میں نہیں ہے، مذہب کی تبلیغ ہو یا سیاست کی نشر و اشاعت، تدریس ہو یا تربیت، ہر اہم مقصد کی تکمیل میں خطابت ہی وسیلہ اور ذریعہ بنتی ہے۔ اس فن میں جتنی مہارت نصیب ہوگی، اسی قدر اس کے اثرات مکمل، دیرپا اور قابلِ ذکر ہوں گے۔

تحریر کی عمر طویل سہی مگر جہاں تقریر کی رسائی ہو سکتی ہے، وہاں تحریر کبھی کبھی تو پہنچ بھی نہیں سکتی، جب تبلیغ دین یا سیاست کی نشر و اشاعت کے لئے امداد کی ضرورت ہے تو کونسا شعبہ بڑھ کر اپنی خدمات پیش کرتا ہے؟ خطابت ہی کے ذریعے پڑھے لکھے فرد سے لے کر ان پڑھ شخص تک پیغام پہنچایا جا سکتا ہے، انبیائے کرام کے حالاتِ زندگی اس امر کا ثبوت ہیں کہ انہوں نے پیغامِ الٰہی کی نشر و اشاعت میں زبان اور خطابت سے کام لیا۔ تحریر سے

کی منزل تربیت بعد میں نصیب ہوئی، آغاز تاریخ میں فلسفی اور مفکرین نے زور خطابت سے ہی میدان جیتے، تدریس و تعلیم میں کتاب سے زیادہ استاد کی تقریر کارگر ہوتی ہے۔

خطابت کی یہی وہ عظمت ہے جس کو ذکرِ حسینؑ نے مزید چار چاند لگادیئے ہیں اور عرفِ عام میں ذکرِ حسینؑ کو عام موضوعات سے علیحدہ کرنے اور اس موضوع کے تقدس کو مستحکم کرنے کے لئے اسے محض خطابت نہیں بلکہ ذاکری کہا جاتا ہے، ذاکری بھی ایک فن ہے۔ دیگر اصناف کی طرح اس کی بھی بہت سی منزلیں ہیں اس کا ابتدائیہ قرآن پاک سے عبارت ہے جس میں خطیب قرآن پاک کی کسی آیت کو اپنا موضوع بنا کر اس کی تفسیر آئمہ اہلِ بیعت کے پیش کردہ اصول کی روشنی میں کرتا ہے۔ تفسیر کے بعد خطیب چند ایسے کلیات وضع کرتا ہے جو کہ کامل جز قرار پاتے ہیں۔ اس کے بعد اہلِ بیعت کے فضائل بیان کئے جاتے ہیں۔ تاکہ سننے والوں کے سامنے آئیڈیل پیش کر کے ان میں طہارت روحانی پیدا کی جاسکے، مجلس کے اختتام پر مسائل اہلِ بیت اور خصوصاً واقعات کربلا کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ مصائب کے بیان تک پہنچنے کے لئے ذاکر گریز کے فن سے خاص طور پر کام لیتا ہے یہ ذاکر کی اپنی صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ کس عام واقعہ سے مشترکہ امور کے پیش نظر اس کا رشتہ واقعہ کربلا سے ملادے۔

علامہ رشید ترابی بلاشبہ ایک بلند پایہ ذاکر تھے انہوں نے ذاکری کے فن کو جدید علوم سے اس قدر مربوط کر دیا تھا کہ جدید ذہن اور نئے نئے افکار سے متاثر ہونے والے افراد بھی ان کی خطابت کی عظمت کو نظر انداز نہ کر سکے۔

خطابت کے لئے جن امور سے پوری واقفیت ضروری ہے، علامہ صاحب ان سب سے بخوبی واقف تھے اشارات استعارات تلمیحات، شعر، احادیث، تفاسیر قرآن پاک غرض انہیں ان سب سے باموقع اور برمحل استفادہ کرنا اچھی طرح آتا تھا، وہ سائنٹیفک عہد کی ضروریات اور عصری تقاضوں کا کل شعور رکھتے تھے انہوں نے کبھی محض تقلید گوارا نہیں کی وہ آئمہ مطاہرینؑ کے پیش کردہ فلسفۂ زندگی کے مطابق ہر علمی بات اور خلق اللہ

کے مفادات سے وابستہ شے کو حاصل کرنے کا پیغام دیتے تھے وہ جب زیب منبر ہوتے تھے تو ایک شعلہ کی مانند ہوتے تھے، مجمع کی نفسیات اور سامعین کے ذہنوں پر مکمل کنٹرول ان ہی کا حصہ تھا جب وہ خطابت کے دوران آستین پلٹتے، شیروانی کے بٹن کھولتے یا منبر پر زور سے ہاتھ مارتے تو یہ سب ان کے خطاب کا ایک لازمہ بن جاتے تھے، جو بات وہ الفاظ کے سہارے نہ کہنا چاہتے تھے، وہ منبر پر ہاتھ مار کر بیان کر دیتے تھے۔ ان کی تقریر کا آدھا لطف ان کی حرکات و سکنات کا بغور مشاہدہ کرنے سے وابستہ تھا جھوم جھوم کر ان کا اشعار پڑھنا شعر کی معنویت میں ہزار گنا اضافہ کا باعث بنتا تھا۔ نوجوانوں کے لئے ان کا ہر انداز ان کے خطابت سے عبارت تھا۔

علامہ رشید ترابی ہر مکتبہ فکر میں یکساں مقبول تھے انہوں نے خود کو ذکر حسینؑ سے وابستہ کر لیا تھا اسی منبر سے وہ مذہب کو عصری ضرورتوں اور جدید خیالات کی کسوٹی پہ پرکھ کر پیش کرنے کا اہم فریضہ انجام دیتے تھے۔

اس امر سے کسے انکار ہو گا کہ جدید سائنٹفک تحقیقات اور مذہب پر کم فہموں کی اجارہ داری کی وجہ سے ہماری نئی نسلیں مذہب سے بیگانگی اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ عموماً مذہبی کتب رسائل اور وعظ وغیرہ میں اس سلسلہ میں کافی تلخ نوائی سننے میں آتی ہے لیکن علامہ صاحب کا یہ عجیب کمال تھا کہ ان کی تقریر سننے والوں میں بزرگوں کی تعداد سے زیادہ نئی نسل کے شرکا ہوتے تھے۔ علامہ مرحوم جانتے تھے کہ مذہب صرف چند ارکان دین کی پابندی ہی کا نام نہیں ہے بلکہ مذہب سے لوگ جینے، مرنے، بولنے، سننے اور زندگی بسر کرنے کا سلیقہ بھی سیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے اپنا مطالعہ کی حدود کو زندگی کے ہر شعبہ تک وسعت دے دی تھی۔ یہی وہ وسعت تھی جس نے ان کی خطابت میں ایسی رنگ آمیزی کی کہ ہر شخص ان کی تقریروں کا گرویدہ تھا۔ اس میں نہ نکتہ فہمی کی قید تھی نہ عمر و مرتبہ کی ان کی مجالس کی رونق بچے بھی تھے اور بوڑھے بھی، اپنے بھی تھے اور غیر بھی۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ تقریر کی عمر بہت کم ہوتی ہے تو فوراً علامہ صاحب کا پیرو بلند آکر اس کلیئے کی تردید کردیتا ہے کتنے دل ہیں جو ان کی تقریروں سے گداز ہوئے ہیں سامع ان کا نام سنتے ہی پگھل جاتے ہیں۔ سینکڑوں نوجوان ہیں جو آج جب یہ سنتے کہ کسی جگہ ان کا ٹیپ سنایا جارہا ہے تو سب کام چھوڑ کر وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ ان کا اعجاز ان کی زندگی میں بھی مسلم تھا اور آج بھی اپنی مثال آپ ہے۔

علامہ صاحب آج ہمارے سامنے نہیں، لیکن آنے والے محرم میں ان کا نہ ہونا ہمیں مزید رلائے گا، وہ منبر کی رونق تھے۔ انہوں نے خود کو اس ذکرِ خاص کے لئے اس قدر مخصوص کردیا تھا کہ مدتوں ان کی کمی محسوس ہوگی۔ یہ رتبے ہر شخص کے مقدر میں نہیں ہوتے۔

؎ یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

علامہ صاحب نے آٹھ سال کی عمر سے خدمتِ حسینؑ کا آغاز کیا تھا اور آخر وقت تک وہ اسی فریضہ کی انجام دہی میں ہمہ تن مصروف رہے۔ مجلسِ حسینؑ کی رونق تو ختم ہوگی؟ مگر منبر مدتوں اس ذاکرِ حسینؑ کی کمی محسوس کرتا رہے گا، اب نشتر پارک، خالقدینا ہال، امام بارگاہ کھارادر، حسینیہ ایرانیان، بارگاہ شاہ نجف، مرکزی امام بارگاہ، امام بارگاہ شاہ کربلا اور ہزاروں دیگر عزاخانے اس ذاکرِ حسینؑ کی یاد میں غمگین رہیں گے۔ مگر حسینیہ سجادیہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہاں حضرت عباسؑ کے علم کے سائے میں یہ خطیبِ آلِ محمدؐ محوِ خواب ہے۔

ترابی صاحب کی تقاریر شائع ہوں گی، ان کے کیسٹ منبروں سے سنائے جائیں گے مگر وہ بات کہاں سے آئے گی جو دورانِ خطابت ان کی ہلکی سی مسکراہٹ، انگلی کا ایک اشارہ، آستین الٹنے اور شیروانی کے بٹن کھولنے سے پیدا ہوتی تھی، ان کا یہ اندازِ خطابت ان کی تقریروں کے اقتباسات سے تو ظاہر نہیں ہوسکتا۔ لفظوں کی تکرار سے جو رمزیت آشکار تھی وہ اب کہاں نصیب۔ مگر پھر بھی ان کی تقریریں فلسفہ، مذہب اور تاریخ کی جگمگاتی تفسیریں ہیں۔ انہوں نے جو کچھ دیا وہ اتنی کم مدت میں کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ آئیے ان

کی چند تقاریر کے اقتباسات سے استفادہ کریں۔

۔شرک رسولؐ کے مقابلے میں اپنی انا کو فروغ دینا ہے جو رسولؐ کو ہٹا کر خود کو ابھارے رسولؐ کو ہٹا کر اپنے آپ کو ابھارے۔ وہ مشرک ہے۔ جو اپنی انا کو منوانا چاہے اور رسولؐ کے سامنے خود کو بلند کرے، وہ مشرک ہے۔ توحید مجرد ہے، اسلام بھی مجرد ہے، اسلام مجرد سے مجسم ہو جائے تو محمدؐ ہے۔

(موضوع توحید و شرک)

انسان اور حیوان میں فصلِ قریب صرف عقل ہے۔ انسان کے افعال اور حیوان کے افعال ایک ہی ہیں۔ لیکن ان دونوں کے درمیان سب سے اہم فرق عقل ہے انسانی افعال "عقل" کے اور حیوانی افعال جبلت کے ماتحت ہیں۔" عام انسان اور رسولؐ کے درمیان فصل وحی ہے۔ رسولؐ کے افعال وحی کے ماتحت ہیں:

"شرافت انسان کا اعلان کرتے ہوئے قرآن نے بعض ایسے فضائل معین کر دیے اور بعض ایسی خصوصیتوں کا انسان کے لئے وجود ثابت کیا کہ جن فضائل و خصوصیات کی بنا پر انسان کی انسانیت ساری موجودات میں محل ذکر و فکر بن گئی۔ ان تمام فضائل نفسی اور ان تمام حسنات و کمالات نفس انسانی میں ایک اہم منزل، ایک اہم منزلت ایک اہم مقام شرافت "صبر" قرار پایا۔ صبر صرف انسان کے لئے ہے نہ حیوان کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، نہ فرشتوں کے لئے۔ حیوان کے لئے یہ استعمال اس لئے نہیں ہو سکتا کہ صبر بدون تعقل نہیں، صبر بغیر علم نہیں، علم جتنا کمال پر جائے گا اسی قدر صبر منزل تکمیل پر پہنچے گا۔

(موضوع صبر)

وہ انسان جو عاقبت پر نگاہ رکھتے ہیں وہ ظاہری تزئینِ دنیا میں نہیں پڑتے، وہ

اقتدار اور اثر کو نہیں دیکھتے۔ وہ بندگی دیکھتے ہیں۔ یہ وہ انسان ہوتے ہیں جو ذاتی مفاد سے بلند ہوتے ہیں۔ جو شخصی میلانات اور رجحانات کا شکار نہیں ہوتے ان کو استبداد سے نہیں ڈرایا جا سکتا۔

(شامِ غریباں کی مجلس سے خطاب)

علامہ صاحب کے جلوسِ جنازہ میں لاکھوں سوگواروں کا ہجوم تھا اور کیوں نہ ہوتا محبت کرنے والے اسی شان سے دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔ جب وہ زیبِ منبر ہوتے تھے تو ایک جملہ بڑی محبت سے ادا کرتے تھے۔ آج چوتھی تقریر سماعت کے لئے ہدیہ ہے یا ساتویں تقریر سماعت کے لئے ہدیہ ہے وہ اس وقت محوِ خواب ہیں اور چند سوگوار الفاظ ان کے محبوں کے لئے ہدیہ ہیں۔ انہوں نے اپنے سامعین کو سوچنے سمجھنے اور اظہار کرنے کی جرأت بخشی۔ ہے اس کی لاکھوں عظیم مثالوں میں بھی ایک ادنیٰ مثال ہوں علامہ رشید ترابی کی بارگاہ میں ہدیۂ عقیدت کے لئے میں ان کے ایک شعر پر اس ہدیہ کو ختم کرتا ہوں ؎

غم کی شادابی سلامت چند اشکوں کے سوا
اپنی کتابِ زندگی کا ہر ورق بوسیدہ ہے

میرا مونس

راوی : **مظفر علی شمسی**

تحریر : امیر حسینی

علامہ ترابی صاحب مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جن کا مومنین کے دلوں پر قبضہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ترابی صاحب کی موت کے بعد ہم لوگوں نے مختلف طریقوں سے انہیں یاد کیا۔ کبھی ہم نے ان کی یاد میں تعزیتی جلسے کئے تو کبھی مجلسیں ...... اب آپ "منبر کا دوسرا نام" شائع کر کے انہیں جس طریقے سے یاد کر رہے ہیں وہ بھی ہم سب کی ان سے والہانہ عقیدت کی دلیل ہے۔

ترابی صاحب کی موت پر کراچی میں جو کچھ ہوا سو ہوا لیکن میرے پاس ملک بھر سے اب تک یہ خبریں آ رہی ہیں کہ نہ صرف ملک کے بڑے بڑے شہروں میں بلکہ چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں میں بھی ترابی قصے سنایا جا رہا ہے۔

ترابی صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے قرآن تک نہیں بلکہ دلوں تک پہنچایا، ان کی اس خدمت کا یہی انعام ہے کہ ذکرِ حسینؑ کے ساتھ ساتھ اس ذاکرِ حسینؑ کا تذکرہ بھی ہوتا رہے گا، دنیا میں اعزاز بہت کم لوگوں کو ملتا ہے ــــ میں ابھی ترابی صاحب کے فرزند عزیزم عقیل ترابی سے کہہ رہا تھا کہ علامہ کی موت سے آپ ہی نہیں ہم جملہ مومنین بھی یتیم ہو گئے ہیں۔

میں لاہور، لائل پور، اور پشاور وغیرہ میں جب بھی علامہ مرحوم کے ساتھ ہوتا تھا تو لوگ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ علامہ جیسا عالم مشکل سے پیدا ہوتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا کرم تھا کہ اس نے ہمیں ترابی صاحب جیسا عالم عطا کیا تھا۔ اور اب یہ اس کی مرضی ہے کہ اس نے ترابی صاحب

کو ہم میں نہیں چھوڑا اور آج ان کی جدائی میں نہ صرف ان کے گھر والے بلکہ پورا قوم اشکبار ہے۔

ترابی صاحب کی خدمات اس سے بڑھ کر اور کیا ہوں گی کہ ان کی تربیت نے بڑے بڑے کارکن پیدا کئے، آج علامہ صاحب کی جدائی پر ان کے تمام رفیق اور عقیدت مند اسی لئے رو رہے ہیں کہ وہ نہایت شفیق، مہربان، بزرگ اور لاجواب عالم تھے۔ میں جب بھی پریشان ہوتا تو ان کے پاس چلا آتا تھا۔ ان سے مل کر قدرتی طور پر میرا غم اور میرا دکھ کم ہو جاتا تھا مجھے یاد ہے کہ جب روز عاشورہ ریڈیو، ٹی وی سے ترابی صاحب کی مجلس شام غریباں نشر ہوتی تھی تو لاہور میں علامہ مرحوم کی تقریر سننے کے لئے لوگوں کے مجمعے لگ جاتے تھے اور وقت مقررہ پر لوگ دیوانہ وار اپنی سماعت کی تسکین کے لئے ریڈیو یا ٹیلی ویژن کی طرف دوڑتے دکھائی دیتے تھے، آج اگر ترابی صاحب ہم میں ہوتے تو ہمارے بہت سے مسائل حل ہو جاتے لیکن ان کے بغیر تو جیسے ہم برگِ آوارہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں آپ کی کتاب کے توسط سے حکومت سے اپیل کروں گا کہ وہ ملتِ جعفریہ کے مسائل پر توجہ فرماتے، آج اگر ہم میں علامہ ترابی نہیں تو کیا ہوا، ان کی قوم اور ان کے طالب علم تو موجود ہیں، میری حکومت سے گزارش ہے کہ وہ ملک کے آئین اور ہمارے حقوق کی روشنی میں ہمارے مسائل اور مطالبات پر غور کرے اور اپنے فیصلے پر عمل کرے، نامعلوم کیا وجہ ہے کہ وزیر اعظم بھٹو کے فیصلہ کرنے کے باوجود حکومت کے دوسرے ذمہ دار لوگ ہمارے مطالبات میں تاخیر تا ترمیم کی کوشش کر رہے ہیں ـــــ مجھے امید ہے کہ وزیر اعظم بھٹو ہمارے مسائل حل کرانے کے سلسلے میں اپنے تدبر سے کام لے کر علامہ مرحوم کی خدمات کو سراہتے ہوئے ملتِ جعفریہ کو ممنون کریں گے۔

(رضا النقد نیا مال - ۱۷ دسمبر ۱۹۷۴ء)

پاکستان کا چراغ

آغا مسعود حسین

"کسی قوم کا جب کوئی عالم انتقال کر جاتا ہے تو اس قوم پر رحمت و برکت کم ہو جاتی ہے۔"
یہ کہاوت قدیم زمانے سے مشہور ہے۔ پاکستان میں علامہ رشید ترابی کی رحلت بھی کچھ اسی طرح ہے۔ ان کی موت میں ہم نے ایک ایسا منفرد اور عالم کھو دیا ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔

علامہ رشید ترابی صرف ایک خطیب ہی نہیں تھے بلکہ ان کے ذہن میں ملت اسلامیہ کو متحد کرنے اور اسلامی ملکوں کے مابین اتحاد کے فروغ کے واضح تصورات موجود تھے۔ علامہ صاحب نے اس کا اظہار کئی موقعوں پر اپنی نجی نشستوں میں اپنے احباب سے بھی کیا تھا اور مجلس کے دوران کسی موضوع پر تقریر کرتے ہوئے بھی وہ اپنی فکر کے اعتبار سے ان تمام مفکرین اسلام کے بہت قریب تھے جنہوں نے اپنے عہد میں ملت اسلامیہ کے اتحاد کے لئے کام کیا ہے یا پھر اس سلسلہ میں مسلمانوں کو فکری روشنی عطا کی ہے۔

پاکستان میں وہ ایک چراغ کی مانند تھے جو اپنی روشنی سے ہر خاص و عام کی فکری تاریکی کو دور کر رہا تھا۔ ایک ایسے دور میں جب اسلام کی صحیح ترجمانی مفادات اور سیاست کی نذر ہو گئی۔ علامہ رشید ترابی نے مصلحت سے بالاتر ہو کر فرقہ وارانہ عقیدوں کی دھند سے نکل کر مسلم اتحاد اور بھائی چارے کی بات کی ان کا یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کو برصغیر کے مسلمان کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔

علامہ رشید ترابی نے اپنی علمی اور سیاسی زندگی کا آغاز حیدرآباد دکن سے کیا جہاں انہوں نے اتحاد المسلمین کے پلیٹ فارم سے نواب بہادر یار جنگ کے شانہ بشانہ جدوجہد آزادی میں حصہ لیا۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ انہوں نے خطابت کی تربیت نواب بہادر یار جنگ سے حاصل کی بلکہ یہ درست ہے کہ اس زمانے میں ان کی تقریروں کا لب ولہجہ منفرد تھا خود نواب بہادر یار جنگ نے کئی موقعوں پر ان کی اس صلاحیت کی تعریف کی تھی۔ اتحاد المسلمین کے پلیٹ فارم پر انہوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی جگہ یہ نہیں ہے کیونکہ محض سیاسی نعرے کسی قوم کو تہذیبی اور عقلی زندگی عطا نہیں کرسکتے لہٰذا علم کی جستجو اور فکر کی پیاس میں وہ آبلہ پا لکھنؤ چلے گئے۔

لکھنؤ کی علم پرور فضا کے سائے میں انہوں نے اسلام کو سربلندی اور مصطفیٰ اور آلِ مصطفیٰ کی زندگی اپنے منفرد انداز میں ذاکری کا سلسلہ شروع کیا۔ لکھنؤ کی علم شناس سرزمین نے مستقبل کے اس عظیم خطیب کو پہچان لیا اور عقیدت مندوں نے محمدؐ و آلِ محمدؐ کے ترجمان کی حیثیت سے قبول کرلیا۔ یہ زمانہ برصغیر کے مسلمانوں کے لئے انتہائی پرآشوب دور تھا ایک طرف کانگریس ہندوستان کے عوام کی واحد ترجمان کی حیثیت سے برطانیہ سے ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ کررہی تھی۔ تو دوسری طرف مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کے معاشی، مذہبی اور ثقافتی حقوق کے لئے جدوجہد کرتے ہوئے علیحدہ ریاست کے قیام کا مطالبہ کررہی تھی۔ علامہ رشید ترابیؒ نے اپنے فکری دلائل میں مسلم لیگ کے موقف کی بھرپور تائید کی۔ انہیں اچھی طرح احساس تھا کہ برصغیر میں ہندو اکثریت کی ذات پات اور چھوت چھات کی تقسیم نے معاشرے کو مختلف مصیبتوں میں مبتلا کررکھا ہے۔ مسلمان اپنے عظیم تاریخی و مذہبی سرمایے کے ساتھ یہاں نہیں رہ سکتے۔ قائداعظم محمد علی جناح کی طرح علامہ رشید ترابی کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ ماضی میں جن مسلمان رہنماؤں نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوششیں کی ہیں اس کا نتیجہ کیا رہا۔ ۹ کانگریس کے پاس ہندوستان

کا وہ تصور تھا جو اگر اپنے حقیقی شکل اختیار کر لیتا تو شاید مسلمان آج ہندوستان میں اپنے فکری اور مذہبی سرمائے سے محروم ہو جاتے۔

ہندوستان کی تقسیم کے بعد علامہ ترابی پاکستان آگئے۔ اور کراچی میں اس وقت کے تاریک شہر سے علم کی روشنی بکھیرنے کا آغاز کیا۔

علامہ رشید ترابی گزشتہ ۴۰ سال سے اسلام قرآن حدیث کے مختلف پہلوؤں پر تقاریر کر رہے تھے۔ ان کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ علم میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا۔ اور ہر لفظ میں کسی نہ کسی پہلو سے تاریک ذہنوں کے لئے رہنمائی عطا ہوتی تھی ____

علامہ رشید ترابی نے برصغیر کے دیگر مذہبی رہنماؤں کی طرح حسین علیہ السلام کی شخصیت کو علم اور قرآن کے حوالوں سے ابدی بنا دیا ہے۔ حسین علیہ السلام کے مشن کو جس طرح علامہ رشید ترابی نے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہے اس سے پہلے پاکستان میں شاید کسی نے یہ انداز اختیار نہیں کیا لیکن حسین علیہ السلام کا ذکر کرتے وقت ان کے سامنے جس چیز کو اولین حیثیت حاصل تھی وہ اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کا اتحاد تھا جس کی خاطر محمدؐ کے نواسے نے میدان نینوا میں جام شہادت نوش کیا۔

علامہ رشید ترابی جس انداز سے محرم میں حسینؑ کا نام لیتے تھے شاید وہ آواز اب کبھی سنائی نہ دے ____ محرم آتے رہیں گے لیکن لوگوں کی سماعت رشید ترابی کی آواز کو ترسے گی۔ اور جب حسینؑ کا نام اس آواز کی لہروں میں نہیں سنائی دے گا۔ تو پھر دھڑکتے دل میں علامہ رشید ترابی کی آواز حسینؑ کا نام بن جائے گی۔

گزشتہ ۴۰ سال سے علامہ رشید ترابی اور محرم کی مجالس لازم و ملزوم چیزیں تھیں۔ وہ شام غریباں کا تذکرہ اس طرح کرتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زینب یہیں کہیں کھڑی ہوئی اپنی بھیگی ہوئی ردا میں منہ چھپائے اپنے سوگواروں کو دلاسے دے رہی ہیں۔ شام غریباں گزر جاتی تھی لیکن دل بے چین رہتا تھا۔ کیونکہ گزشتہ دو تین سال سے علامہ صاحب کی

صحت خراب رہنے لگی تھی ہر شخص یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں اس دفعہ محرم میں حسینؑ تو ہوں مگر علامہ رشید ترابی نہ ہوں۔ یہ خیال ہر عقیدت مند کو پریشان کرتا رہتا تھا ـــــ اور آخر وہ پریشان کن خیال حقیقت بن کر علامہ رشید ترابی کو ہم سے ہمیشہ کے لئے چھین لے گیا اب جب شام غریباں آئے گی تو علامہ رشید ترابی کی دوری کی آواز ہمیں حسینؑ کے غم میں روتی ہوئی محسوس ہوگی۔

لہجۂ عشقِ حسینؑ

یاور مہدی (ریڈیو پاکستان کراچی)

آواز کی دنیا ہمیشہ سے زندگی کی طرح رنگا رنگ ہے۔ کبھی نرم و شیریں، کبھی شعلہ بیانی، کبھی زندگی کی حرارت اور گرمی سے سیال، کبھی بارِ علم سے پُر وقار، کبھی تجربے کی آنچ سے کندن اور کبھی نصب العین کی سچائی کی امین، اور ہماری خوش قسمتی سے تاریخِ انسانی کے بہتے ہوئے دھارے میں بعض ایسے باکمال بھی پیدا ہوتے ہیں کہ ان سب کی وجہ کسی بڑے مقصد اور روشن نصب العین یا تاریخ کے کسی عظیم واقعہ یا المیہ کی طاقت ہوتی ہے۔

ایسی ایک آواز کی بازگشت آپ کو بھی سنائی دے رہی ہے اور ذہنوں کی بینائی آواز کی لہروں کے ساتھ ساتھ برقِ تاثیر کی چمک بھی دیکھتی ہے۔ اس روشنی میں ایک چہرہ بھی نظر آتا ہے اور آپ سب پہچانتے ہیں کہ یہ چہرہ کس کا چہرہ ہے۔

دل سوال کرتا ہے وہ کس کی آواز تھی کہ آواز کے زیر و بم سے ایثار و قربانی، ضبط و تسلیم، عشق و صداقت، اور شہادت و جاں سپاری کے جذبے جاگ گئے تھے جن سے ظلم و جبر کی زنجیریں پگھلتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں —— اس آواز نے کہاں سے تاثیر پائی تھی۔ کہ اس کا افسوں کبھی کم نہ ہوتا تھا —— وہ آواز دلوں میں گونج رہی ہے اور اس نصب العین کی وجہ سے ہمیشہ گونجتی رہے گی جس سے اس آواز نے زندگی بھر کا اور ابد تک کا رشتہ قائم کیا ——

جسم و جاں کے رشتے ایک عمر تک ہوتے ہیں اس کے بعد وفا نہیں کرتے۔ کتنی آوازیں زبان سے ابھر کر خلا میں ڈوب جاتی ہیں۔ لیکن ابھی سے ہم اور آپ یہ اندازہ بھی لگاتے ہیں کہ جو آواز ہمیشہ ہر شخص کے دل میں زندہ ہے۔ وہ شخصیت کی پہچان ہے۔ زندگی کے

تجربوں اور سچائیوں کی میزان ہے۔ کسی بہت بڑی صداقت نے اس کو ابدیت بخش دی ہے
اور وہ آواز خود اس صداقت کی ابدیت کا اعلان ہے ——

اس آواز کا نام ہے علامہ رشید ترابی۔ جن کی خطابت تند و تیز دریا کی طرح رواں تھی
—— اور بزرگوں کے ذکر کے وقت الفاظ خود احترام کی تصویر بن جاتے —— قدرتِ بیان ایسی
تھی کہ جس وقت اور جس لمحہ موضوع کو اختتام دینا ہوا۔ محسوس ہوتا کہ اس موضوع پر جو الفاظ
ادا کئے گئے وہی حرفِ آخر تھے —— وقت کی اتنی شدید پابندی موضوع پر ایسی گہری گرفت،
بیان کی ایسی تاثیر، الفاظ میں اتنی جامعیت، شاذ و نادر ہی کسی با کمال کو نصیب ہوئی ہے۔
واقعہ کربلا ہمیشہ بیان کیا جائے گا۔ دل اس المیہ سے ہمیشہ رشتہ استوار رکھیں گے۔
لیکن یہ رشتہ جتنا مضبوط ہے۔ اتنا ہی ان آوازوں کا زیر و بم بھی یاد آتا ہے جنہوں نے
دلوں کو غم و الم سے بھرا اور آنکھوں کو مجبور کیا کہ المیہ کربلا پر سچے موتی نچھاور کرتے رہیں ——
ایسی آوازوں میں علامہ رشید ترابی کی آواز بے حد منفرد اور مستند تھی ——

نبض آشنا

حسین اعظمی

میں ان خوش قسمت لوگوں میں سے نہیں ہوں جنھیں علامہ ترابی کو متعدد بار بہت قریب سے دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ میں اپنی ساری زندگی میں ان سے صرف تین یا چار بار ملا ہوں۔ اس لئے میں علامہ موصوف کی شخصیت کے بارے میں کوئی بات اپنے مشاہدے یا تجربے کی روشنی میں کہنے کا مجاز نہیں۔ میں نے انہیں سب سے پہلے ۱۹۴۳-۴۴ء میں لکھنؤ کے ناظم علی خان کے امام باڑے میں مجلس پڑھتے دیکھا تھا۔ میرے مرحوم عزیز ترین دوست سید اعظم حیدر کے چچا حکیم صاحب عالم صاحب نے ان کی لکھنؤ میں آمد پر ایک مجلس منعقد کی تھی جس میں میں بھی شریک ہوا تھا۔ اس وقت علامہ ترابی، رضا حسین رشید ترابی بی۔ اے (عثمانیہ) کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ اس وقت تو مجھے ان کی خطابت کا انداز خاصا اکھڑا اکھڑا لگتا تھا۔ بعض لوگوں نے انہیں بہت پسند کیا تھا کیوں کہ ان کا اندازِ خطابت اور موضوع دونوں اس دور کی منبر کی خطابت سے مختلف تھے۔ لیکن مجھے ان کی خطابت نے بالکل متاثر نہیں کیا تھا۔ اس وقت میری عمر ۱۵-۲۰ سال ہوگی۔ اور میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا۔ لیکن کم عمری میں مذہب اور سیاست میں غیر معمولی دلچسپی لینے کی وجہ سے مجھے مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت نہرو، ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی (صدر آل انڈیا ہندو مہاسبھا) کانگریسی رہنما اچاریہ نریندر دیو (جو بعد میں لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے) راجہ غضنفر علی خان، مولانا ظفر علی خان، خان عبدالقیوم خان، مولانا کلب عباس ایڈوکیٹ، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا جمال میاں فرنگی محلی، کمیونسٹ لیڈر، ڈاکٹر زیڈ۔ اے احمد، علی سردار جعفری، مولانا قیوم کانپوری، مولانا صبغۃ اللہ

شبیہ انصاری فرنگی محلی، پروفیسر احتشام حسین، عطاء اللہ شاہ بخاری، مولوی علی حمید رکا کلب مصطفیٰ ایڈووکیٹ اور ذاکروں میں حکیم مرتضیٰ حسین الہ آبادی، ابنِ حسن صاحب نونہروی، السید محمد صاحب دہلوی، السید ابنِ حسن صاحب جارچوی، السید کلب حسین صاحب مجتہد العصر اور بشیر خطیبوں، واعظوں اور ذاکروں کو سننے کا موقع مل چکا تھا۔

اس کے بعد علامہ ترابی کو میں نے کراچی میں غالباً ۱۹۵۰ء میں محفل شاہ خراسان میں سنا۔ اس مرتبہ ان کی خطابت نے مجھے پہلے کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ متاثر کیا۔ کیوں کہ ان کا لہجہ ان کے الفاظ وتراکیب، ان کا اندازِ بیان اور موضوعات منبر کے روایتی اندازِ خطابت سے مختلف تھے۔ اس کے باوجود میں ان کا پرستار نہ بن سکا۔ ممکن ہے اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ چونکہ میں نے لکھنؤ میں آنکھ کھولی تھی۔ ہوش سنبھالا تو لکھنؤ اسکول کی ذاکری اپنے عروج پر تھی اس لئے میرے دل ودماغ پر اسی مکتبۂ ذاکری کا گہرا اثر تھا۔ لیکن غیر شعوری طور پر میں بھی اور میرے متعدد ہم خیال دوست بھی علامہ کی خطابت کو غیر معمولی اہمیت دینے لگے تھے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہم لوگ فرصت کے اوقات میں ان کے اندازِ خطابت کی نقل کرتے اور گھنٹوں ہنستے رہتے۔ یہ بات اس زمانے کی ہے جب امروز کراچی سے نکلنا شروع ہوا تھا میرے دوست ابراہیم جلیس، حبیب الرحمان جو آج کل ہفت روزہ اخبارِ جہاں کراچی کے لئے راولپنڈی سے ایک کالم "دارالحکومت سے ایک خط" کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں، انیس ہاشمی، طفیل احمد خان، قاضی ابرار صدیقی اور ظہیر بابر جو آج کل امروز لاہور کے چیف ایڈیٹر ہیں، اسیکلوڈ روڈ پر واقع گرانڈ ہوٹل میں رہتے تھے اور اسی ہوٹل میں امروز کا دفتر تھا۔ صبح ناشتہ پر میں اور حبیب الرحمان علامہ ترابی کی مجلس کی نقل اتارتے تھے۔ یہ بات بظاہر تو ہنسی کی ہے لیکن اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کا طرزِ خطابت کس طرح نجی محفلوں میں موضوعِ سخن بنتا تھا۔ اور مقبول ہوتا جارہا تھا۔ رفتہ رفتہ علامہ کا اندازِ خطابت ہی معیارِ خطابت قرار پایا۔ حالانکہ وہ نہ تو قافیہ پیمائی کرتے تھے۔ نہ ضلع جگت استعمال کرتے تھے۔ نہ رعایت لفظی کے گل بوٹے اپنی تقریر کے دامن میں ٹانکتے اور نہ

تھے۔ دراصل اس قسم کی صنعت گری بلکہ کاریگری ایسے لوگ کرتے ہیں جن کے دامن میں کچھ نہیں ہوتا۔ جن کو اپنی کم مائیگی کا خود احساس ہوتا ہے جو یہ جانتے ہیں کہ ان کی باتیں وزنی نہیں ہیں۔ اس لئے وہ اپنی خطابت کے بھدے اور بے ہنگم جسم کو ان مصنوعی زیوروں اور رنگین الفاظ کے ملبوسات میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں کو بہت سی کام کی باتیں اور دقیق خیال پیش کرنے ہوتے ہیں اور علم و حکمت اور فلسفے کے مسائل عوام تک پہنچانا چاہتے ہیں وہ لوگ کم سے کم تصنع سے کام لیتے ہیں۔ تاکہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ ان کے سامعین اور قارئین تک پہنچ سکے۔ اور وہ اسے آسانی سے سمجھ سکیں۔ یہی حال خطابت کا ہے۔ اور یہی حال شاعری کا ہے۔ جس شاعر یا متشاعر کی گرہ میں کچھ نہیں ہوتا وہ الفاظ سے کھیلتا ہے۔ اور لفظوں کے طوطا مینا بنا کر لوگوں کی توجہ کو اپنی دانست میں اپنی طرف مبذول رکھتا ہے۔

علامہ نے کبھی لفظی شعبدہ گری نہیں کی۔ ایک لفظ بھی بلا ضرورت استعمال نہیں کیا۔ حالانکہ وہ خود بہت اچھے شاعر تھے۔ اور اگر منبر پر شاعری کرتے، تب بھی لوگوں سے داد تحسین حاصل کر لیتے۔ ان کی خطابت کے اس انداز نے ان کے حریفوں سے بھی ان کی خطابت کا لوہا منوا لیا۔ اور اب وہ اس منزل پر پہنچ گئے تھے کہ ان کی زبان سے نکلا ہوا لفظ ان کا انداز بیان، ان کا طرز ادائیگی، خطابت کا معیار کمال بن گیا تھا۔ اور مجھ جیسا سرکش انسان بھی ان کی خطابت اور علمیت کا دل سے قائل ہو گیا۔ جس کو یہ غرہ تھا کہ اس نے برصغیر کے نامور خطیبوں اور شعلہ نوا مقرروں کی تقریریں بارہا سنی ہیں۔ ان میں سے بہتوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ بعض بزرگوں سے میں بہت بے تکلف تھا۔ کئی ایک سے تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن جب میں نے علامہ کی متعدد مجالس نہایت توجہ سے سنیں۔ اور ایک مخالف بن کر سنیں تو علامہ کی خطابت، علمیت اور ہمہ دانی کا دل سے قائل ہونا پڑا۔

میں سمجھتا ہوں کہ مجھ جیسے ہزاروں افراد ایسے ہوں گے جو شروع شروع میں علامہ کی ہمہ گیر شخصیت غیر معمولی خطیبانہ صلاحیتوں اور علمیت کے قائل نہ ہوں گے۔ بلکہ علامہ کی جادو بیانی نے

بشدت ان کے دلوں کو مسخر کیا ہوگا۔ اور آج لاکھوں بلکہ کروڑوں افراد میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ملے جو ان کی خطیبانہ عظمت اور سحر بیانی کا دل سے قائل نہ ہو۔

علامہ رشید ترابی برصغیر کے ان گنے چنے چار یا پانچ ممتاز خطیبوں میں سے ایک تھے جو بیک وقت بہترین خطیب، صاحبِ طرز ادیب، خوش فکر و خوش گو شاعر، بے باک صحافی اور بہترین مترجم تھے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اس فہرست میں صرف پانچ نام شامل کئے جا سکتے ہیں۔ ۱۔ مولانا ابو الکلام آزاد جو واقعی ابو الکلام تھے۔ ان کی خطابت بھی ان کی نثر کی طرح ان کی ہمہ جہت علمی شخصیت کا آئینہ دار تھی۔ وہ بیک وقت ادیب، خطیب، بلند پایہ صحافی، عالم دین اور مفسر قرآن کریم تھے۔ لیکن وہ شاعر نہ تھے۔ ممکن ہے انہوں نے تفننِ طبع کے طور پر کبھی شعر کہے ہوں۔ لیکن شاعر کی حیثیت سے ان کا درجہ زیادہ بلند نہیں۔

۲۔ مولانا محمد علی جوہر، شعلہ نوا خطیب اور بے باک صحافی اور ادیب تھے۔ اور بہت اچھے شاعر تھے۔ لیکن ان کے قلم میں آگ بھری ہوئی تھی۔ دہکتی ہوئی آگ۔ وہ شعلہ نوا ہی نہ تھے بلکہ شعلہ نگار بھی تھے۔ اس کے علاوہ ان میں ایک ممتاز خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ بڑے حاضر جواب تھے اور ایسا فقرہ چست کرتے تھے کہ محفل زعفران زار بن جاتی۔ لیکن دینی علوم و تفسیر وغیرہ میں ان کی شخصیت کو سند کی سی حیثیت حاصل نہ تھی۔

۳۔ مولانا ظفر علی خان بھی اپنے دور کے زبردست خطیب، ادیب، شاعر، صحافی اور مترجم تھے مشکل سے مشکل زمینوں میں ایسی روانی سے مشکل سے مشکل قافیہ نظم کر جاتے کہ اہلِ علم اور اہلِ ذوق انگشت بدنداں رہ جاتے۔ مترجم کی حیثیت سے بھی ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ انگریزی کی مشہور کتاب "ڈوشی" اور "ریٹرن آف شی" کا انہوں نے نہایت سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کیا تھا۔ یہ دونوں ترجمے "عذرا" اور "عذرا کی واپسی" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں جس پر اہلِ ذوق حضرات آج بھی سر دھنتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے علامہ شبلی نعمانی کی شہرہ آفاق کتاب "الفاروق" کا بامحاورہ انگریزی میں "عمر دی گریٹ" کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود مولانا ظفر علی خان

کی حیثیت عالم دین کی سی نہیں تھی۔ اور نہ دینی مسائل اور علوم مثلاً تفسیر قرآن اور علم حدیث میں ان کو کوئی بلند مقام حاصل تھا۔

۴۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ایک بلند پایہ خطیب، اچھے ادیب، اعلیٰ درجہ کے صحافی، محقق، مورخ، محدث، اور مفسر قرآن ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے بلامبالغہ لاکھوں ذہنوں کو متاثر کیا ہے۔ لیکن شاعری کے معاملے میں وہ بالکل کورے ہیں۔

۵۔ علامہ رشید ترابی برصغیر کے موجودہ تمام خطیبوں میں سب سے زیادہ مقبول تھے۔ وہ بیک وقت نفیس شاعر، اعلیٰ درجے کے ادیب اور صحافی تھے۔ مترجم کی حیثیت سے بھی ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ انہوں نے مالکِ اشتر کے نام حضرت علی علیہ السلام کے طویل مکتوب کا براہ راست عربی زبان سے بامحاورہ انگریزی میں جو ترجمہ کیا ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں عربی اور انگریزی زبانوں پر کتنا عبور حاصل تھا۔ اسی طرح انہوں نے انگریزی کے ایک دو علمی مقالات کا اردو میں سلیس ترجمہ کیا ہے۔ جو کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ علم حدیث اور تفسیر قرآن میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ ہر سال اپنی قیام گاہ پر رمضان کے پورے مہینے تفسیر قرآن بیان فرماتے تھے۔ جن لوگوں کو ان اجتماعات میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ حضرات میرے اس خیال کی بھرپور تائید کریں گے کہ قرآن کے معنی و مطالب اور تفسیر پر ان کی کتنی گہری نظر تھی۔ علم الرجال میں انہیں سند کی حیثیت حاصل تھی۔ بحیثیت شاعر ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ انہوں نے فارسی اور اردو کی ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے، کیا غزل، کیا سلام کیا قصیدہ، کیا مسدس، کیا مثنوی، کیا رباعی اور کیا قطعات۔ ان کا مجموعۂ کلام جب منظرِ عام پر آئے گا اس وقت لوگوں کو ان کی شاعرانہ عظمت، قادر الکلامی اور اہمیت کا اندازہ ہو گا۔ ابھی تک تمام لوگ انہیں صرف ایک عظیم خطیب اور عالم دین کی حیثیت سے جانتے ہیں۔

خطیب کی حیثیت سے علامہ ترابی نے جو منفرد اور ممتاز مقام حاصل کیا اس کا ایک سبب تو وہ تھا جو ایک مرتبہ علامہ ابن حسن جارچوی مرحوم نے بتایا تھا کہ علامہ ترابی نے مجلس کو جو امام باڑوں

کی چار دیواری میں محصور ہو کر رہ گئی تھی۔ پبلک میٹنگ بنا دیا ہے۔ چونکہ انہوں نے منبر کی خطابت اور سیاسی پلیٹ فارم کی خطابت تقریباً ایک ساتھ شروع کی تھی۔ اس لئے وہ عوام الناس کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس لئے انہوں نے ذاکری کو بالکل نیا رنگ دیا۔ غالباً وہ پہلے ذاکر یا خطیب تھے۔ جنہوں نے ایک موضوع پر مجالس پڑھنا شروع کیں۔ مسلسل دس روز تک ایک موضوع پر تقریر کرتے تھے۔ اور موضوع کے تمام پہلو شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ ان سے پہلے غالباً خطیبانِ کرام اپنے عشرہ میں کسی ایک موضوع پر مسلسل مجالس نہیں پڑھتے تھے۔ ممکن ہے ان سے پہلے دوسرے خطیبوں نے بھی یہ طریقہ اختیار کیا ہو۔ مجھے کم از کم اس کا علم نہیں۔ اس راہ کو اختیار کرنے میں انہیں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ اس کا اندازہ شاید اب ہم نہ کر سکیں۔ کیونکہ روایتی انداز سے ہٹ کر نیا انداز اختیار کرنے کے لئے بہت زیادہ خود اعتمادی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ ہمارے معاشرے میں ہر نئی آواز کو خواہ وہ بعد میں کتنی ہی مقبول کیوں نہ ہو جائے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ بالخصوص ان لوگوں میں جو روایتی انداز کی مجلس سننے کے برسہا برس سے عادی ہوں ظاہر ہے کہ علامہ کو اس سلسلے میں نئے سامعین پیدا کرنے ہوں گے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ شروع میں لوگوں کو جن میں میں بھی شامل ہوں ان کا اندازِ خطابت اجنبی سا لگا ہوگا۔ بالفاظ دیگر انہیں اپنی بات کہنے اور لوگوں کے دلوں میں کانوں کے ذریعہ اتارنے کے لئے نئے ذہن تشکیل کرنے پڑے ہوں گے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ لیکن علامہ کو اس سلسلے میں ایک بات پر ضرور حاصل ہوئی۔ وہ یہ کہ فطرتاً انسان ایک طرح کی چیزوں سے اکتا جاتا ہے۔ نئی نسل تو بالعموم پرانے انداز کو یوں بھی پسند نہیں کرتی۔ کہ ماحول اور تعلیم کے انداز بدل جانے کی وجہ سے وہ پرانی باتوں کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتی۔ اور جو چیز کسی شخص کی سمجھ میں نہیں آتی اس میں اسے دلچسپی نہیں رہتی۔ اس لئے اس کی طبیعت پرانے طرز کی خطابت اور ذاکری سے اوبھ گئی تھی۔ علامہ چونکہ جدید اور قدیم دونوں علوم سے واقف تھے۔ لہٰذا انہوں نے ایک طرف منبر کی خطابت کی روایت بھی برقرار رکھی۔ اور دوسری طرف موجودہ حالات اور مسائل کو پرکھا۔ مغربی طرز فکر، مغربی فلسفے کا تنقیدی جائزہ لیا اور

اس کا تقابل اسلام کے نظریۂ حیات سے کیا۔ اسلام کا فلسفہ لوگوں پر واضح کیا اور مغرب زدہ لوگوں کو بتایا کہ وہ محض اپنی کم علمی کی وجہ سے مغرب کے طرزِ فکر سے غیر معمولی طور پر متاثر ہو کر اسلام کو حقیر سمجھتے ہیں۔ چونکہ منبر کے پرانے خطیب جدید علوم سے مغربی فلسفہ، مغربی نظریہ جات سے واقف نہیں تھے۔ اس لئے وہ ان پر نہ تو کما حقہ بحث کر سکتے تھے، نہ ان کی خامیاں اجاگر کر سکتے تھے اور نہ ان کا تقابل اسلام سے کر پاتے تھے۔ ان ذاکروں کی دلیلیں بھی ان مفروضات پر مبنی ہوتی تھیں۔ جو بعد کی علمی تحقیقات سے غلط ثابت ہو چکے تھے۔ اس لئے نئی روشنی کے لوگوں کو ان کی دلیلوں اور مثالوں میں نہ تو تازگی نظر آتی تھی اور نہ وہ دل کو لگتی تھیں۔ ان کے علاوہ کچھ ذاکر ایسے میدان میں آئے جو مغربی علوم سے واقف تھے۔ لیکن اسلامی علوم سے عربی نہ جاننے کی وجہ سے براہ راست واقف نہ تھے۔ اس لئے حدیث اور قرآن کا حوالہ ترجموں کی مدد سے دیتے تھے اور وہ اسلام کی صحیح روح پیش کرنے سے قاصر رہتے تھے۔ علامہ چونکہ عربی، فارسی، اسلامی علوم، تاریخ، حدیث اور تفسیر کے عالم تھے۔ اور مغربی فلسفے اور علوم سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ اس لئے وہ اس دور کے تعلیم یافتہ، ژولیدہ فکر نوجوانوں کی ذہنی تسکین، معقول اور ٹھوس دلائل اور ناقابلِ تردید شواہد کے ذریعہ کرتے تھے۔ ان کی مجالس اور خطبات سنتے سنتے ان کے سامعین ان کی خاص اصطلاحوں، خطابت کے لب و لہجہ اور ان کی اپنی تراکیب الفاظ کے مالہ و ماعلیہ کو اچھی طرح سمجھ لیتے تھے۔ بلکہ اشاروں کنایوں کو بھی بخوبی سمجھتے تھے۔

علامہ ترابی کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ انہوں نے منبر کو مقامِ رسالت کی تشریح کا ذریعہ بنایا اور لوگوں کو یہ بتایا کہ توحید کے بعد اسلام کا دوسرا اہم ستون رسالت ہے اور شہادتِ عظمیٰ اس ستون کو مستحکم کرنے کی ایک عملی کوشش ہے۔ اور سانحہ کربلا نے توحید کے تصور اور مقامِ رسالت کو مسخ کرنے کی کوششوں کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سدباب کر دیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی مجالس میں ہر مکتبۂ فکر کے لوگ بکثرت آتے ان کی خطابت اور علمیت سے کسب فیض کرتے تھے اور اس طرح انہوں نے پیغامِ کربلا کو ان دلوں اور گھروں تک پہنچا دیا جو اس واقعہ

کی اہمیت و عظمت اور افادیت کے دل سے قائل نہ تھے۔ علامہ نے اس بات کی ہمیشہ کوشش کی کہ وہ جس بات کو صحیح اور حق سمجھیں اس کا برملا اظہار کریں۔ لیکن لب و لہجہ دل پذیر اور اندازِ بیان شگفتہ ہو۔ لب و لہجہ کی کرختگی سے بعض اوقات ٹھوس دلیلیں بھی لوگ ماننے کو تیار نہیں ہوتے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ایک اعلیٰ درجے کے خطیب کے لئے جن چیزوں کا ہونا اہلِ علم کی نظر میں نہایت ضروری ہے۔ وہ تمام چیزیں علامہ میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ مثلاً۔ ۱۔ دل آویز شخصیت۔ ۲۔ دلنشیں آواز۔ ۳۔ غیر معمولی علمیت اور وسیع معلومات۔ ۴۔ حافظہ۔ ۵۔ استحضارِ علم یعنی عین موقع پر واقعات اور حقائق کا یاد آنا۔ ۶۔ معلوم حقائق سے نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت۔ ۷۔ زبان و بیان پر غیر معمولی عبور۔ ۸۔ عوام الناس کی نفسیات کا بھرپور علم۔ ۹۔ سامعین حاضرین کے علمی و ذہنی سطح اور تاریخی پس منظر کا علم۔ ۱۰۔ جس موضوع پر انسان تقریر کر رہا ہو اس پر مکمل دستگاہ۔ ۱۱۔ شاعرانہ ذوق اور اشعار کے برمحل استعمال کی صلاحیت۔ علامہ ترابی میں جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ یہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ آواز کے اتار چڑھاؤ کے ماہر تھے اور اس کی اہمیت سے بھی بخوبی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کہاں آواز اونچی کرنے سے کیا تاثر ہوگا۔ اور کہاں آواز کم کرنے سے کیا اثر ہوگا۔ کہاں صرف ہاتھ اٹھا دینے یا انگلی کے اشارے سے کیا کام لیا جاسکتا ہے۔ وہ بہت سی ناگفتنی باتوں کو زبان سے ادا کرنے کی بجائے انگلیوں کے اشاروں اور محض آواز کے اتار چڑھاؤ سے ادا کر دیتے تھے۔ اور سامعین سمجھ جاتے تھے کہ ان کا مقصودِ ذہنی کیا ہے۔ لیکن اس قسم کا کمال حاصل کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ بقول شاعر۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

دورانِ تقریر شعر کے برمحل استعمال پر علامہ کو غیر معمولی دستگاہ حاصل تھی۔ تقریر کے دوران شعر کے استعمال سے تقریر میں کیسی جان پڑتی ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو حسبِ ذیل واقعہ سے ہوجائیگا ۱۹۴۶ء میں لکھنؤ کے مشہور امین الدولہ پارک میں مسلم لیگ کا جلسہ عام ہو رہا تھا۔ اس سے

ایک دن پہلے اسی جگہ کانگریس کا جلسۂ عام ہوا تھا۔ اس جلسہ میں کانگریسی رہنماؤں نے "نیشنلسٹ مسلمانوں" کی بڑی تعریف کی تھی۔ اور انہیں محبِ وطن، کانگریس کی آنکھوں کا تارا اور خدا جانے کیا کیا کہا تھا۔ مسلم لیگ کے ایک مقامی رہنما مسٹر نسیم قریشی جو بہت اچھے مقرر تھے۔ بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرار مقرر ہو گئے تھے۔ تقریر کر رہے تھے۔ تقریر کرتے کرتے انہوں نے نیشنلسٹ مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔ مجھے معلوم ہے کہ کل کانگریسی رہنماؤں نے آپ کو عرشِ معلیٰ پر چڑھایا ہے۔ اور اپنی جان و دل بتایا ہے۔ لیکن۔ ؎

غیر نے تم کو جاں کہا سمجھے بھی کچھ کہ کیا کہا،
یعنی کہ بے وفا کہا اب ان کا اعتبار کیا،

اس شعر نے جلسے کا رنگ بدل دیا۔ حالانکہ حکیم ناطق لکھنوی کا یہ شعر روایتی انداز کی غزل کا ایک معمولی درجہ کا شعر ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ علامہ ترابی کو اس فن میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ ادیبوں میں اس فن کے ماہر شبلی نعمانی تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی مضمون کے بیچ میں شعر ٹانک دیتے تھے۔ مضمون کے چہرے پر نکھار آ جاتا۔ اسی طرح علامہ ترابی تقریر کے دوران جہاں شعر چسپاں کر دیتے معلوم ہوتا کہ یہ شعر اسی موقع کے لئے کہا گیا تھا۔ یہ بات صرف اس شخص کو نصیب ہو سکتی ہے جو خود صرف اچھا شاعر ہو۔ بلکہ اس میں شعر فہمی کا سلیقہ بھی ہو۔

جن لوگوں نے علامہ کو قریب سے دیکھا ہے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ علامہ نہایت دلآویز شخصیت کے مالک تھے۔ تنگ نظری یا تنگ دلی ان میں نام کو نہیں تھی۔ ہر نقطۂ نظر کو فراخدلی سے سنتے، سمجھنے کی کوشش کرتے اور پھر رائے قائم کرتے۔ دراصل وہ بنیادی طور پر شاعر اور ادیب تھے۔ اور شاعر اور ادیب کا ذہنی افق بہت وسیع ہوتا ہے۔ اس کے دل میں رنگ و نسل، علاقے اور وطن، فرقے اور ذات کے جھگڑے آباد نہیں ہوتے۔ وہ بنی نوع انسان کا دوست ہوتا ہے۔ چونکہ علامہ ایک طرف شاعر و ادیب تھے اور دوسری طرف پیغامِ محمدی کے ترجمان تھے۔ اس لئے ان کے دامن کو تنگ نظریوں کی ہوا تک نہیں لگی تھی۔ علامہ ترابی جیسے لوگ صدیوں میں خال خال پیدا ہوتے ہیں

انقلابی خطیب

ناصر زیدی (مدیر ادبِ لطیف لاہور)

علامہ رشید ترابی سے پہلی مختصر مگر یادگار ملاقات تبھی نصیر ترابی نے خالق دینا ہال میں کرائی، یہ ایک عظیم اجتماع تھا۔ میں اتفاق سے ان دنوں کراچی آیا ہوا تھا، غالباً یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے ـــــ انہی دنوں "ادبِ لطیف" کا معرکہ آرا غالب نمبر شائع ہوا تھا۔

برادرم نصیر ترابی کے ہمراہ خالق دینا ہال میں پہنچا، مجلس شروع ہونے سے پہلے ایک کمرے میں چائے پر بیٹھے تو نصیر ترابی نے تعارف کرایا وہ بابا یہ میرے دوست ناصر زیدی ہیں، یہ "ادبِ لطیف" لاہور کے مدیر" ـــــ

علامہ رشید ترابی مرحوم نے بڑے تپاک اور ساتھ ہی مشفقانہ انداز میں اس طرح گرم جوشی سے ہاتھ ملایا جیسے پہلے سے نام سے شناسا ہوں، پھر کچھ دیر ادب و شعر کی گفتگو رہی، کچھ یگانہ چنگیزی کا تذکرہ رہا۔ میرا حال ایک انتہائی متاثر ہونے والے نیازمند کا تھا۔ ان کی گفتگو کا جادو، ان کی شخصیت کا سحر، لب کشائی کی جراٴت ہی نہ دیتا تھا، ـــــ

اس اولین ملاقات کا افسوں ہنوز طاری ہے ـــــ میری ناچیز رائے میں علامہ مرحوم کی بحیثیت خطیب سب سے بڑی خوبی ان کی تقریر کا تاریخی تسلسل اور مدلل اندازِ بیان تھا۔ وہ اپنی مدلل، پُراثر، سحر انگیز اور تاریخ کا تسلسل لئے ہوئے تقریر کے ساتھ ساتھ ـــــ سامع کو لے کر چلتے تھے ـــــ اور موضوع کی وحدت

لڑائیوں تک برقرار رکھتے تھے رہا کسی خامی کا سوال، سو یہ تو علمائے کرام جانیں، میں نے تو بحیثیت طالب علم کی حیثیت سے مرحوم ترابی صاحب کو سنا، اور ان کی تقریر میں ہمیشہ نیا مضمون اور نیا موضوع پایا۔

یقیناً میرے دوست امیر حسین نے صحیح کہا کہ اگر وہ شاعری ہی کرتے تو واقعی عظیم شاعروں میں شمار ہوتے۔ مجھے ان کا کچھ کلام محترم علامہ عباس حیدر عابدی صاحب سے سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور اسے سن کر اندازہ ہوا مرحوم بلاشبہ ایک بلند پایہ غزل گو بھی تھے۔ اکثر یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ علامہ مرحوم مسلمانوں کے صرف ایک ہی فرقے کی نمائندگی کیا کرتے تھے میرے خیال میں ایسا نہیں ہے اس لئے کہ میں نے علامہ مرحوم کی مجالس ہر طبقہ خیال کے لوگوں کو بڑی تعداد میں سنتے دیکھا ہے ـــــ وہ اختلافی مسائل براہ راست کبھی نہیں ابھارتے تھے۔ ان کی تقاریر کے خاص اشارے سمجھنے والے سمجھتے تھے، مگر عام سننے والے کی کسی قسم کی دل آزاری کا کوئی پہلو نہیں نکلتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علمی و ادبی سطح پر ہر فرقے، اور ہر مکتب فکر کے لوگوں میں آپ مقبول و محترم تھے۔

"عالم اسلام کے علمائے کرام میں ترابی صاحب کو کس درجے پر فائز کیا جاسکتا ہے"؟ ـــــــ اس کا تعین تو میری بساط میں نہیں۔ مگر اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ علامہ حافظ کفایت حسین مرحوم کے بعد علامہ ترابی اس عظیم خطۂ پاک کے سب سے بڑے عالم اور مقرر تھے۔ اور ان کے بعد ان کا ہم پلہ عالم و مقرر اور کوئی نہیں۔

پاکستان میں ترابی صاحب کی ۲۷ سالہ خدمت کا نتیجہ وقتی طور پر بظاہر نظر نہ آئے مگر تاریخ بتائے گی کہ انہوں نے ذہنوں میں انقلاب برپا کیا ہے، ان کی خدمات حسینؑ کے نام لیوا کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

ایک رہنما ایک خطیب

ملکہ بلتستانی

میرے نزدیک دنیا کا مشکل ترین کام اپنی پسندیدہ شخصیت پر کچھ لکھنا ہے ۔ امیر حسین صاحب نے ترابی صاحب مرحوم پر کچھ لکھنے کی دعوت دے کر مجھے گویا روحانی اذیت میں مبتلا کر دیا ہے ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ علامہ مرحوم پر کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں ۔ ؟ بہرحال جہاں تک ممکن ہوا یہ فریضہ انجام دینے کی کوشش کرتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

حضرت علامہ رشید ترابی کی شخصیت ایسی بھرپور اور متاثر کن تھی کہ کوئی شخص جب بھی ان سے ملتا تھا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا ۔

وہ سراپا تحریک تھے اور ان سے ہر ملاقات میں یہی محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ان سے مل کر بہت کچھ مل گیا ہو ۔ ان کی گفتگو سن کر روح کو ایک فرحت اور عقل و دانش کو زندگی ملتی تھی ۔

ان کی ناراضگی میں بھی ایک بڑائی اور مٹھاس کا احساس ہوتا تھا ۔ میں نے ان کی شفقت اور ناراضگی دونوں کا لطف اٹھایا ہے اور محسوس کیا ہے کہ وہ ناراض ہونے کے بعد بھی اپنی وضع داری کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے کہ جس سے ناراض ہو رہے ہیں اس کا مقام اور مرتبہ کیا ہے ۔ ان کا دل ایک مومن کا دل تھا اور ان کی ناراضگی وقتی اور ناپائیدار ہوتی تھی ۔

چونکہ سیاست سے بھی مجھے کسی حد تک وابستگی رہی ہے اس لئے اکثر ترابی صاحب کے بارے میں مجھ سے شیعہ ہونے کے ناطے، وہی کچھ پوچھا جاتا تھا۔ جو آج اتفاق سے فون پر امیر حسین صاحب بھی پوچھ بیٹھے ہیں کہ آپ کے خیال میں مرحوم نے عملی سیاست میں حصہ کیوں نہیں لیا۔؟ ——— قارئین اکرام جہاں تک میرا ذاتی خیال ہے اس کی رُو سے اس سوال کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ مرحوم سیاست کو زندگی میں اس لئے شامل کرنا نہیں چاہتے تھے کہ اوّل وہ ایک مکتبِ فکر اور عقیدے کے مقرر تھے جہاں سیاست کے جھمیلوں میں پڑنے سے ہر ممکن گریز کیا جاتا ہے، دوسرے وہ اپنی بے پناہ مقبولیت کو عہدوں کے عوض کیش نہیں کرانا چاہتے تھے، ان کی تمام زندگی ہمارے سامنے ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ملتِ جعفریہ کی اکثریت ان کے ایک اشارے پر مر مٹنے کو تیار ہو جاتی تھی لہٰذا اگر وہ عملی سیاست میں حصہ لیتے تو پھر، اس منبر سے جس کا آج کوئی ثانی نظر نہیں آتا علامہ رشید ترابی نہیں کوئی اقتدار کا متوالا ہی بولتا، اور اس کی خطابت کے ہر رُخ پر سیاست مسلط ہوتی۔ لیکن صد شکر کہ ایسا نہیں تھا بلکہ ترابی صاحب تاحیات صرف اور صرف ایک ذاکر حسینؑ کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا کرتے رہے، مجھے علامہ مرحوم کی وہ مجالس بھی اچھی طرح یاد ہیں جو وہ نو محرم الحرام کو نشتر پارک میں پڑھا کرتے تھے، میں نو تاریخ کی مجلس سننے کے لئے اکثر مردوں کا مجمع ملا کرتی تھی، نو تاریخ کی مجلس ان کی تمام تقریروں کا نچوڑ ہوا کرتی تھی، اس میں وہ حکومت کے حسنِ انتظام کا شکریہ ادا کرتے تھے، اخبارات کو ہدیۂ تشکر پیش کیا کرتے تھے، اور اربابِ حکومت کی کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ——— سوگوارانِ حسینؑ سے ہمیشہ یہ اپیلیں کیا کرتے تھے کہ انہیں آج کے دن سر جھکا کر کھڑا ہونا اور حسینیہ ایرانیان تک جانا ہے، کوئی تمہیں پتھر بھی مارے تو اس کا جواب

اس لئے نہ دینا کہ کوفے کے بازار میں تمہاری بی بی زینب کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا تھا، تراب صاحب مرحوم کہا کرتے تھے کہ تمہیں حسینؑ سے مطلب ہے تم حسینؑ حسینؑ کرتے ہوئے جاؤ، بہر حال اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ تراب صاحب ہی کی نصیحتوں کی برکت ہوتی تھی کہ ہم ہمیشہ نہایت منظم طریقے سے، نہایت وقار کے ساتھ شبیہ کربلا کو یاد کرتے ہوئے منزل تک پہنچ جاتے تھے۔ اس کے برعکس اگر تراب صاحب عملی سیاست میں ہوتے تو شاید ان کی خطابت کا رخ کچھ اور ہوتا، وہ ملت ضبط و تحمل کی نصیحتیں فرمانے کے بجائے عین ممکن تھا کہ عام سیاسی راہنماؤں کی طرح اپنی مقبولیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تشدد پر اکساتے اور ہر دور کی حکومتوں کو بلیک میل کرتے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ انہیں مادیت اور فنا ہو جانے والی چیزوں سے کوئی رغبت ہی نہ تھی، وہ چاہتے تو بڑے بڑے عہدے حاصل کر لیتے، لیکن ان کی فکر کا رشتہ تو علم کے شہر سے وابستہ تھا۔ اور وہ صرف انہی چیزوں کو پسند فرماتے تھے جو امر ہیں، جو دائمی ہیں، اور جنہیں کسی دور میں زوال نہیں۔

تراب صاحب کی عملی سیاست سے لاتعلقی کے باوجود یہ عجیب بات ہے کہ ایوانِ حکومت پر ان کا رعب طاری تھا، جب تک وہ زندہ رہے کسی حکومت کی یہ مجال نہیں ہوئی کہ وہ ملتِ جعفریہ کے ساتھ بدسلوکی کر سکے، حکومتیں شیعانِ علیؑ کے معاملات پر کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے کچھ سوچنے پر مجبور ہوتی تھیں لیکن افسوس کہ تراب صاحب کی بے وقت موت کے بعد ہم تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر کر رہ گئے ہیں، ذکرِ حسینؑ تو تا قیامت جاری رہے گا، لیکن اب علامہ تراب جیسا خطیب مشکل ہی سے پیدا ہوگا۔

علامہ مرحوم کی ایک اور خوبی کا ذکر ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص فرقے کے خطیب ہونے کے باوجود نہ صرف غیر شیعہ حضرات کے دلوں میں بسے ہوئے تھے۔ بلکہ غیر مسلم بھی ان کے دیوانے تھے، میں پانچ سال کی عمر سے علامہ مرحوم کی تقریریں سننے

رہی ہوں اور میں نے ان کی ہر مجلس میں یوں شرکت کی ہے جیسے باقاعدگی سے نماز ادا کی جاتی ہے، میرے اپنے جاننے والے کئی مسلم اور غیر مسلم خاندان ایسے ہیں جو نہایت باقاعدگی سے ترابی صاحب کی مجالس میں جاتے اور مستفید ہوتے تھے، لہٰذا ان کے ایسے قابل احترام عقیدت مندوں کو دیکھ کر یہی کہا جاسکتا ہے کہ ترابی صاحب صرف شیعوں کے خطیب نہیں تھے بلکہ وہ انسانیت کے خطیب تھے، حسینؑ کے خطیب تھے اور حسینؑ انسانیت کا دوسرا نام ہے۔

آج ترابی صاحب ہم میں نہیں ہیں تو دل جیسے ویران ہوگیا ہے، ترابی صاحب اپنے لاکھوں عقیدت مندوں کو روتا چھوڑ کر جب نشتر پارک سے اپنی آخری آرام گاہ کی طرف جا رہے تھے تو میں ان کے سوگواروں میں واحد عورت تھی جو نشتر پارک سے جلوس کے ساتھ حسینیہ سجاد یہ تک ننگے پاؤں، پیدل ان کے جنازے کے ساتھ ساتھ گئی اور حسینیہ سجادیہ جاکر بے ہوش ہو گئی، یہ واقعہ بتانے سے میری مراد اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ مجھے ترابی صاحب سے بڑی عقیدت تھی، اور وہ واحد شخصیت ہیں جن کے جنازے کے ساتھ چل چل کر میرے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ اور جب گھر آکر میں نے ان آبلوں کو دیکھا تھا تب بھی گھنٹوں پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی تھی۔

ترابی صاحب جب تک زندہ رہے ان کی ذات گرامی سے بالخصوص ہم شیعوں کو بڑی تقویت رہی اور جب کہ وہ ہم میں نہیں ہیں تو ان کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ کاش قوم کو ان کا نعم البدل مل جائے!!۔

پاکستان میں ترابی صاحب کی ۲۷ سالہ خدمات کا صلہ اگرچہ صحیح معنی میں صرف جناب سیدہ ہی دیں گی تاہم عوامی حکومت کو کم از کم یہ ضرور چاہیے کہ وہ فیڈرل بی ایریا کا نام بجائے منصورہ یا فیڈرل بی ایریا کے علامہ ترابی ٹاؤن رکھنے کی تجویز منظور فرمائے

کرو یہ بھی جب علامہ اقبال ٹاؤن یا دوسرے ٹاؤن آباد کئے جا سکتے ہیں تو مقتول بلا ٹاؤن نام رکھنے میں آخر کیا ہرج ہے۔ اس سلسلے میں میں "منبر کا دوسرا نام" کی وساطت سے قائد عوام سے پرزور اپیل کروں گی کہ وہ اس مسئلے پر غور فرمائیں اور فیڈرل ایریا کو ملتِ جعفریہ کے تجویز کردہ نام سے نوازیں۔ مجھے امید ہے امیر حسین صاحب قوم کی یہ آواز قائد عوام تک پہنچانے میں اپنی روایتی فرض شناسی سے کام لیں گے۔

آفتابِ خطابت

سید علی محمد رضوی سچے

کچھ لوگ ایسے بلند و بالا ہوتے ہیں جن سے ملاقات تو ایک طرف صرف مصافحہ ایک سعادت بن جاتا ہے۔ ترابی صاحب کی شخصیت کچھ ایسی ہی تھی۔ اس آفتابِ خطابت کے گرد گردش کرتے ہوئے لاکھوں ذرات میں میری بھی حیثیت ایک ذرہ کی سی تھی۔

میرے لئے ترابی صاحب کیا تھے اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگائیے کہ میں نے اپنی انجمن ط کے سالانہ پروگرام میں ایک مرتبہ ترابی صاحب کو مدعو کیا تو انہوں نے ازراہ ہمدردی منظور فرما لیا۔ آپ یقین کیجئے کہ وہ امام بارگاہ میں مجلس پڑھ رہے تھے اور ہمیں یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم سب ربڑ کے پتلے ہوں اور وہ پتلے یکایک کھینچ کر لمبے ہو گئے ہوں۔ بہت لمبے یا پھر ارد گرد چلتے ہوئے لوگ سکڑ گئے ہوں۔

بحیثیت نوحہ خواں میں اپنے ریکارڈ کے کور چھپوانے کے سلسلہ میں رونق بھائی کے ساتھ ان کے گھر گیا۔ وہ اپنی لائبریری میں تشریف فرما تھے۔ کتاب زانو پر کھلی تھی۔ اور ان سے بات کرتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنی لائبریری میں نہیں بلکہ پٹیل پارک کے منبر پر تشریف فرما ہوں۔ وہی انداز وہی

ط انجمن زوارانہ:

اسلوب وہی تیور ۔ میں جب تک بیٹھا رہا سوچتا رہا کہ منبر کے تپاک اور اس میز کے تپاک میں کیا فرق ہے ؟ مجھے تو کوئی فرق نظر نہیں آیا سوائے اس کے کہ وہاں ہزاروں سامعین ہوتے تھے اور یہاں صرف ہم دو تھے ۔ جو اس آفتاب خطابت کو چندھیائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے ۔

جوانِ فکر خطیب

سیّد بادشاہ حسین

بے مثال مقررؔ، بلند پایہ محقق، وسیع النظر عالم دین، دوست نواز انسان، خوش گو شاعر ـــــ یہ تھے ہمہ صفت موصوف محمد رضا حسین خاں المعروف بہ علامہ رشید ترابی! یہ شمع کیا بجھی کہ اہلِ دل کی محفل سونی، اہلِ ذوق کی بزم بے رونق اور اہلِ نظر کی دنیا تیرہ و تار ہو گئی۔ وہ جو ہر محرم میں ہزاروں کو رلاتا اور خود روتا تھا، آج اس کے لئے ہزاروں آنکھیں اشکبار ہیں۔ وہ جو مجلس عزا برپا کرتا تھا، آج اس کا سوگ منایا جا رہا ہے۔ وہ جو گرمیٔ گفتار سے دلوں پر حکمرانی کرتا تھا، آج بیماریٔ دل کا شکار ہو گیا۔ وہ جس کی فصاحت نمک خوانِ تکلم تھی، وہ جس کی بلاغت سے ناطقے بند تھے۔

وہ جس کے اندازِ فکر سے مطلب کے نئے سوتے پھوٹتے تھے، وہ جس کی دردو گداز سے جذبات غم اُمنڈ آتے تھے آج ایک شمع کشتہ کی طرح ایک عندلیب لب بستہ کی طرح کنج لحد کو گوشۂ قفس بنائے ہوئے ہے۔

رُومیؔ کا حلقہ بگوش، اقبالؔ کا شیدا، انیسؔ کا دلدادہ، میرؔ کا پروانہ، غالبؔ کا دیوانہ آج ہماری نظروں سے غائب لیکن ان بزرگوں کی محفل میں شریک ہے چراغ سے چراغ جلتا ہے عرفان کا درس سینہ بہ سینہ ملتا ہے، بات سے بات نکلتی ہے فکر سے فکر کا در کھلتا ہے نظر سے نظر ملتی ہے لیکن علامہ نے جس طرح ان کی فکر و نظر سے ناتہ جوڑا ربط صمیم قائم کیا اور پیغام کو آگے بڑھایا وہ منفرد بے مثال و بے نظیر تھا۔

خالقِ کائنات نے فکر و نظر کی وسعتوں اور ادراک علم و فہم کی پنہائیوں کے ساتھ

ساتھ خطابت کا انوکھا اور منفرد انداز کمال فیاضی سے عطا فرمایا تھا - ابتدائی منازل عمر میں علماء کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا - تربیت دل و دماغ ہوتی رہی، ذوق نکھرتا رہا، شوق بڑھتا رہا اور ایک نئی افق کی طرف قدم اٹھتا رہا - مقام پیدائش حیدرآباد (دکن)، والد شرف حسین - اس حیدر اور حسین کے باہمی ربط نے رُشد کا سلسلہ آگے بڑھایا اور رشید کیا۔ تعلیم کی ابتدائی منزلیں سٹی ہائی اسکول میں طے کیں اور عثمانیہ یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی۔ مذہبی اعلیٰ تعلیم کے لئے علماء لکھنؤ سے فیض حاصل کیا۔ علم و ادب کی تشنگی بجھانے کے لیے فارسی اور عربی زبانوں میں مہارت پیدا کی۔ فلسفہ کا مطالعہ کیا، مشرق و مغرب دونوں کے نقطہ ہائے نظر میں دلچسپی لی۔ افکار کہنہ اور افکار تازہ کی خوشہ چینی کی اسلوب منطق اور انداز عقل کو اپنایا، اصطلاحات علمیہ کا سہارا لیا، الفاظ کے ذخیرہ کو چھانٹ چھانٹ کر منتخب کیا۔ تقریر میں لذت، خطابت میں سحر، تفہیم میں تاثیر، مطالب میں وسعت اور معانی میں گہرائی پیدا ہوئی۔

اسکول اور کالج کے زمانہ میں مذاکروں اور مباحثوں میں حصہ لیا اور اپنی خداداد صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ پختہ کار بزرگوں نے انہیں دنوں اندازہ کر لیا تھا کہ یہ نوجوان مستقبل قریب میں نطق کی آبرو بڑھائے گا، گویائی کا معیار و جگائے گا اور خطابت کو بام عروج پر پہنچائے گا۔ یونیورسٹی میں کالج میگزین کی ادارت سنبھالی اور تحریر کو تقریر کی خوبیوں سے ہم آہنگ کیا۔ فلسفہ اور ادب پر تحقیقاتی مقالے لکھے اور خراج تحسین حاصل کیا۔

تقریری صلاحیتوں نے ذاکری کا شوق پیدا کیا۔ نو عمری میں مولوی غلام حسین صاحب قبلہ اور مولوی عباس علی شریف قبلہ کی مجلسوں میں پیش خوانی کی اور جلد ہی ذاکری کی دنیا میں انہیں ایک نئی صداقت سمجھا گیا۔ اسی دوران شاعری کے مطالعہ نے سخن گری کی طرف راغب کیا۔ عالم شباب میں طبیعت جولاں تھی۔ فکر و نظر دور اندیش تھی، سوجھ بوجھ میں سلیقہ تھا۔ مزاج موزوں تھا۔ واردات قلب و دماغ شعر کے سانچوں میں ڈھلنے لگے۔ اور ڈھلتے گئے وہ دن بھی مجھے یاد ہیں جب علامہ اقبال لکھنؤ

برصغیر میں صاحبان ذوق ونظر کی ورد زبان تھا اور بہت سے شعراء نے جواب شکوہ لکھا تھا۔ علامہ ترابی نے بھی اس میدان میں قدم رکھا اور مجھے اپنا نو تصنیف جواب شکوہ سنایا تھا۔ شعر کم کہتے تھے۔ لیکن سخن سنجی اور سخن فہمی سے خاص شغف رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ ہم عصر شعراء سے ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ کبھی کبھار نجی طور پر محفل شعر وسخن منعقد ہوتی رہتی تھی۔

ذاکری ان کی طبیعت سے بہت مناسبت اور ہم آہنگی رکھتی تھی اس لئے تقریباً سارے کا سارا وقت وہ اسی کی شائستگی اور اسی کو سنوارنے میں صرف کرتے تھے۔ کتابیں جمع کرنے کا شوق اسی سلسلے میں زیادہ ہوا۔ مشاغل اور مصروفیات پر انہوں نے پابندی لگا دی اور روز بروز کثرت مطالعہ کے شغل میں گوشہ نشین ہو گئے۔ مطالعہ سے فرصت ملتی تو دوست احباب کی ——— محفل آرائیاں ہوتیں یا سہ پہر میں بالعموم ہوا خوری۔ موٹر چلانے کا بڑا شوق تھا۔ اکثر شام کے وقت یوں ہی بلا سبب بھی موٹر چلاتے شہر کا گشت لگاتے رہتے ——— کھانے کھلانے کے دلدادہ تھے۔ اچھا کھاتے اور اچھا کھلاتے تھے۔

لباس کے معاملے میں وضع دار تھے ، قراقلی کی ٹوپی، اچکن اور حیدر آبادی طرز کا لٹھے کا پاجامہ ، ہمیشہ یہی پہنتے رہے۔

ذاکروں میں غالباً یہ پہلے تھے جنہوں نے تقاریر کا رنگ اختیار کیا اور وہ بھی مقررہ عنوان کے تحت۔ مولویانہ یا واعظانہ انداز سے یہ الگ ہی رہے لیکن مقررہ وقت میں اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کرنے پر انہیں بڑا قابو حاصل تھا۔ نہ غلط بحث کرتے اور نہ غیر متعلق باتوں میں الجھتے۔ اپنے موضوع کا دائرہ بناتے اور گھوم پھر کر اسی دائرے میں واپس آجاتے۔ قرآن پاک کی تعلیمات، اس کے مطالب اور معانی پر گہری نظر تھی اور اپنے موضوع کے تحت بے شمار آیتوں کا برملا حوالہ دینا ان کی تقریروں کا ایک نمایاں خصوصیت ہوتی تھی۔

ایک دفعہ مرزا مہدی آغا پویا مرحوم ومغفور کے ہاں بیٹھا تھا۔ قرآن حکیم کی ایک آیت کے معانی بیان ہو رہے تھے۔ علامہ رشید ترابی کا ذکر آغا پویا نے کچھ اس انداز میں کیا۔

"۔۔۔ رشید ترابی اور میں مل بیٹھتے ہیں تو کلام اللہ کی آیتوں سے متعلق باتیں کرتے رہتے ہیں خصوصاً محرم سے پہلے جب ہم ملتے ہیں تو مجالس کے عنوانات کے لیے موضوع اور ان سے متعلق آیات تلاش کرتے ہیں۔ موضوع زیر بحث پر میں ایک آیت پڑھتا ہوں تو رشید چار آیتیں پڑھ دیتے ہیں، میں چار پڑھتا ہوں تو وہ دس ۔۔۔۔۔"

علامہ کا حافظہ غیر معمولی تھا جو کچھ بھی پڑھتے، اس کا بڑا حصہ ذہن میں محفوظ کر لیتے، پھر بڑی توجہ کے ساتھ ان یادداشتوں کو تازہ کرتے رہتے۔ حافظے کی اس نعمت نے ان کی علمیت اور خطابت دونوں کو بڑا سہارا دیا۔ میں نے ایک دفعہ ماضی قریب کی ایک مثال حافظے سے متعلق سنائی۔

"جسٹس سید محمود (سر سید احمد خاں کے نامور فرزند) کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ذہانت اور فراست کے علاوہ غیر معمولی حافظہ بھی رکھتے تھے۔ کہتے ہیں ایک دفعہ کسی نے ان سے مولانا روم کی مثنوی کے اشعار سنانے کی فرمائش کی۔

سید محمود نے پوچھا "کون سا باب سناؤں کس جگہ سے سناؤں ملاقاتی نے کہا فلاں باب! سید محمود نے پورا باب سنایا پھر کہا اس کے پچھلے حصے پلٹ کر سناؤں۔ یہ سنا چکے تو پھر کسی اور جگہ سے الٹ پلٹ کر سنانے لگے۔ پورے حوالوں کے ساتھ اور مکمل سیاق و سباق کے ساتھ ۔۔۔"

علامہ رشید ترابی نے اپنی مخصوص مسکراہٹ لبوں پر پیدا کی اور مثنوی روم سید محمود کے انداز میں سنانے لگے۔ پھر بڑے انکسار کے ساتھ بولے "سید محمود کہاں! اور میں کہاں! پھر بھی نمونتاً پیش کر دیا۔

قرآن پاک کی آیتیں اور احادیث کی تفصیلات تو خیر انہیں نوک زبان تھیں لیکن اردو فارسی اور عربی شعراء کا کلام بھی انہیں کثیر تعداد میں یاد تھا۔ مولانا روم کی مثنوی علامہ اقبال کا کلام میر انیس کے مرثیے مرزا غالب کے اشعار ہر موضوع پر وہ جس روانی سے پڑھتے اور ان کا برمحل استعمال کرتے تھے وہ بڑی حیرت کا باعث ہوتا تھا۔

بہت کم مقررین ایسے ہوں گے جو زندگی کے ہر شعبہ میں اور ہر موضوع پر یکساں طور پر خطابت کے اعلیٰ جوہر دکھا سکتے ہوں۔ علامہ رشید ترابی میں یہ کمیاب خصوصیت تھی کہ وہ مختلف موضوعات پر

مختلف مجمعوں کو اپنی منفرد سحر نگاری سے یکساں طور پر محظوظ کرتے تھے۔ مجالس ہوں، میلاد کے جلسے ہوں، سیاسی محفلیں ہوں، ادبی نشستیں ہوں، جس جگہ بھی وہ تقریر کرتے اپنی خطابت کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرتے۔

سیاست کے ذوق نے انہیں حیدرآباد میں اتحاد المسلمین کے پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔ شہر کے مختلف محلوں میں، دیہاتوں اور گاؤں میں جگہ جگہ مسجدوں میں، پنڈالوں میں کھلے میدانوں میں انہوں نے اپنی جادو بیانی سے مسلمانوں کا سیاسی شعور بیدار کیا۔ نواب بہادر یار جنگ اور رشید ترابی دونوں نے ایک پلیٹ فارم سے مسلم لیگ کا پیغام پہنچایا۔ مسلمانوں کی شیرازہ بندی، اتفاق رائے اور اتحاد عمل علامہ کی زندگی کے اعلیٰ ترین مقاصد تھے۔ اور اسی کا پرچار وہ عمر بھر کرتے رہے۔

صحافت سے بھی علامہ کو دلی لگاؤ تھا۔ پاکستان آنے کے بعد ہی سے اخبار کا اجراء ان کے پیش نظر تھا۔ میں ۱۹۴۹ء کے شروع میں کراچی آیا اور پہلی ملاقات ہی میں علامہ نے مجھے اس کام میں ہاتھ بٹانے پر آمادہ کیا۔ چند سال ابتدائی مرحلے طے کرنے میں گزرے اور جب انہوں نے اردو روزنامہ "المنتظر" نکالا تو میں ٹائمز آف کراچی سے وابستہ ہو چکا تھا۔ ان کے اصرار کے باوجود بھی میں اس کام میں بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر ساتھ نہ دے سکا جس کا گلہ انہیں عرصہ دراز تک رہا۔ پچھلے چند سالوں میں کئی دفعہ انہوں نے اخبار یا ہفتہ وار نکالنے کے منصوبے بنائے۔

علامہ رشید ترابی بوڑھے ہو چکے تھے لیکن ان کی فکر جوان تھی، ان کا دماغ جوان تھا، ان کا دل جوان تھا۔ ان کا جذبہ جوان تھا۔ اور اس لئے وہ زیادہ تر نوجوانوں کے محبوب تھے۔ ان کے سننے کے لئے جس کثرت سے لوگ آتے تھے ان میں جوانوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ وہ آج کی زبان میں بولتے، وہ آج کے بارے میں سوچتے، وہ آج کی زندگی نکھارتے، وہ آج کا عمل درست کرتے تھے۔ لیکن ماضی کو حرف غلط نہ سمجھتے، مستقبل کو لفظ کردہ نہ جانتے تھے، وہ بار بار دہراتے ہم اسے کٹ کر بھی نہیں سکتے۔ گزشتہ سے الگ ہو کر زندہ نہیں رہ سکتے تھے —— ماضی، حال اور استقبال میں ایک ربط، ایک رشتہ، ایک ناظم ہے مسلسل ہے! اسلاف کو جاننا، خود کو پہچاننا، زندگی کو سنوارنا —— یہی ہمارا نصب العین، یہی ہمارا عمل!

جدید نسل کا خطیب

سید محمد تقی

علامہ رشید ترابی نے ایک خطیب، مقرر اور ذاکر کی حیثیت سے پاکستانی عوام پر جو گہرے نقوش چھوڑے ہیں وہ ایک تحقیق پسند ذہن کو ان اسباب پر سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔ جو یہ تاثر پیدا کرنے کا باعث بنے ہیں ان کی موت کا جو سوگ منایا گیا ہے وہ اس تاثر کا اظہار تھا جو انہوں نے لاکھوں انسانوں کے ذہنوں میں پیدا کیا تھا۔

علامہ رشید ترابی ایک بہت بڑے خطیب تھے اور یونانیات سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ خطابت کو بطور علم کے مدون کرنے کا اعزاز گورجیاس کو حاصل ہوا تھا۔ جو یونان کے سوفسطائیوں میں ایک محترم اور معزز مقام رکھتا ہے۔ گورجیاس نے سب سے پہلے ان اصولوں اساسوں اور نظریوں کی وضاحت کی جو خطابت کے علم کی بنیاد بنتے ہیں۔ افلاطون نے اپنے مکالمات میں بار بار گورجیاس، پروتاغوراس اور پروڈکس وغیرہ ممتاز سوفسطائیوں کی مخالفت کی ہے۔ اور ان کے خیالات اور نظریوں کی تنقید اور نکتہ چینی کی آماجگاہ بنایا ہے۔

سوفسطائی نقطۂ نظریہ تھا جس کی گورجیاس نے بڑے زور و شور سے وکالت کی ہے کہ کوئی حقیقت کبری سرے سے موجود نہیں ہے۔

ان کا نقطۂ نظر پروتاغوراس کا یہ خیال تھا کہ ہر حقیقت ناچیز کا پیمانہ فرد
خود ہوتا ہے۔ گویا ہر مسئلہ فرد کے اپنے نقطۂ نظر سے طے ہوگا۔
حقیقت خارجی کی کسوٹی پر نہیں۔ اس لئے کہ کوئی دائم الوجود خارجی
حقیقت موجود نہیں ہے ہر مسئلہ دو پہلو رکھتا ہے آپ کے لئے حقیقت
وہ ہے جسے آپ خیال کرتے ہیں اور کسی دوسرے کے لئے حقیقت
وہ ہے جسے وہ صحت پر مبنی سمجھتا ہے۔ لہٰذا سوفسطائی تمرین ذہن کے
لئے مخالفت اور موافق دلائل دینے کی تربیت دیا کرتے تھے اور اس
کا معاوضہ بھی طلب کرتے تھے۔ چنانچہ پروتاغوراس جو اس گروہ کا سرخیل
تھا اس معاوضے سے اتنی دولت حاصل کرسکا کہ یونان کے دولتمند
افراد میں شامل ہوگیا۔ مخالف اور موافق نقطۂ نظر کے اس فلسفے سے مباحثے
کا وہ انداز پیدا ہوا جو آج بھی دنیا کے اسکولوں میں رائج ہے۔ جس میں
طلبہ کو کسی ایک خیال کے دونوں پہلوؤں، موافق و مخالف کی تائید میں
دلیلیں دینے پر تیار کیا جاتا ہے۔ یونانی خطابت کو منطق کی شاخ قرار
دیتے تھے اور سوفسطائیوں کے انداز سے اس خیال کا پیدا ہونا قدرتی تھا
اس کے برعکس عربوں کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ خطابت منطق کی شاخ نہیں
اپنی جگہ ایک جداگانہ تربیت ہے۔ یہاں نامناسب نہ ہوگا، اگر میں اپنی
کتاب "تاریخ اور کائنات، میرا نظریہ" کا ذکر کروں جس میں ایک جملہ آتا
ہے جس کا یہاں اعادہ ناموزوں ہوگا۔ جملہ یہ ہے کہ "تاریخ فکر انسانی ایک
مثلث کی طرح ہے جس کے تین زاویے ہیں۔ پہلا فلسفۂ یونان، دوسرا
منطق عرب، اور تیسرا ریاضیات عہد جدید، اس کے علاوہ جو کچھ ہے،
وہ انسانی تاریخ کے کوڑے پر پھینکا جا سکتا ہے ——— میں

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ منطق عرب کس اہمیت کی حامل ہے تو منطق عرب ایک نہایت سخت مشکل اور رقیق شاخ ہے فکر کی جس میں وہ علوم اور فنون شامل نہیں ہوتے جو نسبتاً کم فکری سرگرمی کا تقاضا کرتے ہیں۔ شاعری کی طرح خطابت بھی تخیل اور تفکر کا مجموعہ ہوتی ہے۔ جب کہ منطق عرب میں فکری عنصر بہت زیادہ شامل ہوتا ہے۔ اس لئے عرب خطابت کو شاعری کی طرح منطق کی شاخ قرار نہیں دیتے۔ یہاں یہ وضاحت مناسب ہوگی کہ مذکورہ کتاب کوئی آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے اور اب تک ۸ سو صفحات اشاعت پذیر ہو چکے ہیں ممکن ہے آئندہ ایک دو ماہ میں یہ کتاب بھی منصہ شہود پر آجائے۔

تو بہرحال علامہ رشید ترابی اس مکتب سے تعلق رکھتے تھے جو عربوں نے پیدا کیا ہے جس کی روح سے خطابت منطق کی شدید گرفت سے نجات پا کر آزاد میدانوں میں جولانیاں دکھاتی ہے۔

خطابت اور ذاکری کے میدان میں ترابی صاحب کا مقام کیا ہے؟ یہ سوال ان لوگوں کی توجہ کا مستحق ہے جو چیزوں کو گہرائیوں میں اتر کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔!

ہمیں واضح طور پر ذاکری اور خطابت کے ممتاز مدرسے نظر آتے ہیں ذاکری کا ایک مدرسہ تو وہ تھا جو ۱۹۴۷ء یعنی تقسیم سے پہلے ختم ہوگیا تھا۔ پھر چند یوں متعین تاریخوں سے ادوار کی تقسیم کوئی سائنٹفک بنیاد نہیں رکھتی۔ تاہم مسائل کو جدا جدا رکھ کر دیکھنے کے لئے اس نوع کی تقسیم ضروری ہے تاکہ زمان کے بہاؤ کو خانوں میں بانٹ کر الگ الگ سمجھا جا سکے۔

تقسیم سے پہلے تک ذاکری جس نہج پر چلتی رہی وہ قدیم انداز نظر اور

پرانے ہجوں پر مشتمل تھا۔ اس مدرسے کی بنیاد لکھنؤ نے ڈالی تھی۔ جس نے مذکورہ طرز کے بعض بہت بڑے خطیب اور ذاکر پیدا کئے اور تاریخ یقیناً ان خطیبوں اور ذاکروں کو یاد رکھے گی جو لکھنؤ نے پیدا کئے تھے۔ اور اپنے فن میں مہارت اور کمال کے درجے پر فائز تھے۔

لکھنؤ کے یہ خطبا، چند متعین تہذیبی اور نظریاتی حدود میں محدود رہتے تھے۔ ان کی چند ثقافتی اقدار تھیں جو تقسیم کے طوفان میں بہہ گئیں۔ خطبا، لکھنؤ ـــــ قرآن مجید، حدیث، تفسیر، فقہ، ادب عربی اور منطق کی حدود سے باہر جانا آداب خطابت کے خلاف قرار دیتے تھے۔ حد یہ ہے کہ وہ فارسی اور اردو کے اشعار تک پڑھنا مجلسی آداب کی خلاف ورزی خیال کرتے تھے۔ انگریزی اہل قلم اور مصنفین کے ذکر کا تو کہاں سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب انگریزی سے ناواقفیت بھی تھا تاہم ان اقدار کا احترام بھی ایک طاقتور باعث تھا۔ انگریزی سے بے تعلق کا جو کافی عرصے سے ہمارے تہذیبی مزاج کا ایک امتیاز رہا ہے اور بڑی حد تک اب بھی ہے۔ مجالس اور ذاکری کا ادارہ قدیم تہذیب کے فکری، ادبی، ثقافتی، نظریاتی، اور روحانی مزاج اور کردار کے اظہار کا ذریعہ تھا ـــ اصطلاحات اور تشبیہیں انداز بحث و گفتگو، طرز بیان و طریقۂ استدلال عرب نژاد و نسل کے عروجی تہذیبی انداز کی نمائندگی کرتا ہے اور یہ بہت بڑی خدمت تھی جو یہ ادارہ سرانجام دیتا تھا۔ لیکن نئے عہد کے بدلتے ہوئے حالات میں ذاکری کا یہ ادارہ اس انداز پہ نہ چل سکتا تھا جس پر اس وقت تک چلتا رہا تھا۔

علامہ رشید ترابی نے اس بدلی ہوئی صورتحال کا احساس کیا اور خطابت

وذاکری کے ایک نئے مدرسے کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے جدید لہجے میں بات کی گفتگو کا انداز بدل دیا۔ ان پابندیوں کو مٹا دیا۔ جو قدیم خطبا نے اپنے اوپر عائد کر لی تھیں۔ اب شاعری میں خاص طور پر فارسی اور اردو شاعری مے در پایا۔ انگریزی مصنفین کے ذکر پر جو قدغن تھی اٹھ گئی جس کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ علامہ موصوف قدیم وجدید فکر سے یکساں بہرہ مند تھے۔ وہ جدید نسل کے لہجوں میں بات کرتے تھے وہ ان کے ذہنوں کی نہج سے واقف تھے۔ اس لئے اسی انداز میں مخاطب کرتے رہے جسے نئی نسل سمجھ لیتی تھی۔ اس لئے جدید نسل پر ان کا گہرا اثر پڑا اور بہ آسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ نئی نسل کو قدیم روایت سے قریب لانے میں جتنا علامہ رشید ترابی کا ہاتھ ہے اتنا کسی اور ذاکر کا نہیں ہے۔

یہ نیا مدرسہ جس کی بنیاد علامہ نے ڈالی ہے اب کیسے چلے گا یہ کہنا مشکل ہے لیکن برصغیر میں مسلمانوں کی خطابت کا جائزہ لینے والے یہ بات مانیں گے کہ ترابی صاحب ایک نئے طرز خطابت کے بانی ہوتے ہیں۔ انہوں نے خطابت کے جدید مدرسے کی بنیاد ڈالنے میں کامیابی حاصل کی اور اس لئے میرا مشورہ یہ ہوگا کہ موصوف کے کارناموں پر مشتمل ایک مجموعہ تیار کیا جائے۔ جو انہوں نے خطابت کے میدان میں انجام دیئے ہیں۔ انہوں نے جس مدرسے کی بنیاد ڈالی ہے اس کی خصوصیات اور خوبیوں پر روشنی ڈالی جائے تاکہ ان کی خدمات اور یاد کے ساتھ انصاف کیا جا سکے۔ ان کی یاد باقی رکھنے کا یہی مناسب طریقہ ہے اور مجھے امید ہے کہ اس طریقے پر عمل کیا جائے گا۔

ذاکرِ حسینؑ

حسن عسکری فاطمی

حضرت علامہ رشید ترابی رحمۃ اللہ علیہ بلاشبہ اقلیم خطابت کے میر انیس تھے، ان کے لہجے میں مرزا دبیر کا شکوہ الفاظ پنہاں تھا۔ اور انداز تکلم میں نواب بہادر یار جنگ کی تاثیر موجزن تھی۔ جلال وجمال کے اس حسین امتزاج سے قدرت نے علامہ رشید ترابی کے نطق کا خمیر اٹھایا تھا۔ ملت سے جڑے ہی نہیں بلکہ ان کے پر مغز اور دل میں اتر جانے والے افکار کا دائرہ دوسرے فرقوں کے اصحاب بصیرت تک وسیع تھا۔ ان کی جدائی میں آنسو بہانے والوں میں ایسے عقیدت مندوں کی کثرت ہے جن سے ان کا ذہنی اور فکری رشتہ تھا۔ ان کے سحر آگیں نطق سے دانشور ہمیشہ تخلیقی تحریک پاتے تھے وہ جب نازک اور باریک مقامات فلسفہ سے گزر کر خطابت کی سرسبز و شاداب وادی میں پہنچتے تو تخیل فہم و ادراک بہا گریز ہوتی اور وجدان کی شگفتگی سامعین کے ہونٹوں پر رقص کرنے لگتی اور جب وہ مسائل دینی پر گفتگو کرتے تو ان کے انداز بیان پر شاہانہ تمکنت کا راج ہوتا، ان کی فکر جب قلزم نہج البلاغہ میں غوطہ لگا کر ادراک کی سطح پر ابھرتی تو بے اختیار لاکھوں اذہان فکر و خیال کے اس تموج میں بہہ جاتے اور وہ بڑے ناز سے ممبر پر بیٹھتے اور دائیں بائیں دیکھ کر مجمع پر طاری کیفیت سے محظوظ ہوتے ——

کسی ایک ہی نکتہ پر اکثر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالتے رہتے اور حاضرین کی سماعت کا لطف دوبالا کرنے کے لئے پھر اسی نکتے کو دوسرے حرف والفاظ کا جامہ پہنا کر ادا کرتے اور یوں تحصیل علم کے اس سلسلے کو یہ کہہ کر توڑ دیتے کہ "آئندہ پھر کبھی اس نکتہ پر ہم اپنی فکر کو آگے بڑھائیں گے۔" حافظہ ایسا غضب کا تھا کہ اتنا کہہ کر بھول نہیں جاتے تھے بلکہ دو تین سال بعد بھی اس نکتے کا حوالہ دے کر سلسلہ کلام کو پچھلی گفتگو سے مربوط کر دیتے تھے اور سامعین بھی ان کے مزاج سے اس قدر واقف ہو گئے تھے کہ انہیں بھی عین اسی وقت پرانا نکتہ یاد آجاتا اور اس میں اضافے پر مجبورنے لگتے۔ عزادارانِ حسینؑ کو ان کی مجالس سننے کی عادت ہو گئی تھی وہ جہاں کہیں جاتے لوگ ہزاروں کی تعداد میں پہنچ جاتے۔

وہ حرف والفاظ کے معاملے میں بڑے محتاط رہتے تھے۔ الفاظ کا بے دریغ استعمال ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ وہ الفاظ کو بہت سوچ سمجھ کر ان کے محل پر خرچ کرتے تھے۔ لب ولہجے کے ذریعے ان کی قدر وقیمت متعین کرتے تھے۔ جب امام مظلوم پر گفتگو کرتے تو الفاظ بھی ویسے ہی دلگداز اور نرم اس تذکرے سے وابستہ کرتے۔ قمر بنی ہاشم ابوالفضل العباسؑ کا بیان کرتے تو الفاظ میں وہ طنطنہ عود کر آتا کہ فاتح خیبر و خندق کا جلال ٹپکنے لگتا۔ رسولِ عربی صلوٰۃ وسلام کے ذکر سے اپنے کلام کو مشکبار کرتے تو دل رسالتمآب کی چوکھٹ پر جھک جاتے قرآن کی تلاوت کرتے تو دل خدائے قدوس و حق کے جبروت سے سہم جاتے اور عقل سربسجود ہو جاتی حضرت زینبؑ اور حضرت زین العابدینؑ

کا بیان کرتے تو خود بھی بے چین ہو جاتے اور بلک بلک کر رونے لگتے شہزادیوں کے مصائب کا تذکرہ چند لمحوں سے زیادہ کرتے تو شدت غم سے منبر پر بے ہوش ہو جاتے۔ شہزادہ علی اکبرؑ، علی اصغرؑ و قاسمؑ کا بیان کرتے جاتے اور سینے اور زانو پر کرب کے عالم میں ہاتھ مارتے جاتے حبیب ابن مظاہر اور حرؑ کے جذبہ ایثار و محبت کو تفصیل سے بیان کرتے اور مجمع کو اشکوں سے سیر کر دیتے تھے۔

میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ جب حیدر آباد کے مردم خیز خطے میں کہیں اتحاد المسلمین کا اسٹیج لگتا اور اس پر کبھی نواب بہادر یار جنگ، خواجہ حسن نظامی اور مولانا ابوالکلام آزاد ایک ساتھ جلوہ افروز ہوتے اور رشید ترابی کی پیش خوانی جوش خطابت میں چند لمحوں سے ۳۰، ۳۵ منٹ پر پھیل جاتی تو نواب بہادر یار جنگ اپنے تلاش کردہ اس جوہر کی کارکردگی پر کھل اٹھتے پیٹھ تھپتھپاتے اور مجمع سے یہ کہہ کر رخصت ہو جاتے، رشید نے جو کچھ کہا آپ نے سنا۔ میں بھی کہتا تو یہی کہتا۔ اب میری تقریر کی ضرورت باقی نہیں رہی ـــــــ"

قیام پاکستان کے بعد انہوں نے ۱۹۴۹ء میں ہجرت کی تو کراچی کو اپنی جائے سکونت بنایا۔ ۳۴ سال تک وہ اہل کراچی کے مزاج علم شناس کی فکری و ذہنی ضرورتیں پوری کرتے رہے۔ ان کی آواز نشتر پارک، حسینیہ ایرانیان خالق دینا ہال، بڑا امام باڑہ کھارادر کی محدود چہار دیواریوں سے نکل کر دنیا بھر میں گونجتی رہی۔ اور کربلا کی شہادت عظمیٰ کے ذکر سے روشنی کے متلاشی دل منور ہوتے رہے۔ انہوں نے شیعہ فرقے کی مجالس عزا کے مخصوص انداز میں انقلاب برپا کیا۔ اور غیر محسوس طریقے سے بتدریج اس

انداز مجالس کو دوسرے فرقوں کے اہل علم کی پسندیدگی تک وسیع کر دیا۔ قرآن و حدیث و نہج البلاغہ کے تجزیے کی گرمی اگرچہ ان کے لب و لہجے کا منہ بولتا خمار بن جاتی تھی۔ مگر اس سے لوگوں کے دلوں میں حرارت پیدا ہونے کے سوا کبھی اور کسی جذبے نے سر نہیں اٹھایا وہ علانیہ اظہار حق کرتے تھے۔ اگرچہ وہ موضوع کا تعین کر کے پوری علمی تیاری کے ساتھ منبر پر تشریف لے جاتے تھے مگر موضوع پر تقریر کے دوران ان کا تفکر روبہ ترقی رہتا تھا۔ تقریر کو شروع، مقررہ وقت پر ختم کرنا یا موضوع کے مصائب پر آنے میں انہیں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ خطبہ پڑھنے کے بعد چند لمحے تک دائیں بائیں مجمع کو دیکھتے رہتے اور موضوع پر اپنے استدلال کو استوار کر کے فی البدیہہ بولنا شروع کر دیتے اور جب خیال کا جھونکا گزر جاتا تو اصل موضوع سے پچھلے دلائل کو ہم آہنگ کر کے اپنی فکر کو منزل مقصود کی طرف بڑھاتے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کی مجلس کے دوران وجدان پر سماعت کا سحر طاری ہوا ہو۔ وہ آج ہم میں نہیں ہیں۔ ان کی آواز باقی ہے۔ منبر رسولؐ انہیں تخت سلیمان سے کم عزیز نہ تھا۔ انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ عہدے اور دنیاوی جاہ و حشم منبر رسولؐ اور ذکر اہلبیت کے سامنے ہیچ ہیں یہی وجہ ہے کہ انہیں جب اعلیٰ عہدوں کی پیش کش کی گئی تو انہوں نے ان ملازمتوں کو پسند نہ کیا۔ اور غالباً ہر بار اپنے محبوب شاعر انیس کا یہ شعر پڑھ کر ٹھکرا دیا۔

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر
مجرئی اپنی ہوا کھودوں سلیماں ہو کر

ان کی عمر بھر خواہش یہ تھی کہ انہیں ذکر حسینؑ کرتے ہوئے منبر پر موت آئے

انہوں نے بہت سی آرزوئیں کی ہوں گی۔ جنہیں قدرت نے پورا کیا۔ مگر علامہ رشید ترابی کی یہ آرزو پوری نہیں ہوئی۔ انہیں اپنے آخری ایام میں اپنی اس آرزو پورا نہ ہونے کا احساس ہو گیا تھا۔ اس محرومی کو دبانے کے لئے انہوں نے ان الفاظ میں خود کو تسلی دی تھی۔

"چلو یہ تو طے ہو گیا نا؟ کہ میرا زوال منبر پر نہیں ہوا بستر پر ہوا۔"

اس ایک مختصر سے جملے کے پیچھے ان کے آخری لمحوں کی بڑی عجیب اور رقت انگیز داستان پوشیدہ ہے۔

ان کے صاحبزادے نصیر ترابی نے مجھے بتایا۔

"جناح ہسپتال کے شعبہ امراض سے جب بڑی حد تک صحت یاب ہو کر گھر آئے تو ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود مجلس پڑھنے کے لئے بے چین تھے۔ بار بار کہتے بابا ٹیپ ریکارڈ لگا دو۔ تاکہ میں آخری یادگار تقریر ریکارڈ کرا دوں۔ ڈاکٹروں کے مشورے کے تحت کسی نہ کسی طرح انہیں بہلا دیا جاتا۔ ایک روز بڑے بے چین تھے۔ کہنے لگے۔ نصیر! مجھ سے جلدی تقریر ریکارڈ کرا لو۔ میرے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے۔

نصیر ترابی کا کہنا ہے کہ میں ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق آخری دنوں میں بابا کے پاس زیادہ رہتا تھا۔ تاکہ ان کو مطالعے سے روکے رکھوں اور تقریریں نہ کرنے دوں۔ چند روز پہلے مجھے بلایا اور کہنے لگے نصیر جاؤ یہ عقیق ترشوا کر لا دو اور جب تک تراشش نہ دے دیں بیٹھے رہنا۔ میرے آنے کے بعد انہوں نے شریف صاحب (ٹیپ ریکارڈر والے) کو فون کیا اور کہا "شریف دیکھو تم جلدی سے ٹیپ لے کر آ جاؤ تاکہ میں اپنے سوئم کی مجلس ریکارڈ کرا دوں۔ بابا جلدی آنا کہیں نصیر واپس نہ لوٹ آئے۔ یہ لوگ مجھے مجلس پڑھنے سے روک

رہے ہیں۔ شریف صاحب صورت حال سمجھ گئے اور انہوں نے بابا کو اعلان کے پیش نظر ان سے آنے کا جھوٹا وعدہ کر لیا۔ شریف صاحب جب اگلے روز بھی نہ آئے تو بابا غصے سے ٹہلنے لگے اور مجھے ڈانٹنے لگے میں نے سمجھایا کہ بابا! ڈاکٹر نے منع کیا ہے چند روز اور ٹھہر جایئے پھر مجلس پڑھ لیجئے گا۔ اس پر بابا کچھ افسردہ ہو گئے اور بستر پر گھٹنے سیکڑ کر چھت کی طرف تکنے لگے جیسے کسی بات پر مستغرق ہوں۔ پھر انہوں نے چھت سے نگاہیں ہٹا لیں۔ اور دھیرے سے ایک جملہ کہا جیسے وہ خود ہی سے مخاطب ہوں۔

"چلو یہ تو طے ہو گیا کہ میرا زوال منبر پر نہیں ہوا، بستر پر ہوا۔"

علامہ کو اپنی ذات پر عرفان تھا اور اسی عرفان نے انہیں انسانوں کے انبوہ میں گم ہونے سے بچائے رکھا ان کا انداز تقریر ہمیشہ جوان رہا ان کے جسم کے ضعف نے کبھی ان کے لہجے کے طمطراق کو کبھی بھی متاثر نہیں کیا۔ دربار شام میں خطبہ جناب زینب ادا کرتے ہوئے ان کی آواز آخر عمر میں اتنی ہی بلند بانگ ہو جاتی تھی جتنی کبھی عہد شباب میں ہوتی ہو گی۔ غالب، حافظ، اقبال، انیس، اور مولانا روم کے ایسے ایسے غیر مانوس شعر بھی اچانک ان کی نوک زبان پر آ جاتے تھے کہ سننے والا ان کے حافظے کی تازگی و توانائی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

غالب اور اقبال کے اشعار کو وہ اپنے مخصوص انداز میں سمجھتے اور سمجھاتے تھے اور ان کی شرح کرتے وقت ایسے پہلو سامنے لاتے تھے کہ سننے والا دنگ رہ جاتا تھا۔ اور اسے یوں محسوس ہوتا کہ شعر خاص اسی مفہوم کے لئے تخلیق کیا گیا تھا۔ اردو، عربی اور فارسی کے کلاسیکی ادب پر ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ گو جوش، آل رضا، رئیس امروہی، احمد ندیم قاسمی

نیئی، ناصر کاظمی، فراز اور بابا ذہین شاہ تاجی کے کلام پر بھی ان کی نظر رہتی تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ تقریر کے دوران کسی ایسے شاعر کا غیر معروف شعر اپنے مفہوم کی حمایت میں پیش کردیتے کہ سامعین کو حیرت ہوتی۔ انہیں ایک لاکھ سے زائد اشعار یاد تھے۔

اقبال اور غالب کے اشعار پڑھتے وقت خود بھی جھوم جاتے تھے۔ اور بڑی سخاوت کے ساتھ واہ واہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے رضویہ کالونی کے امام باڑے میں تقریر کے دوران ہاشم رضا کا ایک شعر پیش کیا حالانکہ یہ شعر خود ہاشم رضا کے حافظے سے محو ہوچکا تھا۔

قرآن پاک پر ان کا استدلال احادیث اقوال ائمہ اور معروف مفسرین تک محدود نہ تھا۔ بلکہ وہ لادین اسکالرز اور فلسفیوں کے بھی حوالے دیتے تھے

کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ ہم سب زندگی کے اسٹیشن پر کھڑے موت کی گاڑی کا انتظار کر رہے ہیں جس کی گاڑی آجاتی ہے وہ عجلت میں اس پر سوار ہوکر روانہ ہوجاتا ہے۔ علامہ رشید ترابی کو بھی موت کی اس ٹرین کا پچھلے دنوں بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔ وہ زادِ راہ جلد جلد سمیٹ رہے تھے۔ چند روز پہلے انہوں نے اپنے مکان کے کاغذات نیشنل بنک میں رکھوا کر ۲۰ ہزار روپے اس لئے لئے تھے تاکہ اپنی تصانیف کو شائع کرواسکیں لیکن موت کی ٹرین اچانک ان کی زندگی کے اسٹیشن سے آلگی۔ اور وہ ہمیں روتا چھوڑ گئے۔ ان پر رات کو جب نزع کا عالم طاری تھا تو وہ درود پڑھتے جاتے تھے اور یا علی کہتے جاتے تھے۔ نیر کی والدہ سے جب یہ حالت نہ دیکھی گئی تو وہ آہ و بکا کرنے لگیں۔ علامہ نے شور سنا تو ایک لمحے کے لئے آنکھیں کھول دیں اور اٹھتے اٹھتے یہ جملہ کہا کیوں

روتی ہو۔ مجھے پریشان نہ کرو میں مولا حسین سے لو لگائے ہوئے ہوں۔
بی بی کا دامن سامنے ہے مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ پھر کلمہ پڑھا اور ساکت
ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے ان کے دل کی حرکت بحال کرنے کی سرتوڑ جدوجہد
کی مگر ذاکرِ حسینؑ کی روح ذکرِ مظلوم میں تحلیل ہو چکی تھی۔ ان کے جدائی کے
احساس نے دل کو بوجھل کیا ہوا ہے۔ اور قلم تحریر سے گریزاں ہے۔ دعا
ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت علامہ کو حشر نشر اہلبیت اطہار کے ساتھ کرے وہ
میرے آقا و مولا رسولؐ امی صلوٰۃ و سلام کے حضور سرخرو ہوں کہ انہوں نے ان
کے نواسے کے ذکر کو پھیلانے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔

بقیہ: ہمہ گیر شخصیت

سے، ترابی صاحب کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے ہندوستان نے مسلم ممالک
میں متعین اپنے سفراء کے توسط سے متعلقہ حکومتوں پر باقاعدہ زور ڈالا کہ وہ
پاکستان میں ہونے والی اس کانفرنس میں اپنے علماء کو نہ جانے دیں، لیکن
ترابی صاحب کے کارنامے پہ روشنی ہوتے ہندوستان کی یہ سیاسی چال آخر کار
ناکام ثابت ہوئی اور ہمارے تقریباً تمام مسلم ممالک کے مہمان گرامی اس میں پروگرام
کے مطابق شریک ہوئے۔ ترابی صاحب نے اس موقع پر ہاشم رضا صاحب کے
توسط سے اوچ شریف سے مولا علیؑ کا کتابت کردہ قرآن پاک منگوایا تھا جس پر
چوبیس گھنٹے گارڈز متعین رہتے تھے، جس ادارے کی جانب سے یہ یادگار
تقریب منعقد کی گئی تھی۔ ترابی صاحب اس کے جنرل سیکریٹری اور میں جوائنٹ سیکریٹری
تھا، اس تقریب پر اس زمانے میں ۲ لاکھ روپے خرچ کئے گئے تھے۔

سرکار علامہ رشید ترابی

ملنگ حیدری

سرکار حضرت علامہ رشید ترابی رحمت اللہ علیہ وہ آفتابِ خطابت تھے جن کی خطابت کی دھوم نہ صرف مشرق میں یا بالخصوص پاکستان میں تھی بلکہ ان کی حسن خطابت کا سکہ مغرب میں بھی رواں تھا۔

ہر گھر میں ہزاروں ٹیپ ریکارڈ علامہ مرحوم کی آواز محفوظ کیا کرتے تھے اور ان کی یہ تقریریں دور دراز کے ملکوں میں جایا کرتی تھیں اس سے وطن عزیز پاکستان کو بھی فائدہ پہنچتا تھا کہ علامہ رشید ترابی قبلہ کی آواز کے ساتھ پاکستان کا نام روشن ہوتا تھا۔

میں آپ کی خدمت میں ہمیشہ حاضر رہا۔ مجھ کو علامہ مرحوم اکثر حسینی پروانہ کہا کرتے تھے جناب فخر ملت سید مظفر علی شمسی صاحب کی دعوت پر آپ نے ۱۹۶۹ء میں پنجاب کا دورہ کیا وہ دورہ لاہور، پنڈی بھٹیاں، شیخوپورہ، سرگودھا، اور لائل پور کا تھا، مجھے یاد ہے کہ سرکار علامہ رشید ترابی نے سرگودھا میں مسجد و امام بارگاہ کے ایک عظیم جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ملنگ حیدری صاحب جو کہ کراچی سے آئے ہیں اور شیر پنجاب شمسی صاحب کے بدولت کہ وہ پورا دورہ کر اور پنجاب نشان لے کر جگہ جگہ جاتے ہیں یہ حسینی پروانہ ہیں۔ اس کے علاوہ سرکار علامہ رشید ترابی نے مجھ کو اس وقت حسینی پروانہ کہا جب میں محرم الحرام ۱۳۹۱ ہجری ۷ مارچ ۱۹۷۱ء کربلائے کراچی ٹی وی ہاؤس کے سامنے مظاہرہ کرتے ہوئے گرفتار ہوا اور پولیس علامہ سرکار کے بدولت کہ مجھ کو چھوڑ کر گئی اور علامہ سرکار نے کہا ملنگ حیدری آپ نشتر پارک چلیں۔ کلام کی خدمت کا پورا ہوا۔ میں نشتر پارک میں آج آپ سے بھی کچھ کہوں گا۔ سوا لاکھوں کے

مجلس کے سامنے حضرت علامہ رشید ترابی عالی المقام نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ شمع حسینؑ کے ایک پروانے ملک حیدری نے مجھے تار دیا ہے کہا ہے کہ اگر ٹیلی ویژن نے یوم عاشورہ کو تفصیل نشر نہ کی تو میں ٹیلی ویژن کے سامنے مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا لوں گا اور مر جاؤں گا۔ علامہ صاحب نے مزید کہا کہ یہ مسئلہ پوری ملت اسلامیہ کا اپنا مسئلہ ہے لہٰذا اب اس کی ضرورت نہیں۔ از روئے شریعت بھی خودکشی حرام ہے ایک جائز عمل کی تکمیل کسی حرام ذریعہ سے نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ تقریر سن کر میں نے اعلان کیا کہ میں اب صرف مظاہرہ کروں گا تیل چھڑک کر خودکشی نہیں کروں گا۔ دوسرے دن اعلان ہو گیا کہ ٹیلی ویژن سے صرف حضرت علامہ رشید ترابی کی مجلس شام غریباں کی تقریر ٹیلی کاسٹ ہو گی۔ آہ آج وہ خطابت کا آفتاب غروب ہو گیا۔ جن کی خطابت کے اثر سے ایوان ہائے حکومت دہل جاتے تھے۔ اور لوگ ان کے ایک اشارے پر جان دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔

اب ہم ان کے بڑے صاحبزادے حضرت علامہ عقیل ترابی مدظلہ عالی پر نگاہ لگاتے ہیں کہ وہ یہ کمی ضرور کرے پوری کریں۔ میں ملک حیدری خاندان قریشی صدیقی اتحاد اسلامی کا حامی اور کیا عرض کر سکتا ہوں۔ آخر میں یہ ضروری کہنا ہے کہ اب میں اپنا سرپرست محمدؐ آل محمدؐ کے بعد دنیا میں کس کو کہوں۔؟ محترم امیر حسین صاحب کا میں دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی ترتیب کردہ اس لازوال کتاب میں مجھ حقیر فقیر کو بھی یاد رکھا؛

معبود حقیقی ان کی عمر دراز کرے۔

علامہ رشید ترابی ___ ایک صحافی

شہیر نیازی

علامہ رشید ترابی کو نہ صرف اہلِ پاکستان جانتے ہیں بلکہ اہلِ بھارت اور اہلِ ایران بھی ان کی علمیت اور صلاحیت کے مداح ہیں۔ مگر ان جاننے والوں میں بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے۔ جو ان کو خطیبِ اعظم کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ مگر ان لوگوں کی تعداد معدودے چند ہے جو ان کو بحیثیت دوست، بحیثیت ادیب و شاعر اور بحیثیت صحافی کے جانتے ہیں۔ بلکہ مشہور لوگوں کے مرجانے کے بعد تو ہر آدمی آسانی کے ساتھ کہہ دیتا ہے کہ وہ ان کو قریب سے جانتا تھا، یہی حال ترابی صاحب کا ہے۔ سب کہہ سکتے ہیں کہ وہ ان کو جانتے تھے مگر خود ترابی مرحوم سے کوئی پوچھتا تو وہ گنتی کے لوگوں کو ذاتی طور پہ جانتے تھے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ وہ بہت ذہین تھے اور غضب کا حافظہ پایا تھا جو کتاب پڑھ لیتے یاد ہو جاتی اور جو بات سن لیتے یاد رہ جاتی۔ وہ علامہ جارچوی (مرحوم) کی طرح روز کے ملنے والوں کو بھولنا تو الگ رہا۔ سالوں میں ملنے والوں کو بھی پہچان لیتے تھے، مجھے جہانگیر پارک کا وہ اقبال ڈے یاد ہے جس میں انہوں نے اپنی انتہائی شگفتہ اور ادیبانہ تقریر کے دوران فرمایا تھا کہ ہندوستان و پاکستان کی سرزمین پر کسی شخص کو ان سے زیادہ اقبال کے اشعار یاد نہیں ہیں۔ اور وہ اپنے اس دعویٰ میں حق بجانب تھے تادمِ مرگ کسی نے ان کے اس چیلنج کو قبول نہیں کیا اور ترابی صاحب نے ہزار بار کلام سے اپنی ذہانت کا لوہا منوایا۔ وہ جب کبھی کسی شاعر کے متعلق کچھ کہنے پر آتے اس

کے اشعار اس طرح سنائے کہ وہ اس کے کلام کے حافظ ہوں۔

میں ترابی صاحب کے ان حالات سے واقف نہیں ہوں جو پاکستان بننے سے پہلے کے ہیں۔ اس کے متعلق کچھ لکھنے کا حق انہی لوگوں کو ہے جو حیدرآباد دکن سے ان کو جانتے ہوں۔ میری ملاقات تو کراچی میں ہوئی، یہ بات غالباً اواخر ۱۹۴۹ء یا اوائل ۱۹۵۰ء کی ہے جب میں کلیٹن کوارٹرز میں مقیم تھا۔ مقیم بھی کیا تھا، بس ایک ملاقاتی کے ہال کرایہ دے کر مصیبت پیٹ رہا تھا۔ ساجد صاحب کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ رینٹ کنٹرولر تھے۔ ایک روز جہانگیر کوارٹرز میں سڑک کے کنارے ویلکا محل کے سامنے ان سے ملاقات ہو گئی اور انہوں نے بتایا کہ کراچی سے وہ اور ترابی صاحب ایک روزنامہ نکال رہے ہیں، اور ان کو میرا تعاون درکار ہے۔ میں نے تعاون کا یقین دلایا اور اگلے روز سے آتے جاتے ان کے آفس میں ملاقاتیں ہونے لگیں۔ علامہ رشید ترابی صاحب سے فرصت کے ساتھ گفتگو کا موقع ملا۔ وہ دفتر میں داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ والے پہلے کمرے میں بیٹھتے تھے۔ پرچہ کا نام "منتظر" رکھا گیا تھا۔ مجھ سے اس کے چیف رپورٹر کی حیثیت سے کام کرنے کے لئے کہا گیا۔ اور میں اس کا پہلا ایکریڈیٹیڈ (ACREDITED) رپورٹر مقرر ہو گیا۔ اس موقع پر یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پرچہ نکلنے سے پہلے پرچہ کی پالیسی طے ہوتی ہے اور مجھے اس بات کا شرف حاصل تھا کہ علامہ ترابی اور ساجد حسین مجھے اکثر مشورہ میں شریک کر لیتے تھے، پرچہ کی پالیسی کا لب لباب کچھ یوں تھا:۔

"یہ پرچہ اگرچہ پاکستانی شیعوں کے حقوق اور مطالبات کا آئینہ دار ہوگا۔ اور فلسفۂ اہلِ بیت کا علمبردار مگر دل آزار ہرگز نہیں ہوگا سوائے اداریہ اور مضامین کے اس کی خبروں اور اشتہاروں میں کوئی مذہبی

تفریق نہیں کی جائے گی۔ اداریہ اور مضامین بھی حسب ضرورت ہوں گے
ذکر بر وقت اور وہ بھی شائستہ، پرچہ کو اتحادِ اسلامی اور ملک کی سلامتی
کا نقیب بنایا جائے گا۔"

یہ لب لباب میں نے اپنے الفاظ میں لکھا ہے لیکن میں نے اس دستور کے مطابق صرف ابتدائی دور میں عمل ہوتے دیکھا۔ بعد میں رنگ بدل گیا۔ جب تک روزنامہ منتظر کے دفتر میں علامہ صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی تھی میں بھی اوروں کی طرح ان کو ایک کٹر مولوی اور پیشہ ور مقرر سمجھتا تھا مگر جب میں نے فرصت کے لمحات میں ان سے گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ علامہ صاحب دراصل دوہری شخصیت کے مالک تھے۔ وہ منبر والے ترابی اور تھے اور گھر والے ترابی اور۔ وہ دفتر اور گھر میں بے تکلف دوست تھے شائستہ اور لئے دیئے مذہب کے معاملہ میں بھی وہ مولوی کی طرح ضدی نہیں تھے۔ بلکہ افہام و تفہیم کے قائل تھے۔ ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ وہ شعر و ادب سے لے کر قرآن اور حدیث، فقہ اور رجال پر بھرپور نظر رکھتے تھے۔ ایک روز فرصت کے لمحات میں مسلمان فلسفیوں پر گفتگو ہو رہی تھی۔ علامہ صاحب بڑے نپے تلے الفاظ میں تبصرہ فرما رہے تھے کہ بیچ میں غزالیؒ کی احیاء العلوم کا ذکر آگیا اور انہوں نے غزالیؒ کے طرزِ استدلال کو بے حد سراہا، وہ علمی گفتگو اور تنقید کے معاملے میں تنگ دل نہیں تھے۔ مجھ کو شیعہ نہ ہونے کے باوجود "روزنامہ منتظر" میں نامہ نگار مقرر کرنا انہی کی وجہ سے ممکن ہو سکا تھا اس لئے کہ پہلی ملاقات میں میں نے اپنا ما فی الضمیر بیان کرتے ہوئے بتا دیا تھا کہ میں نہ سنی ہوں نہ شیعہ بلکہ مسلم ہوں، اس لئے کہ اللہ نے یہی نام ہمیں دیا ہے، تاریخ کو تاریخ کی طرح پڑھتا ہوں اور اس کو بدلنے کی کوئی صورت نہیں ہے، مسلمانوں کے اتحاد کا خواہشمند ہوں نہ کہ اختلاف کا، اور یہ چاہتا ہوں کہ تمام دنیا کے شیعہ اور سنی حضرات کم از کم ذہنی طور پر حضرت علیؓ کے دور کی حالت کو قبول کر لیں، جب سب کی اذان بھی ایک

تھی اور نماز بھی۔ دینیات کی تعلیم نہیں ہوئی تھی۔ اختلافِ رائے تو تھا دشمنی نہیں تھی۔
علامہ صاحب نے جب روزنامہ منتظر اور رہبر المنتظر کے نگران اور مدیرِ اعلیٰ کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو لوگوں کو یہ توقع بھی نہیں تھی کہ علامہ صاحب مدیر مسئول پر ذمہ داری ڈالنے کے بجائے خود اپنی مرضی سے پلاننگ کریں گے میں نے تو یہ دیکھا کہ ترابی صاحب ایک طرف اداریہ لکھنے پر بھی قدرت رکھتے تھے اور دوسری طرف نیوز کے گیٹ اَپ (GET UP) کا بھی اہتمام کر سکتے تھے اس بات میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ منتظر اور المنتظر کے پرچے اور خصوصاً ایڈیشن تمام باقی پرچوں سے زیادہ خوبصورت ہوتے تھے، ترابی صاحب میں صحافتی ذمہ داری کا احساس بھی تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ جرائم کی رپورٹ کرتے ہوئے میں جلدی میں ان لوگوں کے نام بھی لکھ گیا کہ جو پولیس ہیڈ آفس کی ڈیلی رپورٹ میں ایک بڑی سرکاری چوری کے سلسلہ میں آئے تھے۔ ان ناموں میں ایسے دو آدمیوں کے نام بھی تھے جو کراچی کی ایک بہت بڑی غیر ملکی فرم سے تعلق رکھتے تھے خبر کے چھپتے ہی انہوں نے ہتک عزت (DEFAMATION) کا نوٹس بھیج دیا۔ اور کئی ہزار روپے کا مطالبہ کیا، جب میں دفتر پہنچا تو ترابی صاحب اس کو پڑھ رہے تھے، پڑھنے کے بعد مجھے دکھایا اور میری رائے پوچھی، میں نے بتایا کہ جب پولیس نے ہم کو اس رپورٹ میں نام نوٹ کرنے سے نہیں روکا تو اس کا مطلب صاف ہے کہ وہ خبر میں جا سکتے ہیں۔ اس لئے ہم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے اگر وہ چور ثابت نہ ہوئے تو مقدمہ کے بعد ہتکِ عزت کا دعویٰ ان پر ہو سکتا ہے، جنہوں نے ان پر شک کیا تھا نہ کہ ہم پر۔ ترابی صاحب مطمئن ہو گئے اور نوٹس کا جواب اسی طرح بھیج دیا گیا میں نے دیکھا کہ اس موقع پر اور لوگ تو ذرا پریشان تھے مگر علامہ صاحب پر کوئی اثر نہ تھا، میں حسبِ معمول کام کرتا رہا، لیکن برا ہو تعصب، رشک اور حسد کا کہ ایک صاحب کے ابھار پر جو پہلے بھی ایک اخبار میں میری کاٹ کر چکے تھے اور اب بھی اپنے آپ کو مجھ سے زیادہ اہل

پرچے کی نمائندگی کا مستحق سمجھتے تھے۔ یہ مطالبہ کیا گیا کہ مجھے ادارے سے صرف اس لئے علیحدہ کر دیا جائے کہ میں شیعہ نہیں ہوں۔ مگر ترابی صاحب نے اس دلیل کو تسلیم نہیں کیا اس لئے کہ خبروں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، لیکن کب تک۔ مطالبے نے زور پکڑا اور علامہ صاحب نے خاموشی اختیار کر لی۔ تو خود میں نے ہی آگے بڑھ کر اس قصہ کو چکا دیا۔ اس طرح میرے علامہ رشید ترابی سے دوستانہ تعلقات میں کوئی فرق بھی نہ آیا اور مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

علامہ صاحب سے میری آخری ملاقات ٹیلی فون پر اس وقت ہوئی جب میں ۱۹۷۲ء میں لندن روانہ ہونے والا تھا۔ ذاتی طور پر ملنے کا وقت نہ نکال سکا، انتظامی امور اور ہنگامی حالات کی وجہ سے خاصی پریشانی تھی، علامہ صاحب سے کئی برس ملاقات نہ ہو سکی تھی تو انہوں نے ایک دوست سے کہلوایا کہ نیازی سے کہو کہ وہ برسوں غائب نہ رہا کریں۔ زندگی کا کیا بھروسہ۔ میرے لندن جانے کا مقصد انکو معلوم تھا، میں تحقیق فلسفہ و تاریخ میں گزشتہ برسوں سے مصروف ہوں۔ اور پندرہ برس میں صرف تین کتابیں لکھ سکا ہوں۔ ان میں سے ایک علیؑ ابن ابی طالب اور ان کا مکتبۂ فکر، انگریزی (ALI IBN ABI TALIB AND HIS THOUGHT) بھی شامل ہے جس میں نہج البلاغہ کے صرف ان خطبات پر کام کیا گیا ہے، جو حمدِ باری تعالیٰ سے تعلق رکھتے ہیں اور فلسفۂ الٰہیات میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ میرے اس کام میں جناب مصطفےٰ جوہر مرزا الہ آبادی (مرحوم)، میرے کرم فرما راجہ صاحب محمود آباد (مرحوم)، اور علامہ رشید ترابی (مرحوم) سب ہی کو دلچسپی تھی۔ لے دے کے ۱۹۷۳ء جس میں راجہ صاحب اور ترابی صاحب جیسے دو عالم فاضل دوستوں کی صحبت و ملاقات سے محروم ہوا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

ایک ہمہ گیر شخصیت

راوی: منور عباس (ایڈوکیٹ) تحریر: امیر حسین

علامہ صاحب سے میری ملاقات ۱۹۵۰ء میں ہوئی، میں اسی زمانے میں ہندوستان سے پاکستان آیا تھا۔ پاکستان آنے سے پہلے میں نے ہندوستان میں ترابی صاحب کے مخصوص فنِ خطابت کی بڑی تعریفیں سنی تھیں۔ راجہ صاحب محمود آباد سے میرے اچھے مراسم تھے۔ انہی کے ہاں ایک مرتبہ علامہ جارچوی صاحب نے ترابی صاحب کا ذکر کیا اور ان کے طرزِ خطابت کی بیحد تعریف کی۔ علامہ جارچوی صاحب کی زبانی علامہ ترابی کی تعریفیں سن کر مجھ میں پاکستان آنے کا شوق بیدار ہوا کیونکہ ویسے بھی علامہ جارچوی کہہ چکے تھے کہ پاکستان ضرور جائیں وہاں کراچی میں علامہ رشید ترابی مجالس پڑھتے ہیں۔ آپ نے انہیں نہیں سنا تو کچھ نہ کیا۔ خیر انہی دنوں میرا پاکستان آنا ہو گیا، ترابی صاحب اس زمانے میں اپنا روزنامہ "المنتظر" نکال رہے تھے اور مجالس خراسان میں پڑھا کرتے تھے۔

میں نے کراچی آنے کے بعد پاکستان شیعہ مجلس کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، میری ترابی صاحب سے اب تک ملاقات نہ ہو سکی تھی، ترابی صاحب ان دنوں "المنتظر" سے متعلق مالی پریشانیوں کا شکار رہتے تھے اور پرچے کی باقاعدہ اشاعت جاری رکھنا ان کے لئے دشوار ہو گیا تھا، بہرحال ایک دن میں ترابی صاحب کی مجلس

سن رہا تھا کہ دورانِ تقریر اچانک ترابی صاحب نے "المنتظر" کی مالی پریشانیوں کا ذکر چھیڑ دیا اور کہا اب میں یہ اخبار پاکستان شیعہ مجلس کے حوالے کر رہا ہوں، ترابی صاحب کے اس اعلان کے بعد میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی اور اس کے بعد مجھے گویا ترابی صاحب سے عشق ہو گیا۔ موصوف کو بھی مجھ سے عقیدت مندانہ قلبی لگاؤ پیدا ہو گیا اور اس کے بعد سے مرتے دم تک ساتھ رہا، ہم نے مل کر سادات ہاؤسنگ سوسائٹی کی بنیاد ڈالی، ایک ساتھ پلاٹ لئے اور پھر برابر برابر مکان بنوائے۔ جہاں تک ترابی صاحب سے کسی یادگار ملاقات کا تعلق ہے تو میری ان سے ہر ملاقات یادگار ملاقات ہوتی تھی۔ میں ہمیشہ ان سے کچھ نہ کچھ لے کر ہی اٹھتا تھا۔ میں ترابی صاحب سے اپنی دیرینہ رفاقت کا دعویٰ نہ کرنے کے باوجود یہ کہوں گا کہ میرے ان سے خوب مراسم تھے شاید اسی کے پیشِ نظر ایک بار علامہ صاحب کی اہلیہ کو یہ کہنا پڑا بھئی علامہ مرحوم سے مرزا پویا اور منور صاحب جس قدر نزدیک ہیں اتنے شاید ہم بھی نہیں، بہرحال علامہ صاحب مجھ سے ہر معاملے میں مشورہ کرتے تھے بلکہ مرحوم نے ایک بار کسی محفل میں کہا تھا کہ بھئی میں کسی معاملے میں ایک رائے قائم کر لیتا ہوں۔ لیکن منور عباس صاحب میری رائے بدل دیتے ہیں۔

علامہ مرحوم کی یہ عادت تھی کہ جب بھی کسی سفر پر جاتے میرے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لاتے، اُن کے دیئے ہوئے تحائف میں مٹی کا عطر اور افریقہ کے ایک خاص جانور کی ہڈیوں سے بنی ہوئی چھڑی جس کے استعمال پر افریقہ میں لائسنس ہے، بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ترابی صاحب کی زندگی کا ایک یادگار واقعہ جو انہوں نے مجھے خود سنایا تھا مجھے یاد ہے کہ غالباً ۱۹۵۰ء میں جب پاک و ہند کے سیاسی معاملات الجھے ہوئے تھے اور دونوں ممالک کے درمیان ویزا کی "رسم" نہیں تھی تو علامہ مرحوم کو پاکستان آنے کے لئے پائلٹ کی یونیفارم پہننا پڑی اور

وہ ایک ہوا باز کا روپ دھار کر پاکستان پہنچے، پاکستان آنے کے بعد مرحوم بزرٹاؤن کراچی میں ایک کلرک کے کوارٹر میں رہے۔ اتفاق سے یہ کلرک میرا ایک قریبی عزیز تھا میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان آکر مرحوم نے چند ماہ بڑی پریشانیوں میں گزارے اور ہر دور میں قناعت پسند رہے۔

ترابی صاحب کے بارے میں یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ انہوں نے اپنی ان گنت مجالس میں سے چند مجالس ایسی بھی پڑھی ہیں جنہیں بلاشبہ عجیب وغریب کہا جا سکتا ہے، اس ضمن کی پہلی مجلس امام بارگاہ مارٹن روڈ کی ہے علامہ صاحب کوئی عشرہ پڑھ رہے تھے کہ ایک مجلس میں اس وقت کے وزیراعظم محمد علی بوگرا اطلاع کئے بغیر علامہ کی تقریر سننے چلے آئے، مجمع چونکہ بہت تھا اس لئے وہ اندر نہ آسکے اور باہر رہ کر ہی تقریر سنی۔ تاہم علامہ مرحوم نے ممبر سے وزیراعظم کو دیکھ لیا اور اسی وقت اپنے موضوع سے ہٹ کر ملت جعفریہ کے موضوع پر ایسی جامع اور بھرپور تقریر کی کہ وزیراعظم پر اس کا شدید ردعمل ہوا اور انہیں کہنا پڑا کہ میں تو سچ مچ شیعانِ علیؑ کے عقیدے سے بے خبر تھا، آپ مجھے کچھ لٹریچر دیجئے تاکہ میں شیعانِ علیؑ کے بارے میں مزید کچھ جان سکوں، علامہ کی یہ تقریر ایک گھنٹے کی تھی اور اس میں انہوں نے ملت جعفریہ کا مکمل تعارف کرا دیا تھا۔ علامہ کی دوسری یادگار تقریر اس زمانے میں ہوئی جب ایران کے وزیراعظم مصدق تھے اور انہوں نے تیل کو قومی ملکیت میں لیا تھا اس پر ہم نے اپنے ادارے کی طرف سے مارٹن روڈ میں ایک سیاسی جلسہ کیا تاکہ ایران کے اس اقدام پر ان سے ہدیہ تحسین پیش کر سکیں، جلسے کی صدارت چودھری خلیق الزماں کر رہے تھے، علامہ نے اس موقع پر اگرچہ ایک مکمل سیاسی تقریر کی تھی لیکن بظاہر ان کا موضوع "طبقات الارض" تھا، علامہ نے نہ صرف حاضرین جلسہ کو بیحد متاثر کیا بلکہ چودھری خلیق الزماں کو بھی اپنے

خطبۂ صدارت صرف یہ جملہ کہہ کر ختم کرنا پڑا کہ علامہ موصوف کی ایسی "مرصع غزل" کے بعد میں باقی کچھ عرض کرنے کے قابل نہیں رہا۔

علامہ کی تیسری ناقابلِ فراموش تقریر مارٹن روڈ میں عارف رضا صاحب کے زیرِ اہتمام ہوئی۔ دورانِ تقریر اتفاق سے سید الملت ہندوستان تشریف لے گئے۔ علامہ مرحوم نے انہیں دیکھا اور اس کے بعد جو "معجزہ" بیان کیا تو حاضرین بے اختیار واہ واہ کر اٹھے۔ علامہ نے سید الملت کا شجرہ امام حسن عسکریؑ سے مع تاریخ اس تسلسل سے بیان کیا کہ سید الملت کو کہنا پڑا کہ اس ترتیب سے شجرہ تو مجھے بھی یاد نہیں تھا۔

علامہ کی چوتھی یادگار مجلس ذاکر شہیدی صاحب کے ہاں ہونے والے عشرۂ محرم سے متعلق ہے۔ اتوار کا دن تھا، اس روز علامہ مرحوم نے اپنی زندگی کی طویل ترین تقریر کی تھی جس کا دورانیہ ڈھائی گھنٹے تھا۔ اس سے قبل علامہ جٹ لینڈ لائنز میں ادو گھنٹے کی تقریر بھی کر چکے تھے۔ علامہ صاحب کی اس ڈھائی گھنٹے کی تقریر کا موضوع کسی رسالے میں شائع ہونے والا ایک مضمون تھا۔ علامہ نے اس تقریر میں رسول کریمؐ کے بعد چلنے والے حنفی، اہلِ تشیع اور تصوف کے سلسلوں کی نشاندہی کی تھی۔ علامہ مرحوم کی پانچویں نہ بھولنے والی تقریر نشتر پارک کی ہے جو دس مجلسوں پر مشتمل تھی۔ اس کا موضوع "ایجوکیشن فلاسفی ان اسلام" تھا اور اس میں علامہ موصوف نے تعلیم پر لکھے جانے والے تمام کتابوں کے حوالے دیئے اور اسے اسلام کی کسوٹی پر کس کر حق و ناحق ثابت کیا۔

علامہ موصوف کو اپنی تصانیف میں "حیدر آباد کے جنگلات" جس کی تین جلدیں ہیں اور طب معصومینؑ زیادہ عزیز تھیں اس کے علاوہ مالک اشتر کے نام مولا علیؑ کے خط کا انگریزی ترجمہ جسے ایوب خان نے دس لاکھ کی تعداد میں چھپوا کر تقسیم کرایا تھا بطورِ خاص پسند تھا۔

علامہ مرحوم کی موت کے سلسلے میں میرا خیال یہ ہے کہ انہیں اپنی موت کا علم پہلے سے ہو گیا تھا جس کے ثبوت میں ان کی رضویہ سوسائٹی کی ایک تقریر پیش کی جا سکتی ہے، یہ علامہ مرحوم کی آخری تقریر تھی اور جس کا موضوع تھا یہ تھا کہ اپنی موت کا علم انبیاء کرام ہی کو نہیں بلکہ علماء کو بھی ہو جاتا ہے۔ علامہ کی موت سے پہلے جو بیماری لاحق ہوئی اس سے ان کا حافظہ بیحد متاثر ہوا تھا۔ وہ اکثر مجھ سے بعض اشعار کے مصرعے پوچھا کرتے اور کہتے بھئی اس بار ہمارا حافظہ بہت متاثر ہوا ہے، علاوہ ازیں جس دن علامہ کا انتقال ہوا اس دن اچھے بھلے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے خود اپنے تمام بچوں کو جمع کر کے وصیت کی اور پھر آٹھ گھنٹے بعد دل کے جان لیوا دورے کی زد میں آ کر داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔

علامہ صاحب سے متعلق آج آپ کے سوالات سن کر مجھے مرحوم کا ایک جملہ یاد آتا ہے کہ منور صاحب میں آپ کو بہت سی اہم اور غیر اہم باتیں اس لئے بتاتا ہوں کہ مر جاؤں تو تمہیں تمام واقعات کا علم رہے، علامہ صاحب کی یہ ایک پرانی عادت تھی کہ وہ جب بھی کہیں آتے جاتے مجھے ہر موقع پر فون کر کے تفصیلات سے فوراً آگاہ فرماتے

آج سے پندرہ برس پہلے یادگار مرتضوی کے چودہ سو سالہ جشن کے سلسلے میں ایک عظیم الشان اجلاس کا انعقاد علامہ مرحوم کا بہت بڑا کارنامہ ہے، یہ اجلاس رضویہ کالونی کے میدان میں کئی روز جاری رہا، دن میں دو دو اجلاس ہوتے تھے اور اس میں ایران و عراق کے علماء نے بطور خاص شرکت کی تھی۔ اس موقع پر علامہ مرحوم علماء کو دعوت دینے خود مشرق وسطیٰ تشریف لے گئے تھے لیکن نہ جانے کیوں غیر ممالک کے اخبارات نے یادگار مرتضوی کی اس تقریب کو "ورلڈ شیعہ کانفرنس" کا نام دے دیا اور ہندوستان کو اس اقدام پر مجبور ہونا پڑا کہ وہ ترابی صاحب کے منعقد کردہ اس اجلاس میں ایران، عراق، پاکستان اور مسلم بلاک کے علماء کو اس میں شرکت نہ کرنے

باقی صفحہ ۱۸۴ پر ملاحظہ کیجئے

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

علامہ رشید ترابی فنکاروں کی نظر میں

روایت شکن عالم

(کہانی نویس و حداتیکار) آغا نذیر کاوش

خطیبِ اعظم حضرت علّامہ رشید ترابی اعلی اللہ مقامہٗ کی ذات میں خداوندِ عالم نے متعدد صفاتِ ارفع مجتمع کر دی تھیں۔ وہ سحر بیاں خطیب، بلند پایہ دانشور، عظیم صحافی، اور منفرد شاعر تھے۔ دینی علوم کے علاوہ انہیں تاریخ، فلسفہ، نفسیات، سیاست، شعر و ادب اور عمرانیات پر یکساں عبور حاصل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی تقریریں مذکور علوم کی روشنی سے منور ہوتی تھیں۔ ان کے بیان کی اسی آفاقی وسعت کی بنا پر ان کے سامعین کا دائرہ کسی ایک فرقہ کے افراد تک محدود نہ تھا۔ ان کی مجالس میں ہر مکتبِ خیال کے لوگ بصد شوق شرکت کرتے تھے۔ گزشتہ نصف صدی میں شیعہ فرقے کے جن علماء اور ذاکرین نے شہرت پائی حضرت علامہ رشید ترابی ان میں سب سے منفرد و ممتاز حیثیت کے مالک تھے جس کی بڑی علامت یہ تھی کہ اپنے فرقے کے علاوہ انہیں ملتِ اسلامیہ کے دیگر تمام فرقوں میں بھی بے پناہ مقبولیت حاصل تھی۔ وہ گزشتہ نصف صدی کے غالباً واحد شیعہ عالم و خطیب تھے اور ان جن کی وفات کا غم ہر مدرسہ فکر کے افراد نے یکساں محسوس کیا ان کی شخصی عظمت، کی مذہبی خدمات کا اعتراف نہ صرف اندرونِ پاکستان ہر گوشے میں کیا گیا۔ بلکہ بیرونِ پاکستان بھی متعدد سربراہانِ مملکت نے انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت علامہ مرحوم و مغفور کو غیر معمولی ذہانت عطا فرمائی تھی جسکی بدولت انہوں نے فنِ خطابت کی فرسودہ اور پامال روایات سے نہایت جرأت مندی کے ساتھ انحراف کیا اور ان روایات کی جگہ وقت کے نئے تقاضوں

کو پیش نظر رکھ کر ڈرامائی طرزِ خطابت کی بنا ڈالی۔ ان کا نیا اندازِ بیاں اس قدر دل آویز اس قدر دل آویز و اثر انگیز ثابت ہوا کہ بہت ہی مختصر سی مدت میں دور دور سے لوگ کھنچ کھنچ کر ان کی مجالس میں آنے لگے۔ جب ان کی مقبولیت اس ہی برق رفتاری سے بڑھنی شروع ہوئی تو منبرِ رسولؐ کے بہت سے خود ساختہ اجارہ داروں نے ان کے ڈرامائی طرزِ خطابت کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا بعض قدامت پرست تو ان کی مخالفت کے جنون میں معیارِ اخلاق کی سطح سے بھی گر گئے۔ ان کی اہمیت و مقبولیت کو کم کرنے کے لئے قدامت پرستوں کے اس حلقے نے اپنی نجی محفلوں میں ان کی ذاتی زندگی کے دامن پر کیچڑ اچھالنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ لیکن یہ اختراع پردازی اور یہ اتہام تراشی بھی ان کے فنِ خطابت کی نئی شمع کو گل نہ کر سکی اور ان کے مخالفین کو جلد ہی پشیمان ہو کر میدانِ خطابت خالی کرنا پڑا۔

میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ میرے بڑے چچا جناب آغا مقصود مرزا (مرحوم) پر علامہ کا التفاتِ خاص رہا جس کی وجہ سے مجھے بھی کئی بار ان کی صحبت میں بیٹھنے کا فخر حاصل ہوا۔ میرے بڑے چچا قبلہ کو برصغیر پاک و ہند میں سوز خوانی میں بفضلِ تعالیٰ ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ حضرت علامہ کی اکثر و بیشتر مجالس میں وہی پیش خوانی کرتے تھے۔ اس تعلق سے میرے خاندان کے افراد حضرت علامہ کے حلقہ ارادت میں ہمیشہ شامل رہے اور اسی نسبت سے مجھے بھی ان سے نیاز کی عزت حاصل رہی۔ ان کی خطیبانہ شخصیت جہاں علم کا پروقار آئینہ تھی وہاں بحیثیت ایک عام انسان ان میں رفاقت، مروت، وضعداری، شفقت اور بے لوث خدمت کے جملہ اوصاف بھی بدرجہ اتم موجود تھے اور ان اوصاف کے کل ثبوت فراہم کرنے میں وہ بڑی مسرت محسوس کرتے تھے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ اپنے حلقہ احباب اور ان کے متعلقین کی کوئی نہ کوئی ذاتی خدمات

انجام دینے کے لئے از خود راہیں نکالنے کے لئے بے چین رہا کرتے تھے۔

ہر چند کہ میں بحیثیت کہانی نویس و ہدایتکار ایک عرصے سے فلمی صنعت سے وابستہ ہوں لیکن میں نے فلم میڈیم کے بارے میں حضرت علامہ مرحوم کے خیالات معلوم کرنے کی کبھی جسارت نہیں کی اور نہ کبھی انہوں نے میری موجودگی میں اس باب میں اپنی رائے کا اظہار کیا لیکن مجموعی طور پر فنونِ لطیفہ کے سلسلے میں جب بھی انہوں نے اختصار کے ساتھ اظہارِ خیال فرمایا تو ان کی وسعتِ فکر سے یہی ظاہر ہوا کہ وہ کسی بھی فنی ذریعہ اظہار کو (بشمول فلم) بجائے خود معیوب یا ناپسندیدہ نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ ہر ذریعہ ابلاغ سے ملک و ملت کی مفید خدمت کی جانی چاہیئے۔ آرٹ کا کوئی میڈیم بھی ہو اگر اس سے قوم میں حب الوطنی کا جذبہ بیدار و مستحکم ہوتا ہے اور اگر وہ میڈیم بلا واسطہ یا بالواسطہ قوم کی اخلاقی سطح بلند کرنے کی خدمت سرانجام دیتا ہے تو اس میڈیم سے وابستگی ان کے نزدیک باعثِ عار نہیں بلکہ وجہ افتخار تھی۔ انہی خیالات سے فنونِ لطیفہ کی جانب علامہ مرحوم کے فطری میلان کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے فنونِ لطیفہ بالخصوص ادبیات اور ڈرامہ کے فنی اسالیب کی اثر آفرینی کا احساس ان کے شعور میں رچ گیا تھا۔ یہی احساس شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے منفرد ڈرامائی اندازِ خطابت کے سانچے میں ڈھل کر مجالسِ عزا میں قوم کے سامنے آیا۔ اس طرزِ خطابت میں جب انہوں نے دین، تاریخ، فلسفہ، عمرانیات کے نکات کو یکجا کر کے ڈرامائی انداز میں جوشیلے زیر و بم کے ساتھ بیان کرنا شروع کیا تو ان کے عہد کی پوری نسل اس طرح متاثر ہوئی کہ ان کی وفات تک انہی کی گرویدہ رہی۔ آج بھی لوگ ان کی تقریروں کے ٹیپ اسی ذوق و شوق سے سنتے ہیں۔ مختصر سے وقت میں دقیق سے دقیق موضوع کے جملہ پہلوؤں کو سامعین کے دل و دماغ میں پیوست کر دینے کا جو ڈرامائی

سلیقہ نہیں تھا اس کی کوئی دوسری مثال نہیں پیش کی جاسکتی ۔ آج بھی کچھ مقرر ان کے انداز میں بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کے طرزِ خطابت کا وہ فطری بہاؤ اور ان کے اندازِ بیان کا وہ ڈرامائی جوش کسے حاصل ہوسکتا ہے ۔

ترابی صاحب مرحوم کی تقریر سن کر منجمد خون ، شعلہ بن کر رگوں میں دوڑنے لگتا تھا ، لہو کی یہی حرارت زندگی سے تعبیر کی جاتی ہے ۔ ترابی صاحب کی موت کے بعد زندگی کی حرارت ماند پڑ رہی تھی کہ میرے پیارے دوست امیر حسین نے علامہ رشید ترابی کی یاد دلا کر شعور کے بحر میں پھر تلاطم برپا کر دیا ہے ، ریڈیو اور ٹی وی پر ترابی صاحب کی تمام تقریریں باقاعدگی سے سنتا رہا ہوں ، موت کے اندھیروں میں گم ہونے والی اس آواز کے کچھ ٹیپ میرے پاس موجود ہیں ، جب ترابی صاحب کی یاد آتی ہے انہیں سن لیتا ہوں ، میں نے امیر حسین سے کہا ہے کہ وہ کتاب چھپتے ہی مجھے بھیج دے ورنہ میں اس کا پیمان پڑھنا فوری طور پر بند کردوں گا کہ اس سے ناراض ہونا تو میرے بس کی بات نہیں ۔



3/1/65.

(اداکار و فلمساز قوی)

علم کا سمندر

علامہ رشید ترابی (ان پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں) علم و ادب کا سمندر، خطابت کے علمبردار تھے۔ لا الٰہ کے مفسر کو خالقِ حقیقی نے اپنے پاس بلا لیا۔ شاید ان کا فرض پورا ہو چکا تھا۔

میں نے ہمیشہ ان کے پاس پہنچنے کی کوشش کی جب وہ اپنے علم کے خزانے بکھیرتے تھے اور کوشش کی کہ ان کے خزانے سے چند موتی، انمول موتی چنوں۔ ان کو سن کر بڑے بڑے پتھر دل پگھل جاتے تھے۔ اب وہ ہمارے درمیان نہیں رہا۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں۔ بقول شاعر۔

اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون؟
ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟

اُن کا ایک پرستار

خلیل احمد

(موسیقار)

۲ جنوری ۷۵ء (لاہور)

لہجوں کا بادشاہ

(اداکار) ابراہیم نفیس

سب سے پہلے ترابی صاحب قبلہ کو قریب سے دیکھنے کا موقع اس وقت نصیب ہوا جب وہ ایک سہ روزہ نامہ "المنتظر" نکالتے تھے۔

یوں تو ترابی صاحب قبلہ کو مجلسیں پڑھتے ہوئے کئی سال سے دیکھ رہا تھا۔ مگر جب بھی دیکھا تو منبر پر ہی دیکھا یعنی میری آنکھوں اور ان کے منبر کے بیچ ہزاروں کی تعداد میں سر ہی سر ہوتے تھے اس زمانہ میں علامہ امام باڑہ مارٹن روڈ میں جسے لوگ اب امام بارگاہ شاہِ نجف کے نام سے جانتے ہیں، عشرۂ محرم پڑھا کرتے تھے۔ اور جو مجمع ان دنوں ہم نے وہاں دیکھا ویسا مارٹن روڈ کو شاید ہی اب کبھی نصیب ہو۔

ہاں تو ترابی صاحب قبلہ کو میں نے المنتظر کے دفتر میں جہانگیر روڈ پر دیکھا۔ آج کل اس دفتر کی جگہ ہمدرد دواخانہ کا مطب ہے۔ میرے پدر بزرگوار سید علی مقتدس رضوی مرحوم ان دنوں اکثر شام کو ترابی صاحب قبلہ کے پاس جایا کرتے تھے۔ ایک دن انہیں کے طفیل علامہ کی زیارت قریب سے نصیب ہوئی۔

ترابی صاحب قبلہ کی گفتگو کا انداز ان کے اندازِ خطابت سے قدرے مختلف تھا، میرے ذہن پر ان کے لہجے کے ٹھہراؤ نے ایک ایسا اثر کیا کہ لفظوں کو اتنے ہی تیقن سے بولنے کی بھی بار بار آرزو پیدا ہوئی ——— اور شاید لہجہ، آواز اور لفظوں کو پورے یقین کے ساتھ ادا کرنے والی بات تحت الشعور میں کچھ ایسے بیٹھ گئی کہ مجھے ہمیشہ کے لئے لفظوں اور لہجہ کی دنیا سے وابستہ کر گئی۔ آغازِ سفر سے مکالمہ نوازی تک کا طویل سفر اسی لہجہ کی روشنی میں طے ہوتا رہا اور ہو رہا ہے۔ لاشعور میں در آنے والے اس لہجہ کے بارے میں جب

سوچتا ہوں تو حیرت ہونے لگتی ہے کہ ـــــ کہاں کی بات کہاں تک پہنچی ـــــ

ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہو کر میں اناؤنسر کی حیثیت سے ریڈیو پاکستان حیدرآباد چلا گیا۔ والدین کراچی میں تھے ـــــ ایک سال بعد بہت کوششیں کیں کہ کراچی آجاؤں مگر ناکام رہا ـــــ آخر ایک مرتبہ پھر والدِ محترم سیّد علی مقدس رضوی مرحوم نے ترابی صاحب قبلہ سے مسرخی حال کی۔

علامہ نے ایک خط جناب زوالفقار علی بخاری کے نام جو ان دنوں ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل تھے لکھا۔

مضمون کچھ یوں تھا ـــــ

"ابراہیم نفیس سلمہٗ سیّد علی مقدس رضوی صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ انہیں حیدرآباد سے کراچی بلا لیجئے۔

میں ممنون ہوں گا ـــــ رشید ترابی"

یہ علامہ کی زیارت کا دوسرا موقع تھا۔ میں کراچی آگیا ـــــ اور ۱۹۶۶ء تک ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستہ رہا۔

۱۹۶۵ء میں والدِ محترم ـــــ کا جب انتقال ہوا تو ان کی ناگہانی موت پر علامہ کو بھی بہت صدمہ تھا، علامہ نے والدِ محترم کی موت پر حکمہ تعلیم سے گفتگو کی اور سرخ فیتہ کے حامیوں کو ہلا کے رکھ دیا۔

ان کی یہ باتیں ہمارے گھر والوں کو ہمیشہ یاد رہیں گی ـــــ ان کی دوست نوازی کو کبھی بھی نہیں بھلایا جا سکتا۔

پروردگار انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

بیٹی کا باپ

راوی : اداکار منور سعید

تحریر : امیر حسین

مجھے ترابی صاحب مرحوم سے دس بارہ مرتبہ ملنے کی سعادت نصیب ہوئی، نصیر ترابی میرا دوست ہے اس لئے کئی بار مجالس کے علاوہ ویسے بھی گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ حضرت علامہ رشید ترابی جیسے بڑے خطیب، عالم اور برگزیدہ شخصیت یوں تو میں نے بارہا منبر پہ دیکھی تھی لیکن ایک تقریب میں، میں نے انہیں ان کی تمام صفات سے ہٹ کر دیکھا اور محسوس کیا۔ یہ تقریب دراصل ان کی صاحبزادی کی شادی کی تقریب تھی، میں نے اس دن ترابی صاحب کو بالکل ایک عام آدمی کی حیثیت سے دیکھا۔ وہ حقیقتاً اس دن علامہ رشید ترابی نہیں بلکہ صرف ایک بیٹی کے باپ معلوم ہو رہے تھے، وہ اس دن بوکھلاہٹ، پریشانی، احساس جدائی، رنج والم غرض ان تمام احساسات سے دوچار تھے جن سے عموماً بیٹی کا باپ ہوا کرتا ہے اس وقت ترابی صاحب کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو میں اس واقعہ سے اس قدر متاثر نہ ہوتا لیکن وہ لازوال اور عظیم المرتبت خطیب جس کے لئے لاکھوں کے مجمع سے خطاب کرنا گویا معمول بن گیا تھا اور جو نروس ہونا تو درکنار لوگوں سے ان کا ذہن چھین لینے کا کمال رکھتا تھا، وہ شخص آج مجھے سچ مچ نروس دکھائی دے رہا تھا۔ اس روز ترابی صاحب کو اس کیفیت میں دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ بیٹی کا باپ ہونا کیا ہوتا ہے؟

بحیثیت خطیب علامہ مرحوم کے سلسلے میں یہ کہنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ انہوں نے غالب اور اقبال کے فلسفے اور ان کی شاعری کے بعض پہلوؤں کو اپنی تقاریر میں جس انداز سے اجاگر کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے، ان کی دوررس نگاہیں مذکورہ شعراء پر جس جس زاویے سے

پڑیں، ممکن ہے اس پر ہمارے عہد کے دانشور اور ناقدین بھی انگشت بدنداں رہے ہوں، یوں تو ترابی صاحب کے تیوروں میں اقبال اور فکر میں غالب صاف جھلکتے تھے لیکن اس عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے ہر قسم کے سامعین اور حاضرین کے شعور کی انگلی پکڑ کر چلنا میری دانست میں بہت مشکل کام ہے، لیکن ترابی صاحب اس معاملے میں کمال رکھتے تھے۔ خطیب کا اپنے سامعین کے مزاج سے آشنا ہونے ہی میں اگرچہ اس کی کامیابی مضمر ہوتی ہے مگر ترابی صاحب اس صفت کے ساتھ ساتھ اپنے سننے والوں کے مذاق کی تشفی کرنا اور انہیں ان کے علم کی مطلوبہ مقدار بہم پہنچانا بھی اپنا فرض سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ترابی صاحب اپنے کروڑوں مداحوں کے دلوں میں دھڑکن کی طرح بس گئے اور جب تک وہ زندہ ہیں ترابی صاحب کو یاد کرتے رہیں گے، کتنے عظیم اور خوش نصیب ہوتے ہیں وہ انسان جو مر کے بھی ہمیشہ زندہ ہیں، امیر حسین صاحب کا میں دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے علامہ رشید ترابی مرحوم پر شائع ہونے والی اس پہلی اور بھرپور کتاب کو ترتیب دیتے وقت مجھ ناچیز کو بھی یاد رکھا۔

ترابی صاحب کے بارے میں، میں صرف یہ ہی کہہ سکتا ہوں کہ۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

سلیمان

(فلمساز و ہدایت کار۔ ایس سلیمان)

نقوی صاحب نے قوم میں ایک نئی روح پھونکی اور عزاداریٔ حسینؑ کو نئے انداز اور نئے زاویوں سے سمجھایا، ان کی ہمہ گیر شخصیت کے بارے میں جو کچھ کہا جائے کم ہے۔ پاکستان کے مسلمانوں بالخصوص ملت جعفریہ کے ایک ایک فرد کو مرحوم پر ناز ہونا چاہیئے۔

3/1/75

(ہدایت کار قمر زیدی)

علامہ رشید ترابی ایک مکمل عالم تھے۔ ان کی تقریریں ہمیشہ میرے لئے زندگی کا اُجالا بنی رہی ہیں۔ انہوں نے خطابت کی نئی دنیا آباد کی تھی لیکن افسوس کہ موت نے انہیں ہم سے بہت جلد چھین لیا۔ کاش تا حیات ان سے استفادہ کرتے رہتے خدا مرحوم کو معصومینؑ کے صدقے میں غریقِ رحمت کرے۔ آمین۔

عنایت حسین بھٹی
3.1.75.

(اداکار، گلوکار، فلمساز عنایت حسین بھٹی)

عظمت کی دلیل

ہم نے پہلی بار ترابی صاحب کو چار پانچ سال پہلے ڈھاکہ میں ٹی وی پر دیکھا اور سنا تھا، اس وقت شاید ہمارا کہیں جانے کا پروگرام تھا لہذا یہ سوچ کر ترابی صاحب کی تقریر سننے بیٹھ گئے کہ تقریر غالباً دس پندرہ منٹ بعد ختم ہو جائے گی اور اس کے بعد ہم اپنے پروگرام کے مطابق جہاں جانا ہے وہاں چلے جائیں گے، ترابی صاحب مرحوم کی تقریر شروع ہوئی اور تقریباً ایک گھنٹے تک ہم بُت بنے انہیں سنتے رہے ان کی آواز اور انداز کے جادو میں ہم ایسے کھوئے کہ یقین جانئے ہمیں وقت گزرنے کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا۔ حالانکہ ترابی صاحب خاصی مشکل اردو بول رہے تھے لیکن اس کے باوجود ہم ان کی ایک ایک بات کا مطلب سمجھ رہے تھے۔

ترابی صاحب مرحوم کی کمی واقعی پوری نہیں ہو سکتی، ان کی عظمت کی دلیل اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ انہوں نے ہم جیسے لوگوں کو پہلی ہی بار اس قدر متاثر کر دیا کہ ہم ان کی تقریروں کے دیوانے ہو گئے اور اس دن کے بعد سے ہمیشہ ان کی تقریروں کے منتظر رہے

Shabnam.
3/1/75
(اداکارہ شبنم)

(ROBIN)
3.1.75
(موسیقار روبن گھوش)

ترابی صاحب ایک جید عالم اور بے مثال خطیب تھے ان کے بیان میں ایسی کشش تھی کہ مجھ جیسے بیشتر فنکار اپنی ہزار ہا مصروفیات کے باوجود ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر انہیں بطور خاص سنا کرتے تھے ان کی کمی پورا کرنا حقیقتاً محال ہے۔

شاہ زمان خان (اداکار و فلمساز ڈائریکٹر)

کاش میں علامہ ترابی جیسی عظیم المرتبت ہستی کے بارے میں اپنے احساسات الفاظ میں بیان کر سکتا! برصغیر پاک و ہند میں بہت کم عالم ایسے ہیں، جن کی باتیں دل کو لگتی ہیں، ترابی صاحب مرحوم ان میں سرفہرست ہیں۔ اللہ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

یوسف خان
3-1-75

(اداکار یوسف)

آنسو عبادت ہیں، اگر حسینؑ کے لئے بہائے جائیں۔ اور، الفاظ آنسو تھے، جو علامہ رشید ترابی صاحب کی زبان سے ادا ہوئے۔

اقبال رضوی
۳ جنوری ۷۵ء

(کہانی نویس اقبال رضوی)

ترابی صاحب مرحوم جہالت کی تاریکیوں میں روشنیوں کا سورج بن کر طلوع ہوئے، خاص طور پر ہم جیسے لوگ جو علم و ادب کی پیاس بجھانے صحرا صحرا پھرنے کا عزم رکھتے ہیں، ترابی صاحب کو سن کر بڑے مطمئن رہتے تھے...... لیکن۔ لیکن اب بقول شاعر، دلِ ویراں کا عجیب عالم ہے۔ میں اپنے نوجوان دوست امیر حسین کو ترابی صاحب پر کام کرنے کے سلسلے میں ہدیۂ تحسین پیش کرتا ہوں۔ خدا انہیں خوش رکھے اور ترابی صاحب مرحوم پر اپنی رحمت کے پھول برسائے، آمین۔

(اداکار، فلمساز وجاہت مرزا)

وجاہت مرزا
3.1.75

راوی: اداکار **کمال ایرانی**

تحریر: **امیر حسین**

علامہ رشید ترابی کی تقریریں برسوں سے سن رہا ہوں اور مجھے مرحوم سے اس درجے والہانہ عقیدت رہی ہے کہ ان کی موت کی خبر نے خونی رشتوں کی جدائی سے زیادہ تڑپایا ہے۔ میری یہ عادت تھی کہ علامہ مرحوم کی تقریر میں بالکل ان کے سامنے منبر کے نزدیک جا کر بیٹھتا تھا کہ انہیں دیکھے بغیر میری سماعت کچھ تشنگی محسوس کرتی تھی۔ بہرحال میرا برسوں سے یہ معمول تھا کہ ایک مرتبہ علامہ مرحوم نے بعد ختم مجلس پاک وطن ایسوسی ایشن کے ایک صاحب سے میرے بارے میں دریافت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ سیاہ شیروانی والے صاحب کون ہیں جو نہایت باقاعدگی اور سلیقے سے منبر کے سامنے آکر بیٹھتے ہیں میں انہیں گزشتہ کئی برسوں سے دیکھ رہا ہوں؟ لہٰذا جب ان صاحب نے بتایا کہ یہ اداکار کمال ایرانی ہیں تو ترابی صاحب نے مہربانی کرکے مجھے اپنے پاس طلب فرمایا اور بڑی شفقت سے مجھ سے میرے بارے میں دریافت کیا اور پوچھا کیا آپ کے گھر میں فارسی بولی جاتی ہے؟ میں نے کہا جی ہاں، ہمارے آباؤ اجداد ایران ہی سے متعلق ہیں۔ اس پہلی ملاقات کے بعد ترابی صاحب سے مجلسوں اور گھر میں کئی یادگار ملاقاتیں ہوئیں جن کی تفصیل انشاء اللہ "منبر کا دوسرا نام" کی جلد دوئم میں لکھوں گا تاہم فی الوقت یہ عرض کرتا چلوں کہ مرحوم ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اور میں نے انہیں حیرت انگیز حد تک عالم محسوس کیا ہے، انہوں نے فن اداکاری اور فلم کے موضوع پر مجھ سے جو گفتگو فرمائی کم از کم میرے لئے وہ حیرت کا باعث ضرور ہے انہوں نے ایران کے کسی بازار سے گزرتے ہوئے فلم "خانۂ خدا" کے پوسٹر دیکھے ہوں گے، ایک مرتبہ مجھ سے کہنے لگے آپ اداکاری کے ساتھ ساتھ اپنے اقتصادی تحفظ کے لئے فلم ڈسٹری بیوشن

بھی کیجیے، آپ چاہیں تو ایران سے میں "فلم" خانۂ خدا" آپ کو دلوا دوں گا میرے خیال میں وہ فلم پاکستان میں چلنی چاہیے۔ ہائے علامہ کی یاد بہت تڑپاتی ہے کاش وہ کچھ اور زندہ رہ جاتے!!

Grams: Phone:

JEEWAY LAL FILMS

MOTION PICTURE PRODUCERS & DISTRIBUTORS

جیوے لال

11, ROYAL PARK

Ref. No. .... LAHORE 3-1-75

یا علی باب العلم

یقین ایمان کی ابتدا ہے اور یقین ہی ایمان کی انتہا ہے

علامہ رشید ترابی صاحب کا یقین ہی ان کے عالم ہونے کا سب سے بڑا ثبوت تھا۔

اسی یقین نے انہیں ابو تراب حضرت علی کا عاشقانہ عقیدت مند بنا دیا تھا اور وہ سارے [illegible] اپنے یقین کی یقین کے ساتھ تدریج کرتے رہتے

مجھے علامہ صاحب مرحوم کی وہ تقریر اب تک یاد ہے جو انہوں نے شام غریباں کے سلسلے میں یقین کے موضوع پر کی تھی — علامہ نے بتایا تھا

مولا کا فرمان ہے۔

کہ بے یقینی کی بیداری سے یقین کا سونا اچھا ہے۔

دعا کیجیے کہ میں بھی یقین کی زندگی گزاروں [illegible]

اب خود تری آواز کو ترسے گی سماعت

منظوم خراجِ عقیدت

آلِ محمدؐ کا نوحہ خواں

شورش کاشمیری

سُونا پڑا ہے ذکرِ شہادت کا لالہ زار
واصل بحق ہے بلبلِ بستانِ اہلبیت

رخصت ہوا ہے آلِ محمدؐ کا نوحہ خواں
ہیں اشکبار حلقہ بگوشانِ اہلبیت

پینسٹھ برس کی عمر میں داغِ مفارقت؟
افسوس! ارتحالِ ثناخوانِ اہلبیت

لاہور سوگوار، کراچی فغاں بہ لب
ماتم کناں ہیں نغمہ سرایانِ اہلبیت

اس کی نظر تھی نہجِ بلاغہ سے فیضیاب
معمور تھا اس کی فکر کا ایوانِ اہلبیت

محشر کے روز اس کی شفاعت ہے بالضرور
سر پر تھا اس کے سایۂ دامانِ اہلبیت

ہر دور کے یزید کی طاعت حرام ہے
کرب و بلا میں تھا یہی اعلانِ اہلبیت

میں نے سُنا ہے اس سے فضائل کے ذکر میں
دیوانِ بوترابؑ ہے دیوانِ اہلبیت

رکھتا ہے اپنے دل میں شہادت کی آرزو
شورش ہے اس دیار میں دربانِ اہلبیت

جانِ تکلّم

رئیس امروہوی

وہ موجِ نطق — جوششِ تلاطم کہیں جسے
ایسا کلیم — جانِ تکلم کہیں جسے

ایسا خطیب جس پہ خطابت ہو خود نثار
ایسا ادیب جس پہ ادب کو ہے افتخار

ایسا سخن طراز کہ خود موجدِ سخن
ایسا نوا نواز کہ اک شاہکار فن
منبر نشیں کہ زینتِ محراب جس کی ذات
بلبل فروزِ علم تفکر کی کائنات
وہ ذاکرِ رموزِ شہادت بصد بیاں
الہامِ نطق جس کا بیاں ہو وہ خوش بیاں
ختم ذکر و خطبہ و فن کاری و ہنر
علامہ رشید ترابی کی ذات پر
وہ تھا رئیس فاتحِ دروازۂ عمل
آواز اس کی آج بھی آوازۂ عمل

منبر افروز شبستانِ خطابت میں رشید

حضرت نسیم امروہوی

علامہ رشید ترابیؒ ہر سال ماہِ رمضان میں اپنی قیام گاہ پر ہوئے ما بعد افطار قرآن کریم کی تفسیر بیان فرماتے تھے رمضانؑ کے آخری دن ملک کے ممتاز شاعر حضرت نسیم امروہوی صاحب تفسیر کا لب لباب نظم کرکے پیش کرتے تھے، ۱۹۷۰ء کے رمضان المبارک میں علامہ ترابیؒ نے سورۃ فتح کی تفسیر بیان فرمائی تھی اور آخری دن حسبِ معمول حضرت نسیمؔ امروہوی نے اس تفسیر کی روح ایک مسدس میں نظم کی تھی جس کے ابتدائی نو بند جو علامہ ترابیؒ کے متعلق ہیں، ہم نذرِ قارئین کر رہے ہیں۔

دُور دنیا سے ہوں میں آل کے دامن سے قریب
ہر سخن منصبِ پیغمبرِ ذوالمنن سے قریب
طائرِ فکر ملائک کے نشیمن سے قریب
اور قلم انا فتحنا کے فتحاؑ سے قریب
اسی سورہ کے مفسر کی ثنا کرتا ہوں
حق شناسی کا جو حق ہے وہ ادا کرتا ہوں

میں نہیں مدحتِ اربابِ جہاں کا خوگر
زر کے انبار اگر ہوں تو لگا دوں ٹھوکر
ہاں وہ مداح کے ممدوح کی جن پہ ہو نظر
ہوں وہ شاعر کہ خطیبان کا یہ حق ہے مجھ پر
جو یہ پہچان کر جو ہوں رتبے کتاب ایسے
کل انیسؔ ایسے تھے اور آج ترابیؔ ایسے

فاتحِ معرکۂ نطق و فصاحت ہیں رشیدؔ — واعظِ انجمنِ رشد و ہدایت ہیں رشیدؔ
ذاکرِ مجلسِ اسرارِ شہادت ہیں رشیدؔ — منبر افروزِ شبستانِ خطابت ہیں رشیدؔ
خاک میں فاضلِ طینت کا جو سرمایہ ہیں — برتر آبی میں ترابی کا لقب پایا ہے

خطبۂ حکمتِ قرآں خطابت اُن کی — افصحِ دہر کا فیضانِ فصاحت اُن کی
صرفِ پیرایۂ تبلیغ بلاغت اُن کی — منزلِ مدح میں مہدی سے ہدایت اُن کی
خود بھی تفسیر کے لائق ہیں مفسر ہی نہیں — صاحبِ فکر بھی ہیں صرف یہ ذاکر ہی نہیں

کشورِ پاک میں یہ ذکرِ حسینی کی فضا — زورِ تقریر سے ان کے ہوئی قائم بخدا
نطق ہے آپ کا اعجازِ تکلم گویا — نمکینیِ سخنِ شاہِ سلونی کی عطا
ان کی تقریر میں اِک وہ بھی مقام آتا ہے — جس جگہ عرش سے منبر پہ کلام آتا ہے

اے زہے ماہِ مبارک کے یہ وعظ اور یہ بیاں — اِک خدا ترس کی اِک صورتِ صومِ رمضاں
سورۂ فتح کی تفسیر کا نادر عنواں — دم بدم قلب پہ سامع کے نزولِ قرآں
نطق قبضے میں ہے تاثیر ہر اک بات میں ہے — یہ بیاں انا فتحنا کا فتوحات میں ہے

اللہ اللہ یہ آیات کی محکم تفسیر — ایک موضوع پر ایک ماہ مسلسل تقریر
اور تقریر بھی ایسی کہ ہدایت تاثیر — قدرتِ لفظ و بیاں لطفِ خداوندِ قدیر
ذاکری مسلکِ اعلیٰ نکتہ وری کیا کہنا — ذکر میں فکر کی بھی جلوہ گری کیا کہنا

وعظ و تفسیر میں سن سن کے کلامِ باری — روزہ داروں پہ نمازوں کا تھا عالم طاری

صوم کی جان مئے عشق کی یہ سرشاری
یہی گویا سحری اور یہی افطاری
لطفِ منظر سے بھی اس کیف کی تائید ہوئی
ختم جب قسط کی تفسیر ہوئی عید ہوئی

بحثِ تفسیر میں وہ فکر و نظر کی وسعت
حج کی تجویز، سفر، صلح بشکلِ بیعت
مژدۂ فتح، غم ماتم، غضب حق، لعنت
غلبہ دیں کا، توثیق رسالت تمت

ان کی بھی مدح و ثنا جو ہیں نبیؐ کے ہمراہ[1]
استوار ایسے کہ حق جیسے علیؓ کے ہمراہ

---
[1] صحابہ کرامؓ

کلامِ سکوت

صہبا اختر

کلام ساکت ہے، حرف چپ ہیں — تمام آئینہ ظرف چپ ہیں
ٹھہر گئی فکر کی روانی — اُجڑ گیا عالمِ معانی
حجابِ ظلمت گرا دیا ہے — یہ کس نے سورج بجھا دیا ہے
دیارِ لوح و قلم کٹا ہے — میں کس سے پوچھوں کہ کیا ہوا ہے
کسی کو اپنا پتا کہاں ہے — شکستِ دل کی صدا کہاں ہے
خطیبِ اعظم کو ڈھونڈتی ہے
بس ایک چپ ہے، کہ گونجتی ہے

وہ جب بھی لہرا کے بولتا تھا — گرہ ستاروں کی کھولتا تھا
ستارے لفظوں سے ٹوٹتے تھے — اُجالے ہونٹوں سے پھوٹتے تھے
کبھی وہ طوفانِ گفتگو تھا — کبھی وہ بارانِ جستجو تھا
کبھی گرج تھا، کبھی کڑک تھا — کبھی مہک تھا، کبھی چمک تھا
کبھی وہ ناوک، کبھی وہ مرہم — کبھی وہ شعلہ، کبھی وہ شبنم
ہزار چہرہ جمال تھا وہ
کہ علم و فن کا کمال تھا وہ

بصد تفکر، بصد ذہانت — بصد تکلم، بصد خطابت

کبھی دلِ بے فراغ بن کر　　کبھی سراپا دماغ بن کر
رسولِ حق پر نظر جما کر　　محمدیت کا علم اُٹھا کر
فنونِ علم و ہنر جگا کر　　چراغِ دانش سے لَو لگا کر
اشارۂ بوتراب پا کر　　فرازِ منبر پہ سر جھکا کر
ولائے حق کو اُبھارتا تھا
دلوں میں قرآں اُتارتا تھا

حسینؑ مظلوم کی صدا تھا　　وہ مرثیہ خوانِ کربلا تھا
غلامِ ابنِ بتولؑ تھا وہ　　خطیبِ آلِ رسولؐ تھا وہ
گہے مدینہ، گہے نجف تھا　　ہر ایک دَر سے اُسے شرف تھا
سحابِ علم و ہنر کی بارش　　رشیدِ حکمت، شہیدِ دانش
جسے تھی حاصل ستارہ تابی　　جو فخرِ انجم تھا وہ ترابی
کبھی تبسم تھا وہ وفا کا
کبھی وہ آنسو تھا کربلا کا

وہ عقل و علم و ہنر کا پیکر　　رئیسِ مجلس، انیسِ منبر
فقیہِ آفاقِ حق پسندی　　صلیبِ عیسائے درد مندی
جہادِ علم و ہنر کا غازی　　کلیمِ طورِ سخن نوازی
وہ ایک دریا، ہزار دریا　　وہ نطق کا بے کنار دریا
دماغ شاداب کر رہا تھا　　جو سب کو سیراب کر رہا تھا

زمین کی تہہ میں سو رہا ہے
کہ جو حنی کو ڈرسے جاتا ہے

فراق کس زیبِ زین کا ہے
صلہ یہ ذکرِ حسینؑ کا ہے
کہ اُس کو روئیں گے لوگ برسوں
رہیں گے آنکھوں میں سوگ برسوں
ثنائے لوح و قلم کہاں ہے
وجودِ حق کو عدم کہاں ہے
کہ جا ہے آلِ نبیؐ کی خدمت
سمجھ کے منجملۂ عبادت
حیثیت کا کرم سلامت
اب اُس کی تربت پہ تا قیامت
سحاب رحمت کا چھایا ہوگا
ردائے زہراؑ کا سایا ہوگا

شہر آباد تھا ترابی سے

دلاور فگار

محوِ ماتم ہے منبرِ خاموش
کون مجلس سے ہو گیا روپوش!

سخت مشکل ہے صبر کی تلقین
کس طرح ہو نصیرؔ کو تسکین

کون ترتیب دے غلط نامہ
لوگ کس کو کہیں گے علامہ!

وہ مبلغ تھا، وہ مبصر تھا
وہ مفکر تھا، وہ مدبر تھا

ذکرِ سبطینؑ اس کا شیوہ تھا
وہ محمدؐ کا نام لیوا تھا

وہ جو رخصت ہوا ہے دنیا سے
لوگ ذکرِ علیؑ کے ہیں پیاسے

محفلیں ختم ہو رہی ہیں آج
مجلسیں اس کو رو رہی ہیں آج

خوش تھے ہم اس کی کامیابی سے
شہر آباد تھا، ترابی سے

اس کے مرنے سے بزم ویراں ہے
مرثیہ اس کا مرثیہ خواں ہے

قول میں اس کے قوتِ تحریر
وعظ، قرآن پاک کی تفسیر

اب وہ طرزِ انیسیات گئی!
مجلسوں میں جو تھی وہ بات گئی

شوق تھا اس کا یہ نہ عادت تھی
ذاکری اس کی اک عبادت تھی

اس عبادت کا یہ ملا انعام
خلد میں ہے وہ جاں نثارِ امامؑ

کھل گیا اس پہ زندگی کا بھید
اب ترابی ہے زندۂ جاوید!

اس میں پہلی سی اب وہ ضو نہ سہی
جل رہا ہے چراغ، لو نہ سہی

روشنی زاویے بدلتی ہے!
شمع اس رنگ میں بھی جلتی ہے

نذرِ عقیدت

سیّد آلِ رضا

سُنا ہے بارہا مجلس میں علامہ ترابی کو
سُن کر یہ اثر ہوتا رہا اپنی طبیعت پر

خطابت کی روانی ہے کہ موجِ نازشِ پیہم
فصاحت کی بلاغت پر، بلاغت کی فصاحت پر

مطالب کی بلندی ہے کہ حسبِ مقصدِ مجلس
حسینی ذکر کی سکّہ زنی طرزِ خطابت پر

رضاؔ اس رفعتِ حسنِ بیاں کا ساتھ دیدینا
بڑا احسان ہے، خود اپنے ہی ذوقِ سماعت پر

دعاگو
آلِ رضا

نوٹ: نامور شاعر جناب سید آلِ رضا نے یہ اشعار ۲۸ مارچ ۱۹۶۵ء کو علامہ رشید ترابی (مرحوم) کی ایک مجلس سے متاثر ہو کر ان کی خطابت کے بارے میں قلم برداشتہ نظم کئے تھے۔

تاریخ منجملی از مصرعہ دبیر

۱۹۷۳ء

مرگِ امینِ خطابت، علامہ روزگار، آفتاب آسمان دیں علامہ رشید ترابی

۱۳۹۳ھ ۔ (۵۸۰) ۱۹۷۳ء ۔ ۱۹۷۳ء

فکرِ محزون دلِ ضیاالحسن الموسوی العقابی

ہوک سی اٹھتی ہے دل میں دیکھ کے منبر کو آج

ہائے علامہ ترابی ہائے علامہ رشید

وہ خطابت جس پہ سایہ تھا لسان اللہ کا

مُصلحِ طرزِ قدیم و بانیٔ طرزِ جدید

خود خطابت جس کے اندازِ خطابت پر فدا

نطق جس سے حلقۂ حسنِ ارادت کا مُرید

جس کو حاصل تھا روایت کا وہ زریں سلسلہ

ہے جو آقائے بروجردی سے تا شیخ مفیدؒ

زندگی تھی وقف جس کی بہزاد کارِ حسینؑ

تھی یہی دُھن وہ محرم ہو کہ وہ ماہِ عید

مدحِ مولا میں رہا جو عمر بھر رطب اللسان

کیوں نہ ہو انعام اس کا ساقیٔ کوثر کی دید

یا علی کہہ کے جو اس دنیا سے رخصت ہو گیا
موت کا پیغام تھا گویا کہ جینے کی نوید

قبر میں روزِ وفاتِ ضامنؑ ثامن گیا
اے زہے قسمت کہ ہے راہِ رضا کا وہ شہید
اے حسنؔ تاریخِ رحلت فیضِ روح القدس ہے
۱ دونوں مصرعوں سے ہے ظاہر عظمتِ علمِ نقید
(۶۴۰) اک گُلِ بے رنگ ہے یا گوہرِ بے آب ہے
+
(۱۳۳۳) طورِ سینا ہے کلیم اللہ منبر ہے رشید
۱۹۷۳ء

(نوٹ) "مرگِ انیسِ خطابت" سے ہجری اور علامہ روزگار کے عدد شامل کر کے عیسوی تاریخ نکلتی ہے، ہمزہ کا ایک مستقل عدد حسبِ مسلکِ اساتذہ عظیم مثلاً نعمت خان عالی وغیرہ لیا گیا ہے (ملاحظہ ہو "گلبنِ تاریخ" تصنیف حکیم میر مہدی حسین رضوی آثم اور دیگر فنی کتب)

ضیاء الحسن موسوی

خطیبِ آلِ محمدؐ

انور عزمی

ہر اہلِ دل کی سماعت تیری کمان میں تھی
کچھ اس بلا کی روانی ترے بیان میں تھی

خطیبِ آلِ محمد کہوں نہ کیوں تجھ کو
جو گفتگو تھی شۂ کربلا کی شان میں تھی

تری صدا ترے لہجے کو لوگ ترسیں گے
کہاں یہ بات کسی شخص کے گمان میں تھی

ترے علوم سے روشن تھیں محفلیں غم کی
ترے ہنر کی تجلی ترے مکان میں تھی

تاثرات کا حامل تھا لفظ لفظ تیرا
غمِ امام کی شدت تری زبان میں تھی

بفیضِ خوبیٔ قسمت تجھے نصیب ہوئی
وہ ہر صفت جو محمد کے خاندان میں تھی

وہ مضطرب ہے کھلے آسمان کے نیچے
جو قوم تیری خطابت کے سائبان میں تھی

خطیبِ آلِ محمد تجھے سلام مرا
ہر ایک بات تری عشق کی زبان میں تھی

بلبلِ شعلہ نوا

سرور سنبھلی

اے حسینؔ گلستاں کے بلبلِ شعلہ نوا
کس سے پوچھیں آہ تو کیوں ہو گیا ہم سے خفا
چھوڑ کر ہم خوشہ چینوں کو کہاں تو چل بسا
تیرے غم میں رو رہی ہے علم و دانش کی فضا
اہلِ گلشن کے لبوں پر تیرا افسانہ ہے آج
ہر محب کی آنکھ کا لبریز پیمانہ ہے آج
کچھ عجب ہے تیرے غم میں تیرے مداحوں کا حال
تجھ کو بخشا تھا غمِ شبیرؑ نے ایسا کمال
اس گلستاں میں نہیں ملتی کوئی جس کی مثال
تیری خاموشی پہ ہر اہلِ چمن کو ہے ملال
سوزِ پنہاں تھا قیامت کا تری تقریر میں
قید تھے شعلے ترے الفاظ کی زنجیر میں
پردۂ حسنِ تخاطب میں وہ گلِ افشانیاں
معنیٔ و الفاظ میں وہ فکر کی گہرائیاں
حشر ساماں تھا سرِ منبر ترا زورِ بیاں
تیرے لہجے میں نہاں تھیں آگہی کی بجلیاں

علم کے دریا میں تیرے وہ روانی تھی کہ بس
صورتِ الفاظ میں وہ گل افشانی تھی کہ بس

ہر مقرر سے جدا تھا تیرا اندازِ بیاں
کھولتی تھی عقدہ ہائے زندگی تیری زباں

عقل ملتی ہے دو ہے عالم کے مسائل سے جہاں
تھا وہیں پر جلوہ گر تیرا شعورِ کامراں

تیرے ہر جملے میں رمزِ آگہی پوشیدہ تھی
تیرگی کے دور میں تیری نظر حق دیدہ تھی

تجھ کو قدرت نے دیا تھا تحفۂ اعلیٰ دماغ
تیری تقریروں سے ملتا تھا رہِ حق کا سراغ

بادۂ حق سے بھرا تھا تیری فطرت کا ایاغ
تھا غمِ شبیرؑ سے شاداب تیرے دل کا باغ

آئے گا جب عشرۂ ماہِ محرم اب کے سال
تجھ کو ڈھونڈے گی نظر منبر پہ اے شعلہ مقال

ہائے علامہ رشید

مرزا فتح علی بیگ عارف

مرتبہ ایسا نہ کیونکر پائے علامہ رشیدؒ
ہوگئی خلدِ بریں میں جائے علامہ رشیدؒ

وہ نصیرِ ملتِ بیضا عقیل و نکتہ سنج
ہر گھڑی سب کو نہ کیوں یاد آئے علامہ رشیدؒ

سر پہ تھی جس کے خطابت کی کلاہِ خسروی
اور تھا منبر ہمیشہ جائے علامہ رشیدؒ

مدتوں سے پا سکا کوئی نہ عالی مرتبہ
ڈھونڈھ کر ایسی خطابت لائے علامہ رشیدؒ

تھا فصیحِ بے بدل اور اک خطیبِ بے مثال
اس خطابت کو نہ کیونکر بھائے علامہ رشیدؒ

سب فضائل اور مصائب حضرتِ شبیرؑ کے
اک سند ہیں گر یہاں فرمائے علامہ رشیدؒ

سایہ افگن دامنِ خیر النساؑ سر پہ رہا
خلد میں پھر کیوں نہ درجہ پائے علامہ رشیدؒ

پہنچے جب فردوس میں مداحِ آلِ مصطفیٰؐ
کہہ اُٹھا رضوانِ جنت آئے علامہ رشیدؒ

آرہی ہے ربعِ مسکوں سے یہی عارفؔ ندا
ہائے علامہ ترابیؒ ہائے علامہ رشیدؒ

خوش بیاں اک مفسرِ قرآن

قمر ہاشمی

ہم سے کس کو اجل نے چھینا ہے
دینِ مُلّا نہ تفقہ رازی

جس کے صدمے سے چھلنی سینا ہے
صاحبِ عقل و ہوش یہ غازی

لفظ کی گرہیں کھولنے والا
حافظ وہ کہ ناظرہ کیا ہے

روحِ معنیٰ کو تولنے والا
ذہن سوچے کہ ماجرہ کیا ہے

خوش بیاں اِک مفسرِ قرآن
عالم ایسے کہ علم بھی نازاں

دل پذیر اس کی ایک اک برہان
ذاکر ایسے کہ صبر بھی گریاں

کتنا سنجیدہ نقطۂ آغاز
شاعر ایسے سماعتیں جھومیں

لحظہ لحظہ ورق پا انداز
لفظ نطقِ بلیغ کو چومیں

بزم کی بزم ہو گئی دلگیر
وہ طلاقت کہ گوش برآواز

آپ نے دیکھا شعلۂ تقریر
لب و لہجہ بیان کا دمساز

بات کیا تھی، کہاں پہ جا پہنچی
قال کا حلقۂ گلدستہ ہائے

لو زمیں آسماں پہ جا پہنچی
سامنے ان کے گفتگو شرمائے

عافیت کوشش ان کے جو رہا
کیا صدا تھی جو دشت و در گونجی

اُنس کا بیج عمر بھر بویا
قریہ قریہ بچشمِ تر گونجی

نفرتوں کا چراغ کیا جلتا
اب بھی احساس ہوگا سالوں تک

ذہن میں افتراق کیوں پلتا
شام سے صبح کے اجالوں تک

قلم کی دھجیاں بکھیر دیں گے
نقشۂ معصومیت کا کھینچیں گے

وہ نگاہوں میں زینب آگئی ہیں
قیدی عابدؑ کو ساتھ لائی ہیں

گوشۂ چشم خون روتا ہے
آدمی کا سکون روتا ہے

ربّ کونین کی وہ توجیہات
قاب قوسین کی وہ تشریحات

اک خطیب شہیر علّامہ
عصر نو کے دبیر علّامہ

کیا بذہن عقیل سوچوں میں
کیا دلاسا نصیر کو دوں میں

آرزو تھی کہ وہ شفا پائیں
ان کے بدلے ہمیں نہ مرجائیں

اک محرّم تو اور سن لیتے
پھول طرزِ بیاں کے چن لیتے

استقامت حسینؑ کی سنتے
ان کے لہجے پہ اپنا سر دھنتے

ایسے نکتے بیاں کرے گا کون
قلب اپنے تپاں کرے گا کون

ولدِ علّامہ ترابی رفت
شارحِ عظمت کتابی رفت

تیرے بغیر

سبطِ حسن انجم

محروم تمکنت ہوئی ملت تیرے بغیر
اے فخرِ قوم اب ہے یہ حالت تیرے بغیر

ملت کی جان حضرت علامۂ رشید
بے جان ہو گئی ہے قیادت تیرے بغیر

کس بل ہے بازوؤں میں نہ طاقت جگر میں ہے
گویا جواب دے گئی ہمت تیرے بغیر

الجھے گا کون دشمنِ تازہ سے ہر قدم
دم خم کسی میں اب ہے نہ جرأت تیرے بغیر

دنیا دکھائی دیتی ہے کچھ اجنبی سی اب
اے مرکزِ نگاہِ محبت، تیرے بغیر

انسانیت ہے سر بگریباں و سرگراں
اے پیکرِ شرافت و عظمت تیرے بغیر

اب تشنگانِ علم کہاں جائیں کیا کریں
تسکین کی نہیں کوئی صورت تیرے بغیر

عالم کی موت اصل میں عالم کی موت ہے
پیشِ نظر ہے اب یہ حقیقت تیرے بغیر

جیسے کہ بے چراغ سرِ شام ہو گیا
ایوانِ علم و دانش و حکمت تیرے بغیر

انجم بجھے بجھے سے نظر آ رہے ہیں اب
اے اخترِ سپہرِ سعادت تیرے بغیر

قطعاتِ تاریخ بسلسلہ وفاتِ حسرتِ آیات
حضرت علامہ رضا حسین رشید ترابیؒ

از: مرزا محسن علی محسنؔ دکنی

بہ اعتبار سنہ عیسوی

در تعارف خطیبِ عالمِ اسلام شمسِ دکن
حضرت علامہ رشید ترابی تھے ضیا علم و سحابِ سخن
نظر آتے تھے بصورتِ خورشید ہر محفل میں وہ جلوہ فگن
پھیلا کر روشنیٔ علم کو دنیائے اسلام پر محسنؔ
کہنا جو ہو گئے وہ یوں معروف بہ خطیبِ عالمِ اسلام شمسِ دکن

۷۴+۴۰۰+۱۳۲+۱۴۱+۶۲۱+۷+۳۹۶+۶۶+۱۱+۴۰+۱۱+۹+۷۶

یا علیؑ سلام علیک

اس قسم کے سلام کے لیے حضرتِ علامہ مرحوم نے اپنی زندگی میں مجھ سے ایک موقع پر فرمایا تھا جبکہ میں حضرتِ علامہ مرحوم کی خدمت میں اپنی ایک کتاب کیفِ ولا کے لئے ان کی رائے حاصل کرنے گیا تھا۔ یہ تقریباً سترہ سال پیشتر کی بات ہے۔

۷؍ جمادی الثانی ۱۳۹۳ھ ایک خوش نصیب رات کو میں نے مولائے کائنات حضرتِ علی علیہ السلام کے آستانۂ اقدس پر بعالمِ خواب ایک ہجوم کو سلام کا نذرانہ پیش کرتے دیکھا لاکھوں نفوس کا ہجوم تھا میں بھی ایک ہمنوا کی حیثیت سے نذرانۂ سلام پیش کرنے کے لئے اس ہجوم میں شریک ہو گیا آخر میں مقطع میرے نام کا پڑھا گیا۔ میری آنکھ کھلی اور میں نے فوراً وضو کرکے ۲ رکعت نمازِ شکر ادا کی اور اس سلام کو بعینہٖ نقل کر لیا جو خواب کے عالم میں سنا تھا۔

سلام حاضر ہے۔ آپ حضرات میرے حق میں دعا فرمائیں کہ آستانۂ عالیہ پر ایک سلام کو بصورتِ ریکارڈ جلد از جلد پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں۔

خاکِ پائے اہلِ بیتِ اطہار علیہم السلام

آرزو اکبر آبادی (نغمہ نگار)

سلام

یا علیؑ سلام علیک   یا ولی سلام علیک
یا امام سلام علیک   رحمتِ داور علیک
یا علیؑ سلام علیک

آپ کعبے کے امیں ہو   قلبِ احمدؐ میں مکیں ہو
فاتحِ صفین و خندق   سرورِ دیں سے قریں ہو
یا علیؑ سلام علیک

آپ ہجرت کے ہیں شاہد   آپ خیبر کے مجاہد
جانشینِ شاہِ بطحا   آپ صوفی آپ زاہد
یا علیؑ سلام علیک

مایۂ فصلِ بہاراں   نازشِ قلبِ گلستاں
حاملِ آیاتِ قرآں   ہم غریبوں کے نگہباں
یا علیؑ سلام علیک

منبعِ مہر و محبت   مرکزِ حسنِ ولادت
حاملِ تاجِ امامت   دافعِ کفر و جہالت
یا علیؑ سلام علیک

اعتمادِ سرورِ دیں — تابشِ مہتاب و پروین
حریتِ انما کی تفسیر — قلبِ محمدؐ نورِ یٰسین

یا علیؑ سلام علیک

پرتوِ نورِ مجرّد — معنئ اسرارِ ابجد
مخزنِ الطافِ بےحد — لامکاں میں زیبِ مسند

یا علیؑ سلام علیک

باعثِ تسکینِ جاں ہو — بادشاہِ ہر زماں ہو ۔
داعئ پیغامِ برحق — آپ قرآں کی زباں ہو

یا علیؑ سلام علیک

ہر دکھے دل کے سہارے — جان کیا ایماں سے پیارے
وقتِ مشکل سے مدد ہو — آرزو کس کو پکارے

یا علیؑ سلام علیک

THE ARTIST OF THE SPOKEN WORD

SYED WALI AHMED BILGRAMI

حضرت علامہ رشید ترابی کے پران کے ایک عقیدت مند
سید ولی احمد بلگرامی کا انگریزی مضمون

With the dawn of modern times, the art of persuasion as represented by Oratory and Rhetorice had had to undergo a positive loss of value. Beyond the second quarter of the twentieth century, every grand, high-pitched monodrama, every thunderous staginess or full-lunged declamatory style appealing to the raw passions of the masses was being retired and declared out of commission.

For, by new radio broadcasting and television did beautifully and sympathetically take the wind out of the pipes of ageing and croaking men who were wallowing in grandiloquence. As the present decades rolled by, communication to the audience at large became highly intimate, chummy, pally, personal to the degree of a cousinly feeling and thus it turned into exquisite fireside dialogues gentle, low-toned and soft-spoken.

Our great academician of the spoken word,

Allama Rasheed Turabi was acutely conscious of this whole type of stream that coursed through the period-wise modern era. His was a know-how that was able to envisage not only the demands of here and now, but also the challenging timbre or the ringing distinctive quality of a voice that would hold in spell the rising generation of the unborn tomorrow.

To him, Demosthenes, Cicero, Abul Kalam Azad, Right Honourable Srinavas Shastri, Quaid-e-Azam Mohammed Ali Jinnah, Hadi Hasan, Bahadur Yar Jung, Churchill and a host of otherword spinners the world over were gainsayingly great, precious and venerated names. Yet there were high moments when Turabi's mind------whose holdings were extended beyond the reach of thought, out, out into the ken of metaphysics------would treat all these names, by and large, as mere dead yesterdays! Without any reflection on these grand names, he did justifiably hold that during the last quarter of a century none of these figures from the hierarchy of speech making was consigned by circumstances to combat so contemporaneously in the amphitheatre of elocution. How true, it was no other than Turabi to brave the scrutiny of diamond-eyed spectators in the arena from all around.

How did he electrify the dry intellectual atmosphere of yet another set of people who were guided by glamourless Faith, who did take a special delight in spurning materialism, and who did invariably traverse

in the "holy jungle of transcendental metaphysics"? How did he stir the sluggish minds of motley Moharrum crowd to wonder, enchantment and to spellbinding spiritualism?

During the ten days of Moharrum he was able to assume the whole life style of a dedicated mourner, joining the confraternity of those who had fallen on the plain of Kerbala. This could remind one of prophet Joseph who was lost to home, and over the separation of whom, his father prophet Jacob, as recorded by the Holy Quran, was so aggrieved that weeping and wailing to no end did ultimately turn him blind.

But there was a great majority in the audience of Rasheed Turabi, who in its own basic right, would not subscribe to the theme of tear-shedding and lamentation. Arrayed against this non-elegiac stance was the seminal idea of Aristotelian "Catharsis" or the purging of emotion which had been nurtured since more than fourteen hundred years, developing into a well-established doctrine of Aalay-Rasool. Confronted by this dilemma, Rasheed Turabi kept his head and for the greater good of the unity of the Muslim world he did bend all his energies, and this without working himself into an undue lather of self-righteousness.

Without the slightest fear of contradiction, he devoted himself to the uphill task of bringing closer the two great streams of consciousness; and Moharrum for him was an ideal period when the art of persuasion could

work miracles in terms of uniformity in diversity. Like a trial lawyer shouting at a witness, Turabi would then hold mirror to both the "fraternal" parties, and hammer them home the great hinge-point as represented by Prophet Mohammed (may peace be on his soul). In his endeavour to project the greatness of the Messenger of Allah who can still act as a cementing force, Rasheed Turabi did outperform and outclass many a learned figure of this sub-continent.

Yes, as an artist of the spoken word, he knew it for a fact that the ear is a gateway to the soul; and he equally realized that the ear of an angry young man can never be attuned to authoritative statements or to ex cathedra judgements, say, from the throne of a pope. This was the reason that his meaning-laden words never for a moment carried the meaningless or unwanted didactic strain. His sermons always accumulated [illegible] pyramids of facts; and such was his hatred of overbearing [illegible] from the pulpit and such was his natural love for [illegible] and for happy reason that he did prefer [illegible] scores of facts would fall into line to [illegible]

Like a bee winging its way [illegible] to flower, Rasheed Turabi in a lifelong [illegible] pursuing diverse disciplines of knowledge with [illegible] aim to coordinate them conducively. From Categorical Imperative to Logical Positivism in Ethics, from Cosmogony to Phenomenology; from Psychology of Religion to

General Semantics, all were ranges that he would scan with an effortless superiority and yet his eyes were all the more glued on Ontology, i.e., on the science that treats of the principles of pure being. And when he would talk of the Here-after with might and main, he would easily send a tingle dowmmany a spine; or again when he would touch the chord of piety as enunciated by Huqooq-ul-Ebaad, it was as if the listener had by mistake tampered with a faulty light switch and did get in the bargain a sudden jolt up his arm!

قطعۂ تاریخ

علامہ رشید ترابی

حضرت رئیس امروہوی

ارشاد کا سرمایہ وہ مردِ رشید ایسا
وہ جس کی خطابت تھی پیرایۂ صد حجت

جب زینتِ منبر ہی مجلس میں نہیں باقی
منبر پہ پڑھا جائے اب "مرثیۂ رحلت"

نفس نفس میں حوصلے قدم قدم پہ برتری
ورق ورق میں علمِ حق، طبق طبق میں آگہی

تبرکات

علامہ مرحوم کی منتخب تحریریں، تقریریں، کلام، ڈائری کے اوراق، بہادر یار جنگ، قمر جلالوی، معالج خصوصی اور بانی پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح کے خصوصی خطوط ـــــ اور مولا علیؑ کے معرکۃ الآرا خط کا انگریزی ترجمہ

علّامہ رشید ترابی کی یادگار تحریریں

ذکرِ حسینؑ کیوں؟

علامہ رشید ترابی

سال ۱۳۷۱ھ کا آغاز ہمارے قمری سال کی ابتدا، بہار و خزاں کی پابند نہیں یعنی توحید کے پرستار موسم پرست نہیں کہ ان کی عید صرف بہار میں آئے تاکہ ہر عید میں سامان بہار مہیا ہے۔ ہمارے لئے کبھی چلچلاتی دھوپ کے روزے ہیں تو کبھی کڑکڑاتے جاڑے کی سحر۔ تپتے ریگستان کی قیامت خیز لو کبھی حاجیوں کا استقبال کرتی ہے تو کبھی باد شمال کے کلیجہ ہلا دینے والے سرد جھونکے صفا و مروا کے درمیان سعی کی لذت کو دوبالا کر دیتے ہیں۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہجری سال کا آغاز محرم سے ہوتا ہے کہ نئے سال کو رسم و اعیاد کے بے معنی اور فانی لذتوں سے ہٹا کر تجدید عہد وفا اور جذبات مودت و ایثار سے شروع کیا جائے۔ یہی عہد کہ اعلائے کلمۂ حق کے لئے پیغمبر آخر الزماں کی امت کسی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا اور یہی جذبہ ایثار کہ حفاظت اصول اسلام کے لئے اگر ترک وطن لازمی ہو تو منظور۔ اسے پناہ گاہ سے ہٹنا پڑے تو قبول ہو اگر منظم طاقتوں کی اکثریت سے اپنی اقلیت کے باوجود ٹکرانا پڑے تو ماسوا اللہ کے لئے بے خوف ہو کر انسان ٹکرا جائے۔

غرض ہر مسلمان اپنے غیر ارادی عالم میں بھی ختمی مرتبت کے چھوٹے نواسے کے تذکرہ کو سن کر شعار عزا کو دیکھ کر غم و حزن کی ایک لہر کو محسوس کر کے یہ عزم مصمم کرتا ہے کہ اگر خالق روح و جسد کو یہ پسند ہو کہ امر حق میں روح و جسد کا ہر تعلق منقطع ہو

جائے تو ہم اس کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔

مشیت الٰہی یہ ہے کہ راہِ محبت کا ہر مسافر بغیر امتحان کے نہ رہے۔ حسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لا یفتنون۔ کیا انسان یہ گمان کرتے ہیں کہ ان کو صرف اس لئے بغیر امتحان چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنے آپ کو ایماندار کہتے ہیں۔ نہیں لقد فتنا الذین من قبلھم۔ ہم نے ان سے پہلوں کو بھی آزمائش میں مبتلا کیا تھا اور ظاہر ہے کہ۔

ہر کہ دریں بزم مقرب تر است
جام بلا بیشترش می دہند

منازلِ ثلاثہ کی حد آخر پر انسان کھڑا ہے۔ صاحب عقل و شعور ہے۔ حامل ہوش و حواس ہے اور اظہار انا پر مجبور۔ اگر اس انا کی نمائش میں صرف لذات دنیا کی ہوس اور غیر حق کی پرستاری مضمر ہے تو یہ انا ترقی سے محروم اور جامد ہے۔ اور قانون الٰہی بھی اس کو ایک طویل مہلت دینے کے لئے تیار ہے اور مقصد خلقت کو پہنچانے اور انسان کو مسلسل ترقی سے آشنا کرتے ہوئے ملکوتی حدود تک پہنچانے کی کوشش میں اگر کوئی اپنے انا کو رہبری کے لئے پیش کرے تو مشیت الٰہی ہر گام پر ایک نیا امتحان لیتی ہے اور ہر نفس پر اس کو ایک نئی آزمائش میں مبتلا کیا جاتا ہے۔

تا علاج خستگی آسائش دیگر دہد
خار ہا در رہگذر مہمان انداختہ

یہی وہ منزل ابتلاء ہے جہاں ابوالبشر ثابت قدم رکھنے کی دعائیں مانگتے ہیں اور جہاں نوح جیسا نبی اولوالعزم اپنی قوم کے ہاتھوں حیران و پریشان نظر آتے ہیں اور ہاں یہی وہ مقام آزمائش ہے جہاں باپ بیٹے کو تہہ تیغ رکھتا ہے، اور

لَقَد صَدَّقتَ الرُّؤیَا ، اَنَا کَذٰلِکَ نَجزِی المُحسِنِینَ کے خطاب سے
سرفراز کیا جاتا ہے لیکن امتحان کے مراتب میں سے

طفیان ناز بین کہ جگر گوشۂ خلیل
آمد بزیر تیغ و شہید کس نمی کنند

اسی راہ میں یعقوبؑ کو یوسفؑ کے فراق میں مبتلا کیا جاتا ہے اور وَابیَضَّت عَینَاہُ مِنَ الحُزنِ کے عنوان سے تاریخ محبت لکھی جاتی ہے یہی وہ موقف امتحان ہے جہاں پیغمبری عطا کے بندگی کی آزمائش مطلوب ہے۔

عشق یوسف را دریں سودا بہ دنیا اے فروخت
بندگی خواہد پیمبر زادگی منظور نیست ،

اللہ اللہ یہ انہی بندوں کی آزمائش ہے جن کو قدرت نے منتخب کیا ہے اس دربار محبت میں ذکریاؑ پکار رہے ہیں۔ رَبِّ لَا تَذَرنِی فَردًا وَّ اَنتَ خَیرُ الوَارِثِینَ اور ذوالنون چیخ رہے ہیں لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنتَ سُبحَانَکَ اِنِّی کُنتُ مِنَ الظّٰلِمِینَ۔

بندگی کی قدروں کو جب تولا جاتا ہے تو طاغوتی دربار میں یحییٰ کا سر پیش کیا جاتا ہے اور عیسیٰ دنیا کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے صلیب تک پہنچ جاتے ہیں۔ جو ہر فرد انسانیت مقصد لولاک مطلوب الٰہی ختمی مرتبتؐ کے لئے ابتلا و آزمائش کے مراحل تھے لیکن سب سے کہیں زیادہ یہاں تک کہ ما اوذی نبیا کما اوذیت کی حقیقت نمایاں ہو گئی۔

کہ منزل تسلیم و رضا مشکل ہے
جن سے رہتے ہیں ان کی سوا مشکل ہے

سُنّتِ الٰہی اسی طرح سے جاری و ساری رہی ، انبیاء و اولیاء کا امتحان لیا جاتا

رہا اور راہ حق سے انحراف اور احکام انبیاء سے عدول کرنے والی قومیں قانونِ نزولِ عذاب الٰہی کی زد میں آئیں اور تباہ ہو کر رہ گئیں ۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اعلائے کلمۂ حق کے لئے جن نفوسِ قدسیہ نے اپنے آپ کو پیش کیا تھا۔ ان کی دولت و ثروت نے نہیں ان کی حکومت و سلطنت نے نہیں بلکہ ان کے فقر و صبر و اقامت علی الحق نے ان کو ہمارے لئے قابلِ تقلید بنا دیا ۔ نیک و بد، کذب و صدق خلوص و ریا، حق و باطل کی پیکار میں جب کبھی بے دریغ قربانی کا وقت آیا ہے تو وہی زندگیاں ہمارے لئے نمونہ قرار پائیں ۔ مقصد معین تھا لیکن اشخاص نے رہنمائی کی چونکہ مقصد خود اپنے آپ کو بدون شخص متعارف نہیں کر سکتا اس لئے محیط وحی نے ثقلین کو انسانی ترقی کے لئے لازمی قرار دیا ہے ۔ فطرت انسانی کے غلط پہلو ہوس زدہ انسانوں کو جہلت اکتساب کے غلط راستوں پر ڈال دیتے ہیں ۔ وہ ہر قیمت پر انسان سے انسان کی بزرگی چھین لینا چاہتے ہیں ۔ یہاں تک کہ اگر یہ ظاہر ہو کہ کسی کا جذبۂ روحانیت اہلِ عالم کے لئے جاذب قلب و نظر بن رہا ہے تو وہ اس کو بھی برداشت نہیں کر سکتے اور ان کی ہوسناکیوں کی قربان گاہ ایسے انسانوں کی بھی بھینٹ مانگتی ہے جو دنیا کے طالب نہیں جن کو حکومت و سلطنت سے رابطہ نہیں، لیکن جن کی اقامت علی الحق عام انسانوں کی نگاہ میں ان کو ایک بلند ترین منزل عطا کرتی ہے یہی وہ میدان کارزار ہے جہاں حکومت و سلطنت دوستان خدا سے ٹکراتی ہے اور ان سے مبارزت طلب ہوتی ہے اور جب علمبرداران حق اس کے جواب کے لئے مقابل میں آجاتے ہیں تو پھر حق و باطل کا معرکہ کہیں تازہ ہو جاتا ہے ازل سے یہی ہوتا رہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا ۔

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسد اللہی وہی مرحبی وہی عنتری

انسانی فطرت کی پیچیدگیاں ہر دور میں تاریخ کے صفحات پر ابھر آتی ہیں اور خصوصاً جب جبلت اکتساب ظلم پر اتر آتی ہے تو پھر انسان سفک دماء اور فساد فی الارض کا عادی ہو جاتا ہے انسانیت کی اصلاح جن بندوں کے ذمہ ہے وہ سنت الٰہی کی پیروی کرتے ہوئے کبھی فتنہ و پیکار کو اپنی مداہنت و مصالحت سے روکتے ہیں اور کبھی خنجر بدست اور سر بکف ہو کر اجتماعی زندگی میں اصلاح کی یہی دو صورتیں ہیں اور بنتِ رسولؐ فاطمہ زہراؑ کے دونوں بچوں نے اسی نشان سے اپنے فرض اصلاح کو ادا کیا۔ حکیم مشرق نے اس مسئلہ کو یوں نظم فرمایا ہے۔

آں یکے شمعِ شبستانِ حرم
حافظِ جمعیت خیر الامم
تا نشیند آتشِ پیکار و کیں
پشت پا زد بر سرِ تاج و نگیں
واں دگر مولائے ابرارِ جہاں
قوت بازوئے احرارِ جہاں
در نوائے زندگی سوز از حسین
اہلِ حق حریت آموز از حسین

دونوں بھائیوں کے پیش نظر ایک ہی مقصد تھا اور اسی مقصد کی تکمیل کے لئے کسی نے جام زہر نوش فرمایا اور کسی نے زیر خنجر سجدۂ معبود ادا کیا۔

سنہ ۶۰ھ رجب کا مہینہ تھا کہ فرزند رسول الثقلین نے اپنے مقصد کا اعلان فرمایا اور قبر رسالت پناہ کو تھام کر اپنے معبود کو یوں مخاطب کرنے کی عزت حاصل کی۔

خداوندا یہ تیرے نبی محمدؐ کی قبر ہے اور میں تیرے نبیؐ کی بیٹی کا بیٹا ہوں۔
خداوندا وہ وقت قریب آگیا جس کا تجھے علم ہے میرے پروردگار مجھے جینے اسی مقصد کے لیے جس میں کہ تیری اور تیرے رسولؐ کی خوشنودی ہو۔

رضائے حق کے جویا نے مدینہ سے نکلتے ہوئے اپنا وصیت نامہ تحریر فرمایا آغاز وصیت میں خدائے قدوس کے ایک ہونے اور اپنے نانا کے رسول برحق ہونے کی گواہی دی اور جنت و نار حشر و نشر کی شہادت دی اور پھر یہ اعلان فرمایا۔

"(ترجمہ) میں فتنہ و فساد کے لیے گھر نہیں چھوڑ رہا ہوں۔ میں مدینہ سے جا رہا ہوں فقط اس لیے کہ امتِ جد کی اصلاح کروں۔"

مدینہ سے نکلتے ہوئے شاہ حجاز مدینہ کے ہر انسان کو اپنے ساتھ لے کر نکل سکتے اگر ملک گیری کا خیال دامن گیر ہوتا۔

مدعائش سلطنت بودے اگر
خود نہ کردے باچنیں ساماں سفر

اپنے گھر والوں کو لے کر نکلے۔ چند کمسن بچے چند بیبیاں چند نوجوان، پھر وہ قافلہ جو جہاد حقیقی کے لیے نکلا رات کی تاریکی میں نہیں۔ دن کے اجالے میں نکلے۔ اعلان کر کے چلے۔ کفر کی دنیا کہتی رہ گئی کہ اگر حسینؑ اب چلے تو ان کی گردن سے مطالبۂ بیعت ناممکن ہو جائے گا۔

ادھر سید الشہداء نے بھی طے فرما لیا تھا کہ کسی صورت مدینہ چھوڑ دیا جائے تاکہ سوال بیعت پر اگر لڑائی چھڑ جائے تو آنے والا مورخ کہیں یہ نہ لکھے کہ فرزند رسولؐ نے روضۂ رسولؐ کی حرمت کا بھی خیال نہ کیا۔ لاکھوں مسلمان یہ سمجھتے ہے کہ مدینہ سے فرزند رسولؐ نکلے ہیں شاید کہ مکہ میں قیام ہو۔ حج کے فرائض امام کے ساتھ ادا ہوں گے لیکن پاس حرمت کعبہ نے اس پناہ گاہ کو بھی چھوڑنے پر مجبور کیا۔ ذی الحجہ

کی ۹ تاریخ کو آخری خطبہ ارشاد فرمایا۔" الٰہی قوتوں اور طاقتوں پر گفتگو فرماتے ہوئے موت کے یقینی ہونے کا ذکر کیا پھر صاف طور پر اعلان فرمایا کہ صحرا کے درندے عراق کی سرزمین پر میرے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں لیکن اس سے مفر نہیں کوئی اور راہ گریز نہیں ہے بس یہ فیصلہ ہے کہ رضائے اللہ رضائے اہلبیت ہم اہلبیت کی وہی مرضی ہے جو خدا کی مرضی ہے۔"

یہ ہیں وہ ناموس کعبہ جنہوں نے کعبہ کا اس قدر خیال کیا۔ لیکن کیا دنیا نے نہیں دیکھ لیا کہ ۶۳ھ کے آخر تک طاغوتی طاقتوں اور یزیدی لشکروں نے فرزند رسولؐ کا خون بہا کر اتنی جرأت وجسارت پیدا کرلی تھی کہ ان کے آگے نہ خوابگاہ رسالت کی کوئی قدر تھی اور نہ حریم کعبہ کی دونوں مقامات کو روند ڈالا گیا۔ مسجد رسولؐ کی بے حرمتی کی گئی اور خانہ کعبہ کے پردہ میں آگ لگادی گئی۔ فرزند رسولؐ نے یہی پیشین گوئی فرمائی تھی کہ میرا لہو بہا کر تم جری ہوجاؤ گے تم کسی کی حرمت کا خیال نہ کروگے اور بالآخر حرف بہ حرف وہی ہوا جو فرزند رسولؐ نے کہہ دیا تھا۔ ۸ ذی الحجہ کو مکہ سے یہ قافلہ چلا۔ ۹ ذی الحجہ کو آلِ محمدؐ کی طرف سے پہلی قربانی کوفہ کے دارالامارہ میں دی گئی۔ اور ابن زیاد نے حضرت مسلم بن عقیل کو عید کے دن قتل کردیا۔ وہ مسلم جو اگر کوفہ نہ بھیجے جاتے تو شاید کربلا کی جنگ کا کچھ اور نقشہ ہوتا لیکن مرضی معبود یہی تھی۔ غرض کوفہ کی طرف اس قافلہ کا رخ تھا کہ حکومت کی فوجوں نے راستے بند کردیئے اور دشت نینوا میں فرات کے کنارے غاضریہ سے متصل کربلا کی زمین پر یہ قافلہ اترا۔ کاروانِ سالار نے زمین پسند کی بچپن کا وعدہ یاد آیا اور ساتھ نانا بھی یاد آگئے۔ دوسری محرم تھی کہ لشکر جمع ہونے لگے اور ہر بار یہی مطالبہ کہ حسینؑ بیعت کرلیں۔ لیکن جھگڑا تو اسی بیعت پر تھا۔ مدینہ کا ملک یا شام کی زرخیز زمینیں مابہ النزاع نہیں تھیں۔ فرزند رسولؐ نے سنت الٰہی پر عمل کرتے ہوئے اعلان کردیا کہ سر دینے آئے ہیں۔ بیعت کرنے کے لئے نہیں۔ فرات

سے خیمے جبراً ہٹا دیئے گئے۔ ساتویں سے پانی بند ہوگیا۔ گرمی کا مہینہ بچوں کی پیاس اعدا کی کثرت، عزیزوں کی قلت، شہادت کا یقین۔ غرض کوئی امر ایسا نہ تھا جو اس پائے ثبات کو متزلزل کر دیتا۔

وہ العطش کی صداؤں میں مل رہا تھا سکوں۔

وہ ارجعی کی نداؤں میں اٹھ رہے تھے قدم۔

محرم کی ۹ تاریخ کو فرزند رسولؐ بالکل گھر گئے تھے۔ ۹ کی شام آئی۔ ایک رات کی مہلت عبادت الٰہی کے لئے مانگی یعنی لشکر مخالف کو ایک رات کی اور مہلت دی کہ وہ سوچے کہ کس کے مقابل میں یہ لشکر آرائی ہو رہی ہے اسی طرح شاید کوئی حُر نکل آئے۔ دس کی صبح کو معرکہ کارزار گرم ہوا۔

اس معرکہ کے لئے فرزند رسولؐ نے یہ مناسب سمجھا کہ مدینہ میں جنگ نہ ہو، تاکہ کھلے میدان میں حق و باطل کا مقابلہ ہو جائے۔ خانہ کعبہ میں حج کے موقع پر کوئی لڑائی چھڑتی تو سازش کا پتہ نہ چلتا اور یہی سمجھا جاتا کہ کسی حاجی نے قتل کر دیا۔ فرزند رسولؐ یہ چاہتے تھے کہ ایک ایسے مقام پر یہ لڑائی ہو کہ کسی کو پھر شبہ باقی نہ رہے کہ کون کس طرف سے لڑ رہا ہے اور کھل جائے کہ حسینؑ ابن علیؑ کے ساتھ کون ہیں اور لشکر مخالف میں کون ہیں اور ان کے معاون کون؟

تاریخ ایسی جنگ کو پھر نہ دہرا سکی۔ لشکر مخالف سے عمر سعد نے پہلا تیر چلایا۔ ہزاروں تیر ساتھ چھوٹے ۳۲ ساتھی اسی وقت جاں بلب ہو گئے پھر رفیقوں کی باری آئی۔ ایک ایک نے دادِ رفاقت دی۔ ضعیفوں نے شبابِ ایمان کی بہاریں دکھلائیں جوانوں نے شجاعت کے رنگ دکھلائے۔ بچوں نے مسکرا کر جانیں دیں ۱۸ بنی ہاشم سامنے تڑپ کر مر گئے۔ جعفر طیار کے پوتے حیدر کرارؑ کے نواسے عون و محمد شہید ہو گئے۔ حیدر صفدر کے نورِ نظر مارے گئے۔ عباس ترائی سے پھر نہ اٹھے۔ علی اکبر نے داغ

مفارقت دیا۔ پنجتن پاکؑ کی پوری پوری نمائندگی ہی آخر میں سردارِ سردار بیکس قافلہ سالار نائب احمد مرسلؐ میدان میں تشریف فرما ہوئے آخری جنگ کی اور بار بار فرماتے تھے۔ محمدؐ کا نواسا ہوں فاطمہؑ کا بیٹا ہوں علیؑ کا نورِ نظر ہوں۔ مجھے نہ مارو۔ تم کو چین نہ ملے گا۔ میری رگوں میں فاطمہؑ کا دودھ ہے۔ محمدؐ کا لہو ہے۔ بیعت مجھ سے ناممکن ہے۔ میرا بیعت کرنا یزید فاسق کے ہر امر کو تسلیم کرنا ہے۔ مجھے اسلام کو بچانا ہے لو یہ میرا سر حاضر ہے۔

محرم کی دسویں۔ عصر کا وقت تھا کہ سر تا بہ قدم زخمی ہو کر گھوڑے سے زمین پر تشریف فرما ہوئے عصر کی نماز ادا کی۔ بیعت کے لئے ہاتھ نہ اٹھے۔ سجدہ معبود میں سر کاٹ کر زمیں سے اٹھا لیا گیا۔

بنگر نیاز عشق کہ دلبند بوتراب

بر خاک سجدہ ریز و شہیدش ہمی کنند

یہ ہے وہ عظیم المرتبت قربانی جس کا ذکر ہر سال دہرایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ دنیا یزیدیت سے نہ گھبرائے۔ اس لئے اقلیت اکثریت سے نہ پریشان ہو کیونکہ زحمتوں اور مصیبتوں پر صبر و شکر سے قابو پا لیا جائے اس یاد کو تازہ کیا جاتا ہے کہ اب بھی یزیدی طاقتیں موجود ہیں۔

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید

این دو قوت از حیات آید پدید

ذکر حسینؑ کو باقی رکھ کر ہم کو باطل کی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ مقصد یہی ہے کہ ہم بہر صورت فکر صحیح کی اشاعت کریں۔ اتحاد ملت کے لئے کوشاں ہوں اور ہر آن استحکام مملکت کے لئے ساعی رہیں۔

اسلام میں اجتہاد

حضرت علامہ رشید ترابیؒ

> ۱۹۵۶ء میں ایک اسلامی مذاکرہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں منعقد ہوا تھا اس مذاکرے میں حضرت علامہ رشید ترابیؒ نے درج ذیل مقالہ پڑھا تھا۔

اسلام رب العالمین کی مشیّت کو تسلیم کرتا ہے۔ اور اس رب العالمین کی ہمہ گیر عالمی مشیت ہر گوشۂ حیات پر محیط ہے۔ خواہ وہ جسمی ہو کہ روحی اور جس کا مقصود مفادِ کل ہے

من نہ کردم خلق تا سودی کنم — بلکہ تا بر بندگاں جودی کنم

مفاد محدود اور مصالح زمانی و مکانی سے یہ مقصود بلند ہے۔

اور اس عالمینی ہمہ گیر مشیت کی نمائندگی وہی انسان کر سکتا ہے جو محدود مفادات اور ذاتی رجحانات سے پاک ہو حَنِیفاً مُّسلِماً اور نمائندہ مشیّت الٰہی کا ہر خطا سے دور ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ خطا رجحاناتِ محدودہ کا نتیجہ ہے۔ اور رجحان محدود منافی نمائندگی مشیّت الٰہی ہے، یہیں سے سلسلۂ انبیاء شروع ہوتا ہے جس کے خاتم محمدؐ ابن عبداللہ ہیں اور جن کا پیغام تمام انبیاء کی مساعی کا خلاصہ ہے ان کا ارشاد قرآن ہو کہ حدیث ان کا عمل اور سکوت دائمی حجت ہے اور یہی نص ہے مسلم کے لئے اپنی فکرِ حیات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ نص کو ڈھونڈے نص کو سمجھے اور مدالیل مطابقی و تضمینی و التزامی کو سمجھ کر نمو پذیر حیات کے لئے احکام کا استنباط کرے، یہی اجتہاد ہے جس پر تمام مکاتبِ فقہ اسلامی متفق ہیں۔

دستورِ اسلام میں ۲۳ سال کے دورِ تنزیل و تشریع کے بعد تقریباً ۲۵۰ برس کے دورِ تدوین میں مکاتیب فقہی کا نشو و نما ہوا۔ دورِ تشریع میں جس طرح نمائندۂ مشیت الٰہی کا ہوا و ہوس سے خالی ہونا ضروری ہے، دورِ تدوین میں بھی اس طہارتِ فکر و عمل کی اہمیت کچھ کم نہیں۔

دورِ تشریع و تدوین کے بعد دورِ اجتہاد کو بھی فضائل علمی سے آراستہ اور تمایلاتِ نفسی سے دور رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ ضروری علوم میں مہارت اور احکامِ شریعت کی پابندی کے ساتھ صاحبِ اجتہاد رجحاناتِ ذاتی سے دور رہے۔

اس دورِ اجتہاد میں اگر اختلاف پائے جاتے ہیں تو صرف اس لئے کہ نص کو ڈھونڈنے اور نص کو سمجھنے میں اختلاف ہے اور یہ اختلافات ایسے نہیں ہیں جو علماء کے حلقے میں قابلِ رفع نہ ہوں۔ تلاشِ نص میں دو چیزیں مسلم ہیں قرآن اور حکم رسولؐ۔ فقہائے اسلام نے اجماع کے متعلق یہ اختلاف کیا ہے کہ اس سے استرضائے معصوم ممکن ہے؟ کہ نہیں؟ اور اجماع سے ہم نص رسولؐ معلوم کر سکتے ہیں۔ یا نہیں۔؟ اس میں شک نہیں کہ اگر اجماعِ امتِ محمدیؐ ابتداء سے آج تک بلا اختلافِ فرد و جماعت کسی امر پر منعقد ہو تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اس میں رضایتِ رسولؐ موجود ہے، لیکن یہ ایک صرف مفروضہ ہے جس کے لئے کوئی مثال نہیں، باقی اقسامِ اجماع فقہا نے آج کا تذکرہ کیا ہے اور انکا حکم یہی جاری ہے کہ کوئی طریقِ تلاشِ نص اس طرح حاصل ہو۔

قیاس استحسان اور مصالح مرسلہ کو بعض مکاتیبِ فقہی نے ذریعہ استنباط قرار دینے کے لئے چند نصوص کو تلاش کیا ہے۔ جنہوں نے ان ذرائع کو معتبر نہیں جانا، ان کی نگاہ میں ہمارے معتبر نہیں اور جن کی نظر میں معتبر ہیں وہ کسی نص پر بنیاد رکھتے ہیں اس لئے معتبر ہیں۔

البتہ عقل کے عمل کی حد تک جو اصول و قواعد اخلاقی و اجتماعی و مدنی جن پر سارے عقلاً متفق ہوں۔ ان کو مدرک [illegible] اطہ قرار دیا گیا ہے اور اسی بنا پر یہ مسلمہ قاعدہ استنباط

میں ذکر کیا جاتا ہے۔

کلما حکم بہ العقل حکم بہ الشرع

وکلما حکم بہ الشرع حکم بہ العقل

مگر یہ بھی واضح رہے کہ حکمِ عقل بھی مفروضۂ اجماع کی طرح ہے۔ اس لئے کہ کوئی ایسا حکمِ عقلی جس پر اجماعِ عقلا ہو اور شریعت اس پر خاموش ہو پایا نہیں جاتا۔ مقصود یہی ہے کہ عقل و شرع ایک دوسرے سے منفک نہیں۔ احکامِ شرع جس قدر ہیں، احکامِ عقلی اور مفادِ خلائق پر مبنی ہیں۔ اگرچہ عقلِ بشر کی اس حقیقت تک رسائی نہ ہو اور کلما حکم بہ العقل حکم بہ الشرع کا مقصد یہی ہے۔ اگر سارے عقلا کا اتفاق ہو تو شانِ ربوبیت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس پر اجرائے حکم کرے۔

اَلواجبات الشرعیہ الطاف فی الواجبات العقلیہ

عالمِ اسلام میں سب مکاتیبِ فقہی اس کے مدعی ہیں کہ اجتہاد مبنی بر نص ہے۔ یعنی نص اس زمانے میں بھی ضروریاتِ بشر کی کفیل تھی اور آج بھی ہے۔ بشرطیکہ اس کو ڈھونڈیں۔ اور سمجھیں۔ اس کا ڈھونڈنا منحصر ہے۔ اس علم کے قواعد پر علوم لغوی جیسے تفسیر، رجال، حدیث وغیرہ۔ اجتہاد کی یہ تعریف نئی نہیں کہ ادلہ تفصیلیہ استنباط احکام ہو۔ بذل الوسع فی استنباط الاحکام عن ادلۃ التفصیلیہ۔ اور اجتہاد کی یہی اصل ثابت مذہب کو زندہ اور باقی رکھے گی۔

(۱) اصلھا ثابت وفرعھا فی السما توتی اکلھا کل حین باذن ربھا۔

(ابراہیم۔ ۲۴)

جہاں جہاں افکارِ اسلامی میں خامی پائی جاتی ہے۔ اس کا باعث تین امور ہیں۔

(۱)۔ قواعد وضوابط استنباط سے عدم واقفیت کے باوجود اجتہاد

(۲)۔ اجتہاد مقابلِ نص۔

(۳)۔ جمود علی النص ۔

ان تینوں خطرات سے متقدمین نے آگاہ کر دیا تھا۔ چنانچہ عبدالکریم شہرستانی الملل والنحل میں اجتہاد مقابلِ نص کو اسلام میں اختلافات کی بناء قرار دیا ہے اور قرآن واضح کرتا ہے ۔ (۲) ان الدین عند اللہ الاسلام وما اختلف الذین اوتوا الکتاب الا من بعد ما جاءھم العلم بغیاً بینھم (آل عمران ۔ ۱۹) ۔ بغیاً بینھم کی وسعتوں میں تاریخ اختلافِ مذاہب پنہاں ہے۔

جمود علی النص اجتہاد مقابلِ نص سے زیادہ خطرناک نہیں تو اس سے بھی کچھ کم نہیں۔ اور قواعدِ ضوابطِ استنباط سے عدم واقفیت وہ معصیت ہے جس کی وجہ سے عالمِ اسلام ابتلاء میں ہے۔ اسلام دینِ اجتہاد ہے اور اس معنیٰ میں کہ اجتہاد مبنی علی النص بشرطِ تقویٰ ہو، نہ اجتہاد مقابل نص نہ جمود علی النص۔ مصالح ذاتی و وقتی کی بناء پر احکام کو بدلنا اجتہاد اسلامی نہیں ہے۔ اسلام میں اجتہاد عقلِ منضبط اور مسلّح کے ذریعہ نصوص کو ڈھونڈتا اور سمجھتا ہے۔ اور یہ حق کسی فرقہ یا جماعت کا نہیں ہے جس میں یہ صلاحیتیں پیدا ہو جائیں وہ آگے اور غیر مجتہد پر فرض ہے کہ وہ اپنے مجتہد کے فتاویٰ پر عمل کرے اور اپنی حیات سیاسی و اجتماعی و اقتصادی و روحی کو ان ہی فتاویٰ کی روشنی میں بہتر سے بہتر بنائے۔

بعدِ نصِ معصوم دروازۂ اجتہاد باشرائط استنباط سب کے لئے کھلا ہوا ہے۔ مجتہد کا قول دوسرے زمانے میں مقلدین کے لئے حجت نہیں۔ اور نہ مردہ مجتہدین کی تقلید کی ضرورت ہے۔ اسی ایک اصلِ اجتہاد سے تسلسل و ارتقاء و ارتباطِ فکر وابستہ ہے۔ آج کے مجتہدین جو واجدِ شرائطِ اجتہاد ہیں۔ متقدمین سے کچھ کم نہیں۔ لیکن مجتہد کا قول جزوِ دین نہیں ہے نص جزوِ دین ہے۔ اس لئے کہ ہر مجتہد کا استنباط جدا ہے۔ اگر ہر ایسے اجتہاد کو عینِ دین سمجھا جائے تو حیرانی ظاہر ہے آج جب کہ جمود و خمود لاقیدی و پستی

کے اسباب پر غور و فکر کے لئے دانشمندانِ اسلام و مفکرین عالم جمع ہیں۔ میں واضح کردینا چاہتا ہوں کہ اسلام دین عدل و انصاف ہے جہاں قرآن و حدیث کی موجودگی میں نشو و نمائے حیات سیاسی و اجتماعی، فردی و روحی کے لئے نصوص کی کمی نہیں۔ صرف یہ ہے کہ جمود علی النص نہ ہو، ہماری داخلی و خارجی زندگی۔ ہماری قومی اور بین الاقوامی زندگی، بحیثیت مسلمان کے دو تقاضے کرتی ہے۔ اور یہ دو نصِ قطعی آپ کے پاس موجود ہیں

یا ایها الذین امنو کونو قوامین لله شهدا بالقسط ولا یجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا اعدلو هو اقرب للتقوی واتقوا الله ان الله خبیر بما تعملون (مائدہ-۸)

صاحبان ایمان اللہ کے لئے قائم رہو۔ عدل پر شہید بنو اور کسی قوم کی دشمنی کہیں تم کو عدل سے نہ ہٹائے۔ عدل کرو یہی تقویٰ ہے۔

کیا اس نصِ قطعی میں اقلیتوں سے عدل کرنے کا حکم نہیں۔ اگر ہے تو مقدمہ واجب جان کر وہ اصول و قواعد کیوں نہ منضبط کئے جائیں جس پر مسلمان کاربند ہوں۔ یہ ہے ہماری داخلی زندگی کا ایک گوشہ۔

اور خارجی زندگی کے لئے۔ سورۂ انفال کی یہ آیت۔

(۲) واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم وآخرين من دونهم لا تعلمونهم (انفال ۶۰)

اور جس قدر تم کر سکتے ہو۔ اس تیاری کے ساتھ رہو تاکہ اللہ کے اور تمہارے دشمن خوف زدہ رہیں۔ اگر ما استطعتم من قوة کا یہ حکم واجب ہے تو پھر مقدمۂ واجب کہاں ہے؟ جمود علی النص کیوں ہے؟۔

عالم اسلام کی داخلی اور خارجی زندگی کے لئے مثالاً یہ دو نصوص قطعی پیش کئے گئے ہماری ترقی دکھانے کے لئے صرف نصوص کو ڈھونڈنے اور سمجھ کر عمل کرنے کی ضرورت ہے

ہمارا دین مکمل ہے اور ہمیں گداگری کی ضرورت نہیں ہے۔

چیتے کا جگر چاہیئے شاہین کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانش افرنگ
کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

(اقبال)

سکوت و صدا

علامہ رشید ترابی

سنہ ۱۴۱۳ھ کا آغاز ہر سال کی طرح غم والم سے ہو رہا ہے اور غم کی باتیں نسبتاً خوشی کے لمحات سے زیادہ دیرپا ہوتی ہیں۔ اگر کوئی بات جذبات محبت و احترام سے لبریز ہو اور آیۂ مودت نے اگر اس محبت کو واجب قرار دیا ہو تو پھر غم والم کے تذکرے زمانہ کے لا متناہی سلسلے کے ساتھ تازہ رہتے ہیں۔

نوع انسانی پر محمد ابن عبداللہ کا جو احسان ہے اس کو کون بھلا سکتا ہے اور پھر مسلمان جو یہ جانتا ہے کہ ختمی مرتبت حد کمال انسانیت ہے کسی ساعت اور کسی آن یاد و ذکر محمد سے غافل نہیں ہو سکتا۔ چونکہ اس ذات رحمت کو بھلانا آخری درجہ کی احسان فراموشی ہے اس لئے ہر مسلمان کے قلب میں اس رحمت الٰہی کی محبت بیش و کم موجود ہے۔ اسی محبت کے پیمانہ میں غم و مسرت کو بھی تولا جاتا ہے۔ یعنی جتنی محبت اتنا ہی غم۔ اور اگر محبوب کی زندگی میں مسرت و انبساط کی بھی گھڑیاں ہیں تو پھر اسی تعلق خاطر سے مسرت و انبساط بھی لازم اور اسی طرح اگر کسی کی محبت آنی و فانی نہیں بلکہ جاودانی ہے تو پھر اس کی خوشی بھی غیر فانی اور اس کا غم بھی غیر فانی ہو جاتا۔

حضرت ختمی مرتبت کے نواسے نے ملت مسلمہ پر جو احسان کیا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں۔ یہی دائمی احسان ایک غیر فانی محبت کا باعث ہے اور جب تک یہ محبت باقی ہے فرزند رسول کا غم باقی رہے گا۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اسی درد والم سے وابستہ ہے اور غم حسین کا امتیاز رہا ہے اسی طوفان غم اور شور ماتم کو تبیین

سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

شیعوں پر مظالم:۔ اور جب حکومت پاکستان کو اس کا علم ہے کہ مجلس و جلوس و ماتم شیعوں کے شعائر مذہب میں داخل ہیں تو پھر اس قوم کو اس کے حق مذہب سے روکنا گویا دو کروڑ انسانوں پر عرصۂ حیات کو تنگ کرنا ہے اور خصوصاً جب کہ مملکت پاکستان جمہوریت کے راستے پر گامزن ہے ایک پوری قوم کو ضعیف اور مضمحل کر دینا گویا پاکستان کو کمزور بنا دینا ہے۔

ملت جسم واحد ہے:۔ اسلام ایک جسم واحد ہے اور مختلف فرقے اس کے اعضاء و جوارح ہیں۔ کسی فرقہ کی کمزوری گویا جسم کے کسی حصہ کا مفلوج ہو جانا ہے اور ملت اسلامیہ کو اس کا علم ہے کہ فرقہ شیعہ وہ اہم اقلیت ہے جس کو کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آزاد کشمیر، گلگت اور پارہ چنار کے سرحدی قبائل سے لے کر مرکز حکومت تک لاکھوں نفوس اس وقت حیران و سراسیمہ ہیں کہ مسلسل ان کے حقوق پامال ہو رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ حقوق سے محرومی اس فرقہ کو ضعیف و ناتواں کر دے گی جو ملت مسلمہ کی یگانگت اور استحکام کے لئے مضرت رساں ہے۔

گزشتہ پانچ سال:۔ حالات پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ منگری ہترگی ضلع لاہور، نارووال، شاہ پور، حیدر آباد سندھ، کھوڑہ ریاست خیر پور، جگرال ضلع جہلم اور بستی نجھا ضلع میانوالی میں نہ صرف مجلس جلوس اور ماتم پر پابندیاں عائد کی گئیں بلکہ صدہا ماتم داروں کو گرفتار کیا گیا، اور کیوں؟ فقط اسی بات پر کہ عزائے سید الشہداء کو موقوف کیا جائے۔ عقل کی دنیا کے نزدیک یہ دیوانگی سہی لیکن کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ قوم شیعہ کو اس کے فرائض مذہبی کی تکمیل سے روک سکے۔

آخر سب کیوں؟ اس پانچ سال کے عرصہ میں کافی غور و خوض کے بعد افراد قوم نے اپنے آپ کو اس نتیجہ پر پہنچایا کہ جمہوری طرز حکومت میں جب تک کہ قومی نمائندگی

نہ ہو یہ کشمکش جاری رہے گی۔ آج جب کہ دستور یہ پاکستان میں قوم شیعہ کا ایک نمائندہ بھی نہیں، اس قوم کی درد بھری آواز کو اعیان مملکت تک پہنچانا ناممکن نظر آرہا ہے۔ قوم کے ہر ادارہ کی طرف سے اس سلسلہ میں وزیر اعظم کو تار دیئے گئے لیکن یہ ساری آوازیں صدا بہ صحرا ثابت ہوئیں، دستور یہ پاکستان کا جب یہ حال ہے تو مرکزی کابینہ کا کیا تذکرہ؟ مسلم لیگ کی کونسل کا کیا ذکر؟

دستوری حیلہ ترازیاں:- ان مطالبات کو جب کبھی حکومت کے مرکز تک پہنچایا گیا تو یہی جواب ملا کہ انتخابات میں حصہ لے کر اوپر آیئے لیکن جب کبھی شیعہ حضرات انتخابات کے لئے کھڑے ہوئے تو ان کو اسی بہانے شکست دی گئی کہ شیعہ ہیں ان کو رائے نہ دی جائے۔ ضلع جھنگ میں خان مہر محمد عارف سیکرٹری مسلم لیگ اس واقعہ کی ایک زندہ مثال موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شیعہ کسی مقام پر صرف آبادی بسانے کے لئے تیار نہیں ہیں انہوں نے استحکام مملکت اور اتحادِ ملت کے لئے ہمیشہ اپنے آپ کو قربان کیا ہے۔ کسی شہر میں بھی وہ اکثریتی فرقہ سے کٹ کر نہیں رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہر انتخاب کے موقع پر انہیں پیچھے دھکیل دیا گیا۔ مرکزی حکومت کا یہ فریضہ تھا کہ ان حالات کی موجودگی میں وہ نامزدگی سے ان کے حقوق کو محفوظ کر لیتی لیکن بے اعتنائی کی حد ہو گئی، اور بالآخر قوم کے فرد فرد میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ سیاسی اعتبار سے وہ لاوارث ہیں۔

چند حقائق:- شیعہ قوم کو یہ کہہ کر تسلی دینا کہ مرکز میں چند شیعہ کرسیوں پر موجود ہیں۔ مسائل سے آگاہ نہ ہونے کی دلیل ہے، اس وقت جو شیعہ حضرات ملازم سرکار ہیں وہ حکومت برطانیہ کے زمانے کے آئی سی ایس ہیں۔ جن کے تجربے اور دیانت سے قائدِ اعظم مرحوم متاثر تھے اور ان ہی کے حکم سے یہ تقررات عمل میں لائے گئے لیکن سرکاری ملازمتوں سے نمائندگی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک پوری قوم جو

تقریباً دو کروڑ افراد پر مشتمل ہے اپنے مسائل رکھتی ہے اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے اپنی آواز مرکز تک پہنچانا چاہتی ہے اگر اس آواز کو دبا دیا جائے تو یہ عمل منافی جمہوریت ہو گا۔

مطالبات :۔ وقت آچکا ہے کہ اب حکومت نہایت سنجیدگی سے ان مسائل پر غور کرے۔ اور استحکام ملت و مملکت کے لئے اور بین الفریقین منافرت کو روکنے کے لئے اقدامات کرے۔ (۱) مرکزی کابینہ میں شیعہ نمائندگی لازم ہے (۲) اور دستوریہ پاکستان میں جب کہ لاکھوں افراد پر ایک دستور مسلط کیا جا رہا ہے۔ قوم شیعہ کو نمائندگی دی جائے، یہی وہ دو اہم مطالبات ہیں جو اگر قبول کر لئے جائیں تو پوری قوم مطمئن ہو سکتی ہے۔ شیعہ دینیات کا مسئلہ اور عزاداری کے مسائل خود بخود طے ہو جائیں گے، اگر دستوریہ میں صحیح نمائندگی ہو۔

آخری درخواست :۔ اگر حکومت پاکستان اس سلسلہ میں کسی اقدام سے مجبور ہے اور اگر اس کے سامنے کوئی اور دستوری پیچیدگی ہے تو پھر اس مظلوم قوم کو ایک جداگانہ اقلیت قرار دے دیا جائے تاکہ یہ اپنے حقوق کی حفاظت میں اپنی آبادی کے تناسب سے نمائندوں کا انتخاب کر سکے۔ کم از کم اس طرح اس قوم کی زندگی خطرہ سے دور ہو جائے گی۔ وقت آگیا ہے کہ ان تمام حالات کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے اور اگر یہ دستوریہ پاکستان میں ہندوؤں کے لئے جگہ ہے، تو پھر شیعوں کے لئے بھی جگہ نکالی جائے تاکہ اسے مسلمہ مستحکم و مضبوط ہو اور تمام اسلامی فرقے دوش بدوش آگے بڑھ سکیں۔ یقین ہے کہ ہماری آواز صدا بہ صحرا ثابت نہ ہو گی۔

علامہ رشید ترابی تقاریر کے آئینے میں

۱۔ علامہ مرحوم نے ۸ سال کی عمر میں منبر پر بیٹھنا شروع کیا۔

۲۔ ۱۶ برس کی عمر میں موضوع مقرر کر کے تقاریر کرنی شروع کر دیں۔

۳۔ مسلسل ۵۰ برس ان گنت موضوعات پر تقریریں کیں۔

۴۔ مرحوم سالانہ اوسطاً ۲۰۰ مجالس سے خطاب فرمایا کرتے تھے۔

۵۔ یکم محرم سے اختتام ایام عزا تک علامہ مرحوم عموماً ۱۲۵ تقاریر کرتے تھے، رمضان میں تفسیر کی تقاریر اس کے علاوہ ہیں۔

۶۔ ایام عزا اور تفسیر کی تقاریر کے علاوہ ۳۵ تقاریر۔ ماہانہ کم از کم اوسطاً ۸ تقاریر اتوار کو عموماً ۲ تقاریر۔

۷۔ ایک اندازے کے مطابق علامہ مرحوم نے مجموعی طور پر دس ہزار تقریریں کیں۔ جن میں سے مشرقِ وسطیٰ میں ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء تک۔ ۵ سال ہر رمضان میں عربی میں قرآن کی تفسیر بیان کی۔

۸۔ ایران میں علماء کی دعوت یا سرکاری دعوت پر جب بھی گئے، ہر بار فارسی میں بیسیوں تقریریں کیں۔

۹۔ علامہ مرحوم نے افریقہ، یورپ اور برما میں قیام کے دوران انگریزی میں لیکچر دیئے۔

۱۰۔ بیس سال سے زائد مدت تک ریڈیو پاکستان سے حضرت علامہ رشید ترابیؒ

کی مجلس شام غریباں نشر ہوتی رہی۔

۱۱۔ ٹیلی ویژن پر علامہ موصوف نے شام غریباں کی پانچ تقاریر کیں جن کے عنوانات صبر، رزق، دعا، سجدہ اور یقین تھے۔

۱۲۔ علامہ مرحوم کی مقبول ترین تقاریر جن عنوانات پر ہوئیں ان میں سے چند یہ ہیں۔ گیتا جلی اور نہج البلاغہ - قرآن اور شاعری - اسلام اور سائنس - اسلام اور فنونِ لطیفہ - ادب اور مذہب، اسلامی نظریۂ حیات - اسلام اور تصوف رسول اکرمؐ کی سوانح کس طرح لکھی جائے؟ - انسان کا ارتقا قرآن کی روشنی میں۔ اسلام اور ڈاکٹر اقبال - غالبؔ اور مذہب - عقل اور قرآن - وحی ربانی کا تعقل قرآن اور حقوق بشر - قرآن اور طنز و مزاح - اسلام اور میر انیسؔ - قرآن علم ہے - قرآن اور حیات طیبہ - توحید و شرک۔

۱۳۔ علامہ مرحوم نے پاکستان میں بالخصوص کراچی میں جن مقامات پر تاریخی تقاریر کیں ان میں شاہ خراسان، نشتر پارک، خالقدینا ہال، بڑا امام باڑہ کھارادر حسینیہ ایرانیاں - بارگاہ شاہ نجف مارٹن روڈ - مرکزی امام بارگاہ لیاقت آباد حسینیہ سجادیہ - امام باڑہ رضویہ، عزاخانہ زہرہ۔

۱۴۔ علامہ رشید ترابی نے اپنی زندگی میں ڈھائی ڈھائی گھنٹے کی صرف دو طویل ترین تقریریں کیں جن میں سے ایک ذاکر مشہدی صاحب کے ہاں اور دوسری امام بارگاہ شاہ نجف مارٹن روڈ میں۔

سنہ ١٦٠٣

ترابی صاحب کی تحریر کا عکس

قطعہ

ملکِ عدم سے جتنا ہو نزول
رہِ قدس میں ہو چاہے ترو تازہ پھول
حسبِ ایک سن ممکن بن تا دمِ عدد
از نسلِ تک کو قسم محمد ہند ہو

قطعہ

خود عقل ملکان سے کلاہان سے ہو دور
جو عقل میں آ جائے وہ محدود ہے
ماورائے عقل سے مجبور تعقل ہے وہ
تحقیقِ خرد سے نہ کر معبود ہے

رباعی

و در جمله که در لطف [illegible] داشتن همی
ما فوق جهان [illegible] ما من همی
و در جمله که جان زمین صحبت [illegible]
ای [illegible] عمل کو هیچ [illegible] همی

رباعی

معشوق [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

۱۶ جون

دشمن کے مقابل ہیں تو قائم ہیں حیدرؑ
منبر پہ سخن ہو تو دوام حیدرؑ
اس دور سے واقف ہے زمانہ سارا
وہ حسن جہاں بیں ہے تمام حیدرؑ

حق کی صورت کسی کو دیکھنا ہو
یا خدا پہ اور کسی کو دیکھنا ہو
تو علی کو نظر جو آئے جو دیکھنے سے آشنا
گویا اسد اللہ کی نبی کو دیکھنا ہو

علامہ رشید ترابی کے نام نواب بہادر یار جنگ کے خط کا عکس

(نواب بہادر یار جنگ (بہادر))
صدر آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ
حیدرآباد دکن

۱۳ ربیع الاول [illegible]

(Nawab)
Bahadur Yar Jung
(Bahadur)
President All India States Muslim League
HYDERABAD-DECCAN.

برادر شریف جناب مولانا رضا حسین صاحب رشید ترابی زید لطفکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ مزاج شریف۔ مجھے یہ سنکر بہت مسرت ہوئی کہ آپ اپنے دورہ کے سلسلہ میں بعض ریاستوں میں بھی تشریف لیجا رہے ہیں۔ میرے لئے [illegible] اور مسرت کا موجب ہوگا اگر آپ ہر ریاست میں مسلم لیگ کے کام کو بھی ملاحظہ فرمائیں۔ اسکا کہ آپ سے زیادہ موزوں اور کوئی شخصیت نہیں ہو سکتی۔ جہاں مسلم لیگ کا کام شروع ہو چکا اسکو منظم کرنے کی تدبیر فرمائیے اور ہدایت کیجئے کہ [illegible] وہاں کی مسلم لیگ بنے۔ اور آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ سے باضابطہ الحاق کریں۔ جہاں مسلم لیگ موجود نہ ہو وہاں کوشش فرمائیے کہ ایک جماعت قائم ہو جائے۔ اگر کسی جگہ مسلمان کسی اور نام سے جماعت کی صورت میں کام کر رہے ہوں تو آپ مہربانی فرما کر تمام مسلمانوں کا اتحاد کر خالص قومی جماعت بنانے کی تحریک فرمائیں [illegible]۔ اور تمام مسلمانوں کو [illegible]

[illegible] تمام [illegible] صوبائی [illegible]

([illegible]) [illegible]

[illegible] تمام [illegible] — [illegible]

مستحق ہیں [illegible] —

امید ہے کہ [illegible]

آپ کی مخلص

[illegible]

صدر [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

1965ء

ترابی صاحب کے نام حضرت قمر جلالوی کا خط انکی اپنی تحریر میں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لسان القوم حضرت علامہ رشید ترابی مدظلہ کے ساتھ میرا اکثر وقت گزرا ہے
میرے لئے نہایت اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنی ساری مصروفیتوں کے باوجود فکر شعر کے لئے
کسطرح وقت نکال لیتے ہیں میں نے ان کو اکثر رات کے دو بجے مطالعہ کرتے ہوئے پایا ہے
خصوصاً جبکہ وہ اپنی تقریروں کی تیاری میں مصروف ہوتے ہیں مجلسوں کے ساتھ ساتھ
فکر سخن اور پھر اونکی اپنی زمینیں واقعی ایک ندرت ہے۔ خود وہ اپنے آپکو غزل گو
شاعر نہیں کہتے ہیں بلکہ بار بار یہی فرمایا ہے کہ میں اپنے حکیمانہ افکار نظم کرلیتا ہوں
تاکہ جو باتیں کسی تقریر میں پوری طرح ادا نہ ہوسکیں انکو علامہ موصوف شعر کی صورت میں
ادا کردیتے ہیں تاکہ محفوظ رہ جائیں۔ یہ تو آنے والا زمانہ فیصلہ کریگا کہ حضرت علامہ نے
علم و ادب کی کہاں تک خدمت کی ہے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ افکار میں ان کی نظیر مشکل سے
ملیگی اور ان کے کلام کو شرح کے ساتھ پڑھنا اور پڑھانا قوم کی بڑی خدمت ہوگی۔
ان کی فکر کا کام متعین ہے اور مقصود ظاہر کسی وقت بھی اپنے مرکز سے نہیں ہٹتے اور یہ جانتے ہیں کہ

ہم شریعت حقہ کا اعلان ہو۔ اور وہ اشعار معلوم ہو جائیں۔ یقیناً اس مجموعہ کا
مطالعہ کرنے والے اپنی اپنی پسند کے اشعار کا انتخاب کر لینگے۔ لیکن میں نے انکی نظم
میں اکثر اشعار کو کامل پایا ہے اور اس کی تصدیق انشاء اللہ ہر نکتہ سنج کریگا۔ خداوند عالم
حضرت علامہ موصوف کو دیرگاہ سلامت رکھے۔ فقط

قم حیدرآباد ۲۰ رجب ۱۳۸۵ھ

(سید محمد جعفر قدسی حیدرآبادی)

ناظم آباد کراچی

علامہ رشید ترابی کے نام ان کے معالجِ خصوصی کے خط کا عکس

Shaukat Ali Syed., Lt.Col., SK., TI., FCPS., FRCPE
Physician

Head, Department of Cardiolo
Jinnah Postgraduate Medic
Centre, Karachi.

18th December, 1972.

My dear Allamah

With the approach of Muharram I thought it is my duty to put this before you for serious consideration. You will remember that you had a very severe heart attack in June this year, with many serious complications which you were able to overcome by God's kindness and mercy.

It is imperative in your state of health to avoi over work, stress and strain as much as possible so that the nation can continue to benefit from your wisdom and sagacity for a long time to come. Inshaallah.

It is my humble submission that under no circumst ces you should deliver more than one speech in any one day.

Any thing more than this would tax the reserve of your heart to an extent it may not be able to withstand (God forbid).

Even one speech a day may be too much if it is extended beyond 30 to 40 minutes.

With my respects and best wishes,

Yours sincerely,

Shaukat Ali Syed

علامہ رشید ترابی کے نام بانئ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے خط کا عکس

MASTUNG,
13th October, 1945.

Dear Sir,

I thank you for your letter of October 1st and the copy of the letter to the Maharaj Kumar of Mahmudabad enclosed with it, and I beg to inform you that I have already issued my statement on the question of the so-called Shia Conference. I hope by now you have read it as it was broadcast on Radio and published in the Press.

Yours faithfully,

[signature]

Nasiruddin Raza Husain Rasheed Turabi,
Nampally,
HYDERABAD (DECCAN).

علامہ رشید ترابی کے نام قائدِ اعظم محمد علی جناح کے خط کا پس منظر

ہندوستان میں سن ۱۹۴۰ء میں شیعانِ ملک کے سیاسی امور کیلئے ایک جماعت شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا۔ حالانکہ شیعہ کانفرنس کے نام سے ملتِ جعفریہ کی ایک غیر سیاسی لیکن نمائندہ جماعت پہلے سے قائم تھی۔ اسی جماعت کے قیام کے بعد ۱۹۴۸ء میں کچھ ایسے شیعہ اس سیاسی جماعت سے وابستہ ہو گئے جو دراصل کانگریسی تھے ان حضرات میں علی ظہیر صاحب اور جعفر حسین صاحب ایڈووکیٹ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے اپنی جماعت کے زیرِ اہتمام حسین بھائی لالجی کی صدارت میں ایک جلسہ کیا، یہ لالجی وہی تھے جنہوں نے اسمبلی کی ممبری کیلئے مسلم لیگ سے قائدِ اعظم کے خلاف الیکشن لڑا تھا۔ وہ چونکہ خاصے مالدار آدمی تھے اور ان کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کی اکثریت کانگریس کے ساتھ مل جائے، اسی لئے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں وہ اسی قسم کے جلسے کروا رہے تھے۔ سید عباس ایڈووکیٹ اور ابو البصیر رضوی ایڈووکیٹ صاحبان دونوں شانہ بشانہ آگے آگے شیعوں کی اس نئی اور نام نہاد تنظیم کے خلاف احتجاج کیا اور اس بات پر زور دیا کہ شیعوں کو مسلم لیگ میں ہونا چاہئے کہ مسلم لیگ ہی ان کی تنظیم ہر اعتبار سے ایک مناسب جماعت ہے۔ دراصل شیعہ پولیٹیکل کانفرنس نے جو دراصل کانگریس کی ایجنٹ تھی شیعوں کی اس جماعت کا الگ تشخص شروع کر دیا کہ تقسیم ہند کے معاملے میں کانگریس شیعوں کو ان کے حقوق کا زیادہ تحفظ دے رہی ہے جبکہ مسلم لیگ نے کوئی خاص وعدہ نہیں کیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو کانگریس کے تمام ہتھکنڈوں کا علم تھا لہٰذا اس کا مقصد یہ تھا بانیِ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح نے شیعہ کانفرنس کو جواب یہ دیا کہ پاکستان میں شیعوں کو بھی دوسرے پاکستانیوں کی طرح برابر حقوق حاصل ہوں گے لیکن شیعہ پولیٹیکل کانفرنس نے جناح صاحب کے اس بیان کو غلط رنگ دے کر یوں مشہور کیا کہ قائدِ اعظم نے ایک عام بات کہہ کر شیعوں کو ٹال دیا ہے۔ بہرحال یہ مسئلہ سنگین صورت اختیار کر جاتا اگر علامہ رشید ترابی نے اپنی دور اندیشی سے محسوس کرتے ہوئے اس سلسلے میں قائدِ اعظم کو خط لکھا جس کے جواب میں قائدِ اعظم کی طرف سے علامہ مرحوم کو وہ خط موصول ہوا جس میں کانگریس کا ایجنٹ شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کو نام نہاد "شیعہ کانفرنس" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

علامہ رشید ترابی کے نام رولر آف نگر اسٹیٹ (گلگت ایجنسی) کے خط کا عکس

Brigadier
Mir Shaukat Ali
H.Q.A., Ghazi-i-Millat
RULER OF NAGAR STATE
GILGIT AGENCY
(W. PAKISTAN)

NAGAR STATE

Date 6-8-196[illegible]

[illegible]

[illegible]

سلام

علامہ رشید ترابیؒ

ہے یہی وقت ان کا دامن تھام لے
گرنے والے اب علیؑ کا نام لے

مرحبوں کے سر پہ ہے تیغِ علیؑ
اپنا بدلہ صبح لے یا شام لے

ہے یہ جبتِ علیؑ کچھ تند و تیز
حُر بنے جو مستقیوں سے کام لے

وہ علیؑ کی نیند ہے ہجرت کی رات
ہر نفس پر رب سے جو انعام لے

ہے ابوذرؓ سے وِلا تو اپنے سر
حق پرستی کا بھی اک الزام لے

کب ہے مشکل حق و باطل کی تمیز
کوئی کروٹ تو دلِ ناکام لے

بے مودّت آدمی معذور ہے
جس طرح جو معنیٔ اسلام لے

آخر اس چوکھٹ پہ آنا ہے تجھے
جانے والے یہ بھی اک پیغام لے

دفن اصغرؑ ہوگئے شہؑ نے کہا
میرے بچے اب یہاں آرام لے

عصرِ عاشور آ گئی آوازِ رسولؐ
فاطمہ بازوئے زینب تھام لے

قید خانے میں کوئی بچی ہے دفن
اک امانت اور ملکِ شام لے

اے ترابی مغفرت ہے آبِ حیات
موت کے ہاتھوں کوئی جام لے

میری موت

علامہ رشید ترابی

تھیں یہی انگڑائیاں اِک دن جوانی کی بہار
نزع کے جھٹکوں میں جن کا ارتقا ہے انتشار

سر اٹھا کر یہ سمجھتے تھے کہ دنیا بس میں ہے
اب جھکی گردن کہ جب دنیا ہوئی سر پر سوار

مسکراتے تھے جوانی کی بہاریں لوٹ کر
اب ہنسی آتی ہے جب لٹنے کو ہے اپنی بہار

زندگی آغاز میں شفاف اک آئینہ ہے
موت کے انجام تک اس پر جلا ہے یا غبار

گود میں لے کر کھلونا جیسے بچہ سو رہے
لے کے دنیا قبر میں سوتے ہیں کتنے ذی وقار

کتنے رنج و غم ہیں لازم اک مسرت کے لئے
کتنی موتیں نخلِ ہستی کے لئے ہیں برگ و بار

زندگی کو یاد کرنا موت کے ہنگام پر
ہے یہ دستورِ جہاں سب مرنیوالوں کا شعار

زندگی میری مری دنیا کا ہنگامِ عمل
موت میری میرے ہنگامِ عمل کا اختصار

زندگی بھی ہے اضافی ہے موت بھی
ہم نہیں ہوں گے مگر ہوں گے یہی لیل و نہار
ہم نہ ہونگے یونہی چمکے گا ستارہ صبح کا
شامِ غم خونِ شفق سے یونہی ہوگی آشکار
ذرہ ذرہ کے لئے اس کا عروج اسکا زوال
غنچہ غنچہ کے لئے اس کی خزاں اس کی بہار

زندگی کیا ہے کسی گلشن میں آویزاں قفس
موت کیا ہے خود بخود پیدا ہو گر راہِ فرار
زندگی کشتِ عمل کی آبیاری سر بسر
موت کیا ہے فکرِ حاصل انتظارِ برگ و بار
زندگی اور موت یہ دو منزلیں ہیں روح کی
ایک منزل حصر کی ہے ایک منزل بے حصار
زندگی مرکز پہ آکر کام کرنا روح کا
موت یعنی انتشارِ روح یعنی ختمِ کار
زندگی ارمان کے تارے کی جگمگ رات بھر
موت اس تارے کا گرنا ٹوٹ کر بے اختیار
زندگی گویا تخیل کے لئے خوابِ عجیب
موت اِک سعیِ تکلم چونک پڑنا ایک بار
زندگی وہ اختیار اپنا جہاں باطن میں جبر
موت یعنی جس کا ظاہر جبر باطن اختیار

زندگی کیا ہے سراپا اعتبارِ آرزو
موت کیا ہے فی الحقیقت آرزوئے اعتبار

زندگی کیا ہے مسلسل غیر محسوس اک سفر
موت کیا ہے بے ارادہ ایک منزل پر قرار

زندگی کیا ہے تلاشِ دوست کی حیرانیاں
موت وعدہ کی گھڑی ہے یعنی خاموش انتظار

کاش وہ آتے وہ آئے آ گئے وہ آ گئے
میرا جانا ان کا آنا وقت کم باتیں ہزار

آنے والے میری دنیا کیا چھپاؤں کیا کہوں
داستاں اک عمر کی اور دو نفس کا اختصار

السلام اے رازدارِ خلوتِ بزمِ ازل
السلام اے صبحِ اوّل فخرِ جنسِ اعتبار

السلام اے منتہائے نعرہ ہائے ہو، کشاں
موت کو آسان کر اے وقت کے پروردگار

جام چھلکا، آنکھ جھپکی، ہم چلے، ساقی اٹھا
نزع کی ہچکی لگی، میں آنے والے پر نثار

وہ رگیں کھنچنے لگیں پتھرا گئیں آنکھیں رشید
وہ اٹھا رونے کا غل ہٹنے لگے تیماردار

ترانہ

علامہ رشید ترابیؒ

۱۹۵۵ء میں یادگارِ مرتضوی کمیٹی کے زیرِ اہتمام کراچی میں مولائے کائنات حضرت علیؑ کے ولادت کا چودہ سو سالہ جشن منایا گیا تھا، حضرت علامہ مذکورہ کمیٹی کے جنرل سیکرٹری اور جناب مسرور عباس ایڈوکیٹ جوائنٹ سیکرٹری تھے۔ علامہ موصوف نے زیرِ نظر ترانہ انہی دنوں تخلیق کیا تھا۔ جناب معشوق علی خاں اکثر اس ترانے کو پڑھا کرتے ہیں۔ ترابی صاحب کو جناب معشوق علی خان کی آواز سے بڑا پیار تھا۔ زیرِ نظر کتاب کی دوسری جلد میں آپ ترابی صاحب مرحوم پر جناب معشوق علی کا خصوصی مضمون مطالعہ فرما سکیں گے۔

نفس نفس میں حوصلے قدم قدم پہ برتری\
ورق ورق میں علمِ حق، طبق طبق میں آگہی\
جس کے نام سے ہے سب پہ چشم و دل کی روشنی\
بس ایک دھن پہ جا رہا ہے کاروانِ زندگی

علیؑ علیؑ، علیؑ علیؑ، علیؑ علیؑ، علیؑ علیؑ

رہے جو شب تو کیا خطر کہ جیب میں سحر بھی ہے
گھرے ہوئے جو ابر ہوں تو برق کا گذر بھی ہے
جمے ہوئے قدم بھی ہیں لڑی ہوئی نظر بھی ہے
جہاں کہیں ہیں مرحبؔ وہیں ہے ضربِ حیدری
علیؑ علیؑ، علیؑ علیؑ، علیؑ علیؑ، علیؑ علیؑ

تسلسل ایک فکر ایک ربط ایک ہے یہاں
ناحق میں مختلف نہ حق سے مختلف دل و زباں
ہٹا سکا نہ ہم کو راہ سے زماں ہو یا مکاں
ازل سے تا ابد یہی ہے ایک صورت سرمدی
علیؑ علیؑ، علیؑ علیؑ، علیؑ علیؑ، علیؑ علیؑ

دوامِ انتظام ہے کہ وحدتِ نظام ہے
یہی ہے عدل جس سے فرش و عرش کا قیام ہے

قیامِ عدل کے لئے ضرورتِ امام ہے
امام وہ کہ جس کا عدل خود مزاج بندگی
علیؑ علیؑ، علیؑ علیؑ، علیؑ علیؑ، علیؑ علیؑ

خدا کا نام لے کے یوں بڑھو کہ ہو تمہیں یقین
پھڑک اٹھے رگِ حیات اور لرز اٹھے زمین
مگر یہ شرط ہے کہ بڑھ کے پھر قدم ہٹے نہیں
نگاہ میں نمونۂ حیاتِ حق رہے یہی
علیؑ علیؑ، علیؑ علیؑ، علیؑ علیؑ، علیؑ علیؑ

قصیدہ

علامہ رشید ترابی

تم نوازِ چمن ہو یہ بہاروں سے کہو
ہو خوش آوازِ گلستاں تو ہزاروں سے کہو
باغِ دیں گلشنِ دانش کی ہے رونق تم سے
دیں گواہی یہ ذرا چاند ستاروں سے کہو
ابرِ رحمت ہو زمانے میں کوئی فصل سہی
پھول تو جانتے ہیں دشت کے خاروں سے کہو
راز کیا ہے کہ خود آگاہ و خدا بیں ہو تم
بوئے الفت کہیں پاؤ تو شراروں سے کہو
منزلِ عشق پہ پہنچو تو ہے آوازِ سفر
دل شکستہ سے نہ چلیں اپنے سواروں سے کہو
دردمند وہ ہے فقط درد تمہارے دل میں
مانگ لیں تم سے مدد درد کے ماروں سے کہو
ہے غمِ دوست میں کتنا دلِ بیدار کو چین
غمِ ایام کے اِن سینہ فگاروں سے کہو
ظلمتوں میں بھی تمہاری ہیں نگاہیں روشن
نور کہتے ہیں کسے ڈوبتے تاروں سے کہو

دل سی شے قابلِ احراق نہیں ہوتی ہے
کینہ در آگ حسد خیز شراروں سے کہو
بحرِ ہستی کے لئے ہے وہ سفینہ کیسا
کتنے طوفانوں کو ٹالا ہے کناروں سے کہو
تم سے کیوں دور گذرتی ہوئی سطوت کے صنم
جلتی پھرتی ہوئی بے عقل مزاروں سے کہو
کس طرح رہ گئے ہم دشمنیٔ دہر کے ساتھ
اپنی تاریخ کے افسانہ نگاروں سے کہو
قول ثابت ہو تو حاصل ہے ثابت قدمی
کیوں بدلتی ہے زباں شعبدہ کاروں سے کہو
سب ہے بے حد و کہ فقط ظاہر دنیا کب تک
غیب میں شک ہے تو ایماں کا دھوکہ کب تک

بنا ازل میں جو آئینِ شمع و پروانہ
یہ لکھ دیا گیا کوئی ہوا طلب نہ جلے
نگاہِ لطف جو مجھ پر تھی بزم میں ، تو کہا
یہ ایک چراغ زیادہ جلا ہے اب نہ جلے

غزل

علامہ رشید ترابیؒ

مجبور ترے ذکر سے ہیں ذکر نہیں اور
لیکن ہے اثر اس کا کہیں اور کہیں اور

جب نقش قدم ان کے مٹاتا ہے زمانہ
ہر نقش کو لے کے ابھرتی ہے زمیں اور

پردے میں کوئی اور نہ ہو نام سے انکے
جتنے وہ چھپے جاتے ہیں جھکتی ہے جبیں اور

معلوم ہے پروانے حقیقت میں ہیں کتنے
وہ شمع بجھاتے ہیں کہ ہو جائے یقیں اور

میں آپ کو ڈھونڈ آیا ہوں امکاں کی حدوں تک
اب آپ مجھے ڈھونڈ کے لے جائیں کہیں اور

غزل

علامہ رشید ترابی

کیا اُن کا کرم ہم پہ ستم جنکے نہیں ہیں
اُن سے ہمیں کیا کام ہے ہم جنکے نہیں ہیں

کوئی تو سہارا بنے بت ہو کہ خدا ہو
کیا اُن کا بھرم دیر و حرم جنکے نہیں ہیں

یہ سوچ رہا ہوں انہیں کیا کہہ کے پکاروں!
بے نام ہیں وہ نام بھی کم جنکے نہیں ہیں

کیا عمر گذشتہ کے نشاں ڈھونڈ رہے ہو
وہ چند نفس، نقشِ قدم جنکے نہیں ہیں

غزل

علامہ رشید ترابی

دیتی ہو وفا جسے دلاسا
دریا سے پلٹ سکے وہ پیاسا
کیا نور کو مٹا سکے گا
سایہ تو مٹا دے اک ذرا سا
ہے زیست تو احتیاج بھی ہے
لے چھین یہی ہے ایک کاسا
وقت آگیا کھیل وقت سے اب
لے دیکھ پلٹ رہا ہے پاسا

جوابِ شکوہ

علامہ رشید ترابی

شب جو دل میں خلشِ خارِ غم دوش ہوئی
فکرِ فردا سے خرد بڑھ کے ہم آغوش ہوئی
طبع کیفِ مئے پندار سے مدہوش ہوئی
بہکی اس درجہ کہ آدابِ فراموش ہوئی
یوں تو رہتی تھی شکایت فلکِ پیر سے بھی
جی میں جو آیا کہا مالکِ تقدیر سے بھی

ناگہاں آئی صدا کان میں قدرت میری
مجھ سے بندہ مرا کرتا ہے شکایت میری
خیر، گھیرے ہے غضب کو مرے رحمت میری
صاف دل سے ہے یہ شکوہ بھی عبادت میری
آج تیرا یہ گلہ مجھ کو بھی محبوب ہوا
غیر سے میری شکایت جو نہ کی خوب ہوا

ہاں، مرے بندے یہ کہ باعثِ شکوہ ہم ہیں؟
بیوفائی کا ہے جس کی یہ فسانہ ہم ہیں
عقل ہی کیا تری، کیا سمجھے گا تو کیا ہم ہیں
بحرِ مواجِ کرم، لطف کا چشمہ ہم ہیں

تو نہ تھا خاکِ عدم سے تجھے موجود کیا
اس پہ دعویٰ یہ کہ تو نے ہمیں معبود کیا

ہم کو معبود بنایا یہ بڑا کام کیا
خوب پھر عبد نے معبود کا اکرام کیا
بندگی کرنے کی جا عشق کا اقدام کیا
غیرتِ عاشق و فرہاد بنے، نام کیا

بیچ میں جب کہ قدم عشق کا آیا پھر کیا
بن کے معشوق اگر ہم نے ستایا پھر کیا

کیوں نہ ہو بس تری کیا بات مرے البیلے
بن کے اللہ کے دیوانے بہت کھیل کھیلے
رشکِ ایوب بنے، صبر کے پاپڑ بیلے
کیوں یہ کہتا نہیں دنیا کے لئے غم جھیلے

ہر چہ مے باشی تسلیم فراموش مباش
کفر در سینہ و قرآن در آغوش مباش

گو مشیت نہیں اللہ کی پابندِ رسوم
مصلحت سے مری خوش ہے کوئی، کوئی مغموم
منہ لگایا جو ذرا ہم نے تو اس پر ہے یہ دھوم
کیا کٹھن رستہ ہے الفت کے تجھے کیا معلوم

شمعِ الفت دلِ عاشق کو جلائے جب تک
رنجِ غم بنا مسرت کو رتیا دے جب تک

تو تو کیا مال ہے، غافل تری ہستی ہے کیا
جن و انس و ملک و طیر و وحوش صحرا
بحر و بر و دشت و جبل شمس و قمر قطب و سہا
آب و خاک آتش و باد ارض و سما ظل و ضیاء

گر بغاوت پہ یہ سب خلق مہیا ہو گی
میری قدرت کے خزانے میں کمی کیا ہو گی

آدمؑ و نوحؑ و ابراہیمؑ و شعیبؑ و داؤدؑ
موسیٰؑ و یوسفؑ و یعقوبؑ و خضرؑ و یونسؑ و ہودؑ
ان کی خلقت کے تھا ہمراہ مصائب کا ورود
فاقہ پر فاقہ کئے لب پہ رہا یا معبود

یہ تھے کچھ دوست مرے جن کے یہاں نام لئے
ایسے بھی گزرے ہیں کچھ جن سے بڑے کام لئے

تیری وہ جرأت و قوت کہ تجھے جس پہ ہے ناز
تو سمجھتا ہے اسی بل پہ لئے شام و حجاز
لیکن اے بھولنے والے بشر، اے بندۂ آز
یاد ہے کس کو مدد کے لئے دی تھی آواز

سورۂ فتح میں تھی فتح اشارہ کس کا
جز ہمارے ترے دل کو تھا سہارا کس کا

دن کو کرتا تھا جو دعوائے خدائی نمرود
پردۂ شب میں رہا کرتا تھا مشغول سجود

ظلم گو نفس پر اپنے تھا پئے نام و نمود
گو خلق میں ہر چند تھا گمراہ و عنود

میری درگاہ میں جب عجز کا تحفہ لایا
اس نے دنیا کی حکومت میں جو مانگا پایا

ہم نے موسیٰؑ سے جو پوچھا یہ کہ اے غیر سلیل
میری مخلوق میں ہے سب سے سوا کون ذلیل
بعد آداب یہ کی عرض کہ اے ربِ جلیل
میری دنیا کے سہارے مری ہستی کے کفیل

اس ترے بندے سے بڑھ کر کوئی محتاج نہیں
ابنِ عمراں کے سوا کوئی ذلیل آج نہیں

پانچ وقت آپ پڑھا کرتے تھے ہر روز نماز
وہ بھی لوگوں کو دکھانے کو اسی پر ہے یہ ناز
اسی اطاعت پہ ہے یہ شور یہ دھوم اور طناز
کیا یہی عاشق و معشوق میں ہیں راز و نیاز

کب عبادت تھی کوئی ریو ریا سے خالی
کاش ہوتا ترا دل غیر خدا سے خالی

کیا کرے تو کہ تجھے درکِ حقیقت ہی نہیں
دل تو ہے سینہ میں دل میں مگر الفت ہی نہیں
خوگرِ لذتِ آلامِ محبت بھی نہیں
ادعا عشق کا اور عشق کی ہمت ہی نہیں

طالب دید ہر اک محو ہوس آتا ہے
ایک موسیٰ ہے کہ در دیدۂ نفس آتا ہے

تو جو کہتا ہے کہ اب طور ہیں بے طور، سہی
لطف و احسان نہیں ہے؟ ستم و جور سہی
ہے مشیت جو ہماری تو یہی دور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

محو آرائش محفل رہیں محفل والے
ہم سے پردہ میں ملیں آکے جو ہیں دل والے

ہم خوشی چاہیں تو کس طرح سے چاہیں تیری
صاف غیروں سے مل جاتی ہیں راہیں تیری
دل کہیں اور ادھر کو ہیں نگاہیں تیری
وقفِ رنج و غمِ دنیا ہوئیں آہیں تیری
تجھ میں اگلی سی محبت نہیں وہ بات نہیں
پھر یہ کہتا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

دولت و حشمت دنیا ہے مری دین ضرور
سینکڑوں آکے سلیمان بنے میرے حضور
غنچہ غنچہ میں زرِ ناب کیا ہے مستور
ذرہ ذرہ ہے دُر و لعل کا گنج معمور
دوستوں کے لئے لیکن یہی ناداری ہے
ہاں مرے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

ادعا گر ہے مرے عشق کا معیوب تو بن
داغ کھا داغ پہ ہمصورت ایوبؑ تو بن
کھو کے نورِ نظر اپنا کبھی یعقوبؑ تو بن
ہم بنیں تیرے حبیب آج وہ محبوب تو بن
دل میں احباب مرے رکھتے ہیں شمشیر مری
خونِ عاشق میں نظر آتی ہے تصویر مری

پایا اسلام تو کیا خادمِ بوذر نہ ہوا
ہاں بلالؑ حبشی کے بھی برابر نہ ہوا
غنچہ پھوٹا تھا کہ مرجھایا ہوا گل تر نہ ہوا
پی کے آغوشِ صدف میں بھی تو گوہر نہ ہوا
دوست ہوکر مرے دشمن کا شناسا نکلا
میرا بندہ نہیں تو نفس کا بندہ نکلا

امتحاں میرا مراتب کی خبر دیتا ہے
ظرف کو دیکھ کے تکلیف سے بھر دیتا ہے
پا کے مرضی مری کوئی تو پسر دیتا ہے
میرے دربار میں تحفہ کوئی سر دیتا ہے
گو درِ منزلِ تسلیم و رضا مشکل ہے
جن کے رتبے ہیں سوا انکو سوا مشکل ہے

تو تھا ناچیز تجھے چیز بنایا ہم نے
جسم بے جاں کو ترے جاں سے سجایا ہم نے

باندھ کر تارِ نفس ساز ستایا ہم نے
اپنی قدرت کا تماشہ یہ دکھایا ہم نے
واقف ایمان سے کر کے تجھے انسان کیا
تو سمجھتا ہے کہ معبود پہ احسان کیا

ذکر بچپن کا نہیں وہ تو ہے خارج زحساب
کیا برباد سیہ مستیوں میں عہد شباب
آئی جب پیری تو سمجھا اسے دنیا میں عذاب
تو کسی حال میں خوش مجھ سے رہا خانہ خراب
دن الم کے ذہیے عیش کی راتیں نہ رہیں
دھوکا ہی دھوکا رہا عشق کی باتیں نہ رہیں

تیری روزی کا ہوا کرتا ہے ہر روز نزول
شکر میں جس کے یہاں تحفۂ عصیاں ہے وصول
کچھ بتا سکتا ہے کیا عذر ہے تیرا معقول
ہاں مگر یہ کہ ہے تو ظالم و ناداں و جہول
ہم ہیں مائل بہ عطا لطف و کرم پر تیار
تو گناہوں کے کیا کرتا ہے دفتر تیار

بیخودی میں کہا صیاد سے کیوں رازِ چمن
صبر کے ساتھ اٹھائے نہ گئے نازِ چمن
خود ہی پھندے میں پھنسا زمزمہ پردازِ چمن
اپنے ہاتھوں سے بنا خانہ برانداز چمن

دشمنِ علم و عمل ہو کے جگر سوختہ ہے
اپنے معبود سے کیوں آتا بر افروختہ ہے

مضطرب قلب ہے رہتا نہیں یک سو ہو کر
پھر رہا ہے حرم و دیر میں آہو ہو کر
روز مستی میں گزرتا ہے لب جو ہو کر
بسملِ عشقِ حسیناں پری رُو ہو کر

داد غیر ہے دعوائے محبت دیکھو
عاشقِ شاہدِ توحید کی صورت دیکھو

زندگی خواب بنی اور پریشاں بھی ہوئی
تیری دنیا صفتِ آئینہ حیراں بھی ہوئی
نفسِ بادبنی عمر گریزاں ، بھی ہوئی
صبحِ پرسشِ شبِ غفلت سے نمایاں بھی ہوئی

اب بھی ہشیار ہو اے وقت کے کھونے والے
دن چڑھا ، چونک ، سرِ شام سے سونے والے

میرا منشا ہے یہی اور میری خواہش ہے یہی
کوئی بندہ مری درگاہ سے بھاگے نہ کبھی
تجھ کو آنا ہے تو آ ہی آ . . . بلکہ ابھی
پردہ اٹھ جائے مرا حکم ہو تیری مرضی

حق کے آنے میں ہے کیا دیر جو باطل جائے
دور کر دل سے بُت آ ز خدا مل جائے

میں ترا شب کے اندھیرے میں نگہبان رہا
روز کے تیرے گناہوں سے بھی انجان رہا
تو ہی سرگشتہ رہا غافل و حیران رہا
ایک شب بھی میرے پاس آکے نہ مہمان رہا

غیر کی بزمِ طرب میں تو رسائی کی ہوس
خوانِ نعمت سے مرے نسلۂ ربائی کی ہوس

آج دربار میں مدعو تجھے کرتا ہے کریم
ہدیئے میرے لئے دو لائیو اے زار و سقیم
مضطرب پہلوئے صدچاک میں ہو قلبِ سلیم
اور ہاتھوں پہ رہیں آنسوؤں کے دُرِّ یتیم

بہ نیاز آ کہ چو سوئے بارگہ ناز آئی
بگذر از خویش کہ در محفل ما باز آئی

بال سمِ آلودۂ ہوس اور دلِ غم نوش نہ رکھ
جلوہ بیں عقل کو غفلت سے ہم آغوش نہ رکھ
محمل دل کو گناہوں سے سیہ پوش نہ رکھ
ربطِ اغیار سے اور دوست فراموش نہ رکھ

آج بندہ سے یہ اندازِ تکلم میرا
گویا اس رنگ سے روشن ہے ترنم میرا

رشید ترابی

۲۷ رجب ۱۳۵۵ھ
حیدرآباد دکن

علامہ رشید ترابی کی پہلی تقریر

فلسفہ اخلاق و جہاد

گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات
قافلہ حجاز میں ایک حسینؑ بھی نہیں

ہر روز کتنے قافلے حجاز اور عراق کے ریتلے میدانوں پر گرم سفر نظر آتے ہیں اور ہر صبح و شام دجلہ و فرات کے کنارے کتنے کاروان قیام پذیر ہوتے ہیں لیکن کسی قافلہ اور کسی کاروان نے ایسے نقوشِ سفر نہیں چھوڑے جیسے کہ قافلہ آلِ محمدؐ نے اپنے نشانِ تاریخ کے صفحات پر مرتسم کر دیئے ہیں۔ ہلالِ محرم یقیناً عینی شاہد ہے اس حق پرست قافلہ کا جس کو مجبوراً مدینہ چھوڑنا پڑا جس کو خانۂ حق میں پناہ نہیں رہی۔ جس کو کوفہ والوں کی دعوت نے عراق کی زمین تک کھینچا وہ قافلہ جو ابھی گرم سفر ہے اور منزل قریب ہے قافلہ سالار منتہائے محبت سے قریب تر ہونے کی فکر میں ہے اور اعلائے کلمۂ حق کے لئے وعدہ گاہ کا متلاشی۔

اے ہلالِ محرم تو نے مدۃِ آدم و عالم سے بڑے بڑے تغیرات اور انقلابات دیکھے یقیناً تو نے قوموں کی آبادی اور بربادی کو دیکھا اور ہاں تو نے خونریز لڑائیاں بھی دیکھیں مہلک اور خون آشام تلواروں کو انسانی لہو سے اپنی پیاس بجھاتے بھی دیکھا ہوگا لیکن ایسا۔ ہلالِ محرم جس کا بچہ بچہ اپنی شرافتِ ذاتی کی وجہ سے رشکِ شمس و قمر تھا اور جو فرات کے کنارے تشنہ لب قتل ہوا تو یقیناً تجھ کو دیگر حوادثِ عالم اور اس درد آگیں حادثہ میں بہت کچھ فرق نظر آتا ہوگا۔ وہ نمایاں فرق جو اس تیرہ سو برس پہلے گزرنے والے واقعہ کو تمام واقعاتِ عالم میں ممتاز کر رہا ہے۔

اے محرم کے چاند ــــ زہرہ کا چاند طاغوتی بادلوں کی سیاہی میں جا رہا ہے اور

اے محرم کے چاند اس قافلے کے آغاز سفر کے آغاز سفر کا سامان بھی تو نے دیکھا ہے۔ اور انجام سفر بھی تیرے پیش نظر ہے۔ ان تیرے خاموش طلوع و غروب میں ایک وہ تاریخ بھی پنہاں ہے۔ جو ہر سال تیری رویت کے ساتھ ہی ہماری زبانوں پر جاری ہو کر ہمارے قلب و نظر کے لئے تعبیروں کی راہیں کھول دیتی ہے —— ہمیں ماضی و حال سے مسلسل ہو کر مستقبل کی تعمیر میں مصروف نظر آتا ہے اور ہمیں ہر ہجری سال اپنے آغاز میں ملت اسلامیہ کے سامنے ایک عظیم المرتبت قربانی کے واقعہ کو یاد دلاتا ہے۔ تاکہ ہم زندگی کے اس اہم ترین مقصد تک پہنچ جائیں جو کہ عبادت ہے۔ استکمال فضائل نفسی اور اصلاح کے حصول کی جدوجہد ہے جس کو کمالِ اخلاق اور جہاد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

کامیاب و کامران ہے وہ قوم جو اخلاقِ فاضلہ کے مدارج حاصل کرے اور افراد کی واجتماعی ترقی کے لئے ہر جہتی جدوجہد جاری رکھے۔ آنے والی تقریروں کے عنوان میں "فلسفۂ اخلاق و جہاد" کل سے اس موضوع پر تقریر ہوگی۔ وقت آگیا ہے کہ ملتِ مسلمہ اپنے حالات کا صحیح جائزہ لے کر اس منزل تک پہنچ جانے کی فکر کرے جس کی طرف حجاز کے قافلہ سالار نے رہبری کی ہے۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ رسمِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

علامہ رشید ترابی کی دوسری تقریر

انسان فطرتاً تجسس اور تفحص کی طرف مائل ہے اور حقائقِ اشیاء کو معلوم کرنے کے لئے بے چین اور انسانیت کا مخصوص ترین کمال یہ ہے کہ وہ معقولیت کے ساتھ اتصال چاہے اگرچہ انسان زمان و مکان کے حدود میں دوسرے اجسام کی طرح اپنی بقا کے لئے اور بہت سی چیزوں

کا محتاج ہے۔ لیکن آدمی جس کمال کے لئے مخصوص ہے اس کے حصول کے لئے یہ لازمی ہے کہ ہر فرصت کے موقع پر مادّی احتیاجات سے بے تعلق ہو کر حقائق و معارف سے نزدیک تر ہونے کی کوشش کرے۔ اور جب تک راہ فکر مسدود نہ کر دی جائے وہ مسلسل جدوجہد سے اس منزلِ بلند تک پہنچنے کو اپنا مقصد حیات بنا لے۔

انسان کا حقیقی نقصان یہی ہے کہ وہ اپنے نصب العین سے ہٹ جائے تمام موجودات میں یہ فطری قانون نافذ ہے کہ ان میں سے جو بھی اپنے مقصد کی تکمیل سے قاصر رہا قدرت نے اس کے وجود ہی کو ختم کر دیا۔ تقاضائے انسانیت یہ ہے کہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی ہر آن بہتر سے بہتر ہوتی جائے۔

انسان کے اعمال میں منشائے فطرت کیا ہو؟ اور ایک ایسے اعلیٰ ترین مقصد کو کس طرح حاصل کیا جائے جو دلیل راہ بن جاتے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب فلسفۂ اخلاق ہی سے ممکن ہے۔ اور وہ علم جو ایسے اصول معین کر دے جس سے انسانی کردار کی قدریں نمایاں ہو جائیں، علم اخلاق ہے۔

دنیا میں سب سے پہلے اخلاق کا تذکرہ مذہب نے کیا اور مذہب نے اس کے اصولوں پر کچھ روشنی ڈالی لیکن ختمی مرتبت نے مکارم اخلاق کے اتمام کو اپنی بعثت کا واحد سبب قرار دیا اور اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

اس لئے اسلام عین اخلاق ہے اور ہر بداخلاقی کو دور کرنا مردِ مسلم کا فرض ہے۔ اور از روئے غفلت اسلام نہیں سنہ ۶۰ھ میں اسلام کا نام لے کر ملوکیت نے ساری بداخلاقیوں کو جمع کر لیا تھا۔ اور پھر بادشاہ وقت اپنے خلیفہ رسول ہونے کا اعلان کر کے ان بداخلاقیوں کو اپنے حلقۂ اقتدار میں جاری و ساری کر دینے کا انتظام کر دیا تھا۔ پیغمبر اسلام کے نواسے نے ان خرابیوں کو دور کرنے کے لئے ایک منظم طاقت سے جہاد کیا اور چونکہ اکمال فضائلِ نفس بغیر جہاد ناممکن ہے۔ اس لئے یہ فریضہ قرار پایا مسلم کا مقصدِ حیات یہی ہوتا ہے کہ نوعِ انسان کو اس کے

حقیقی نقصان سے بچا لیا جائے اور اخلاق اسی سے متعلق ہونے والا جب یہ دیکھتا ہے کہ انسان اپنے اعلیٰ نصب العین سے ہٹ رہا ہے تو پھر وہ دنیا کی کسی طاقت سے نہیں ڈرتا اور اپنا سب کچھ قربان کرکے یہ ثابت کر دیتا ہے کہ آدم کے باطن میں ایک اور بھی طاقت پنہاں ہے جس سے ملائکہ بھی آگاہ نہ تھے اور یہی خطاب الٰہی تھا

علامہ رشید ترابی کی تیسری تقریر

انسان کے ارادی اعمال علمِ اخلاق کا موضوع ہیں۔ اور اس علم کا مقصد یہ ہے کہ انسان خیر و شر میں تمیز کرے اور تا شر و ہدایت سے بہرہ اندوز ہو تاکہ انسان حیات کی ایک اعلیٰ مثال قائم کرے لیکن اس اعلیٰ مثال کا صرف علم کافی نہیں جب تک کہ اس کی بقا اور حفاظت کے لئے ریاضت اور محنت نہ ہو مسلسل محنت سے انسان ان اعمال کے صدور پر بآسانی قابو پالیتا ہے۔ جن کو ہم اچھے اعمال سے عبارت کرتے ہیں ان میں یکساں صورت ان اعمال سے عبارت ہے جو کسی خاص زمانہ یا خاص قوم کے لئے نیکی کے تصور کو پیش کریں۔ لیکن معیاری اخلاق کا کسی رسم و رواج، قوم و نسل و ملک سے تعلق نہیں رہتا ہے۔ وہ ہر دور اور ہر نسل کے لئے یکساں ہے۔ معیاری اخلاق کے قوانین سب پر محیط ہیں اور انہی کی تعلیم پیغمبر اسلام نے دی۔

فضائل اخلاق کا اکتساب اچھی عادتوں کی تخلیق کے بغیر ناممکن ہے۔ اور بُری عادتوں کا ازالہ عزم و قوت و فکر صحیح کے بغیر ممکن ہی نہیں، دراصل عادتوں کے ایک متحرک مجموعہ کا نام انسان ہے۔ جب تک عادت میں مناسب تغیر نہ ہو سرچشمۂ اخلاق سے نزدیکی دشوار و دشوار تر ہے۔

احکامِ اسلام اور اس کی بار بار تعمیل صرف اچھی عادت کی تشکیل کے لئے

ہے اگر مسلمانوں کو احکام کی تعمیل گراں گزرے اور وہ ہر روز کی عبادتوں سے گھبرا جائیں تو نیکی کا تصور تو ہوگا، لیکن نیک عادتیں پیدا نہیں ہوں گی۔ خود پیغمبر اسلام نے عمل کر کے دکھا دیا کہ صدورِ عمل میں کس قدر سہولت ہے۔ بشرطیکہ انسان نیکی کو عادت بنالے۔

مسلم حکومتیں اگر احکام اسلامی کی تعمیل نہ کروا سکیں اور اگر ان کا اقتدار ملت میں اسلامی فکر و عمل کی صحیح روح نہ پھونک سکے تو وہ حکومت اسلامی نہیں ہیں۔ احکامِ اسلام کی پابندی اور اس کے اوامر و نواہی کی تعمیل جس طرح عوام پر لازم ہے اسی طرح حکومت پر بھی لازم ہے تاکہ اچھی عادتوں کی تخلیق سے حکومتیں فضائل اخلاق سے آراستہ ہوں۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو نام نہاد مسلم حکومتیں بداخلاقی کا مرکز بن جاتی ہیں جس کے ازالے کے لئے ایک سخت جد و جہد کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں تلاوت کی جائیں، سورۃ قلم کی ابتدائی آیتیں جو خطاب اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ جن میں مجسمِ خلق کو یہ ہدایت ہوئی ہے کہ جھوٹوں، عیب جوئی کرنیوالوں اور غمازوں کی اطاعت نہ کرو۔ ان کا حکم نہ مانو جو جھوٹی قسم کھاتے ہیں۔ جو بے اصل و نسب ہیں اگرچہ یہ صاحب مال ہیں، آیاتِ الٰہی کو اساطیرِ اوّلین سمجھتے ہیں اور نیکی کے ہر کام سے روکتے ہیں یعنی اگر کوئی فاسق اور کاذب کی اطاعت سے انکار کر دے تو وہ اخلاق کا کمال ہے دین کو کھلونا سمجھنے والوں کے احکام کی تعمیل نہ کرنا ہی عین اخلاق ہے خواہ اس میں کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔

علامہ رشید ترابی (چوتھی تقریر)

بھی عادتوں کی تخلیق انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے لازمی ہے۔ عادتوں پر وراثت اور ماحول کا اثر ہے۔ خصوصیات کا فروغ کی طرف منتقل ہونا وراثت ہے اور ایک ذی روح جسم کا ہر محیط ماحول ہے، نسلی اور قومی خصوصیات کا عادتوں پر اثر پڑتا ہے اور طبعی اور اجتماعی ماحول سے عادتیں متاثر ہوتی ہیں۔ لیکن ارادہ میں اگر طاقت ہو اور شعور رجحان وقوت فیصلہ اپنا صحیح فرض ادا کریں تو توریث اور ماحول کے برے اثرات سے بھی انسان کو نجات دلائی جا سکتی ہے لیکن نوع انسانی میں اصلاح بانسان کی بربتہ عادتوں میں تبدیلی اسی وقت ممکن ہے جب کوئی مصلح حُبِ ذات کو حُبِ قوم کے لئے ختم کر دے۔ اور اپنے ذاتی مفادات کو اجتماعی مفادات پر قربان کر دے۔

فطری وطبعی ملکیت جس کو حق کہتے ہیں ہر انسان کے لئے ہے جیسے زندگی کا حق، شہری آزادی، سیاسی آزادی وغیرہ یہ حقوق جائز ہیں اس وقت تک جب تک کوئی اپنے حق کے لئے دوسرے کا حق نہ چھینے اور اپنے ہوا وہوس کے لئے دوسروں کو ان کے حقوق سے محروم نہ کرے۔

لیکن جب کسی قوم کا اجتماعی حق متاثر ہو رہا ہے اور نوع انسان کی اصلاح دنیا کے لئے اگر یہ ضروری ہو جائے کہ انفرادی زندگی کا حق اجتماعی زندگی کے لئے ختم کر دیا جائے تو یہ خودکشی اور ہلاکت نہیں بلکہ جہاد و شہادت ہے۔ یعنی عقل علی کے حصول کے لئے اخلاق کا کمال جہاد ہے، جس کو خلق عظیم وخلق مجسم باوجود رحمت العالمین ہونے کے واجب قرار دیا ہے۔ اس فرض سے منہ موڑنے والوں کو بداخلاق سمجھا گیا ہے۔

اور دشمنانِ دینِ دامن سے لڑتے رہو۔ یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین صرف اللہ کا ہے۔

علامہ رشید ترابی کی پانچویں تقریر

قانونِ طبعی انسان پر بہر صورت مسلط ہے۔ شمس و قمر کی حرکتیں، زمین کی گردشیں، موسموں کا تغیر و تبدل غرض آگ کی حرارت، برف کی برودت یہ سب کے سب اپنی خاص خصوصیتوں کے حامل ہیں۔ ان قوانینِ طبعی کا علم اور اس سے استفادہ کی کوشش میں انسان اپنی زندگی کو زیادہ کامیاب بنا سکتا ہے اور اگر ان قوانین سے موافقت نہ ہو تو انسان اِن کی زد میں آتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے۔ قوانینِ طبعی متغیر ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ہر قانون کی تفصیل ایک علم خاص سے متعلق ہے۔ اس لئے مختلف علوم کی بنیادیں رکھی گئیں، تاکہ کائنات کا علم حاصل ہو سکے اس طرح انسان کے متعلق جتنے علوم ہیں ان میں جو علم سعادت و شقاوت، خیر و شر سچائی و کذب، عدل و ظلم اور ایسی طرح کے امور پر روشنی ڈالے اور انسان کی رہبری کرے وہ علمِ اخلاق ہے۔

قانونِ اخلاق بالکل قانونِ طبعی ہے جو کسی حال میں تغیر پسند نہیں لیکن قوانین وضعیہ احکام کا وہ مجموعہ جس کو حکومت وضع کرتی ہے۔ جن احکام کی فرمانبرداری کا کوئی انعام نہیں لیکن عدول کی سزا لازمی ہے۔ اور حکومت قانون وضعی کے نہ ماننے والوں کے لئے سزا کا انتظام کرتی ہے۔ اور قانون کے نفاذ کے لئے محکموں کا قیام عمل میں آتا ہے۔ قانون وضعی یعنی قانونِ حکومت بدلتا رہتا ہے۔ چونکہ قانون ساز خود انسان ہوتے ہیں، وہ جس وقت چاہیں اپنی مرضی سے قانون بنا لیں یا بدل دیں، لیکن

قانونِ اخلاق میں کوئی تبدیلی ناممکن ہے۔ قانونِ وضعی سے کسی قوم کو نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ لیکن قانون اخلاق صرف انسان کی بہبودی کے لئے ہے۔ قانون وضعی کا حکم اعمال اور ان کے نتائج پر لگایا جاتا ہے۔ لیکن قانون اخلاق اعمال اور اعمال کے اسباب پر نظر رکھتا ہے۔ جیسے قتل کرنا قانون وضعی کے نزدیک جرم ہے۔ لیکن قانون اخلاق میں حسد بھی جرم ہے جس کی وجہ سے قتل کا اقدام ہوا۔

قانون وضعی کا اثر و رسوخ خارجی طاقتوں سے ہے۔ یعنی حکومت کا اثر اس کو نافذ کرتا ہے۔ لیکن قانون اخلاق کو قوتِ نفس جاری کرتی ہے۔

ان اختلافات کو سمجھنے کے بعد اگر کسی ملک کا قانون وضعی نوعِ انسان کے لئے مضر نتائج پیدا کر رہا ہو تو قانونِ اخلاق حکومت کے قانون سے ٹکرا جاتا ہے اور یہی جدوجہد جہاد کی صورت اختیار کر لیتی ہے تا اینکہ اخلاق اپنی طاقت کو منوا لیتا ہے

علامہ رشید ترابی کی چھٹی تقریر

انسان جب اپنی زندگی کے متعلق مستقبل کا کوئی پروگرام بنا لیتا ہے تو یہ صحیح اور مکمل نقشہ حیات اس کا نصب العین ہے دوسرے حیوانات زندگی کا کوئی نقشہ نہیں رکھتے اس لئے ان میں کوئی ترقی نہیں ہوتی۔ وہ انسان جو اپنا ایک نقشہ زندگی رکھتا ہے اور اسی نقشہ کے مطابق حیات کی عمارت بناتا ہے وہی کامیاب و کامران ہوتا ہے۔ چونکہ استعداد و صلاحیت کی بنا پر انسانوں میں اختلاف ہے اس لئے ان کا نصب العین بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے، اس لئے نصب العین کی دو قسمیں ہوئیں یعنی ایک وہ جس کو ہر انسان اپنے لئے منزلِ مقصد بنائے، دوسرے وہ جو حقیقت میں تمام انسانی حیات کا واحد مقصد ہو۔

انسان مختلف طاقتوں اور خواہشوں میں گھرا ہوا ہے۔ ہر خواہش اس کو

اپنی طرف کھینچتی ہے اگر وہ اپنے لئے مثل اعلیٰ نہ متعین کرے تو یہی قوتیں اس میں انتشار پیدا کر دیں گی۔ ہر انسان اپنے لئے ایک منزل و مقصد رکھتا ہے۔ کسی کا مثل اعلیٰ احتکار و جمع مال ہے اور کسی کی غایت حیات صرف علم و فکر کسی کیلئے مقصد حیات عہدہ اور کرسیاں ہیں اور کسی کا مثل اعلیٰ رہبانیت کی زندگی اور ان تمام صورتوں کی تخلیق گھر مدرسہ اور مذہب کے ماحول میں ہوتی ہے۔ جہاں اہم موثرات و عوامل مثل اعلیٰ کی تخلیق کرتے ہیں، اس تو ریث ماحول میں مقاصد حیات اور غایات زندگی مختلف ہو جاتے ہیں، رحمت مطلقہ نے اس انتشار سے بچانے کے لئے غایت اور انعایات اور ایک کامل مثل اعلیٰ کو انسانیت کی ہدایت کے لئے قرار دیا تاکہ انسانیت اختلافات منزل کی صعوبتوں سے بچ جائے، یہی ہدایت نبوت ہے۔ جس کو مذہب حقیقی مثل اعلیٰ کہتا ہے۔ سورۂ نحل میں ارشاد ہوتا ہے۔

لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ وَلِلَّهِ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔

جن کے دل و دماغ میں عاقبت و آخرت نہیں وہ مثل سوء ہیں لیکن خدا والوں کے لئے مثل اعلیٰ ہیں۔ اور خدا غالب و حکیم ہے۔ کار رسالت یہی ہے کہ انسان ان مختلف مقاصد حیات سے بچائے جو بالآخر انسان کی ہلاکت کا باعث ہوتے ہیں اور ان کے لئے خود مصلح اور ہادی کی زندگی نمونہ بن جائے یہی فرض ہدایت کی انجام دہی ہے نوع انسانی کا مصلح ان طاقتوں کو ٹھکرا دیتا ہے جو انسان کا مثل اعلیٰ دین بیزاری، خدا دشمنی اور نفس پرستی کے بناتے ہیں۔ اسی طرح سے وہ جہاد شروع ہوتا ہے جس کا سلسلہ بدو آدم و عالم سے اور معلوم نہیں کب تک رہے گا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

علامہ رشید ترابی کی ساتویں اور آٹھویں تقریر

استکمال فضائل نفس اخلاق کے کمال سے عبارت ہے اور نفس کے لئے فضائل کا اکتساب بغیر معرفتِ نفس ناممکن ہے۔ مدارج انسانیت میں اختلاف ہے، لاکھوں انسان باوجود ترقی و تمدن کے ابھی تک جمادی ہیں۔ وہ موجود ہیں اور جامد ہیں، کچھ صرف نامی نباتی ہیں، غذا کو جذب کر لیتے ہیں، کچھ انسان ابھی ایسے ہیں جو ابھی تک حیوان ہیں اور بہت کم ایسے ہوں گے جو حقیقی اور معنوی طور پر انسان سمجھے جائیں۔ کمیل ابن زیاد نخعی نے حضرت علیؑ سے سوال کیا کہ نفس کی تعریف کی جائے۔ ارشاد فرمایا کہ نفسِ انسانی کے چار مدارج ہیں اور ان میں ہر ایک کی پانچ حالتیں اور دو خصوصیتیں ہیں، نامیہ، نباتیہ حقیہ حیوانیہ، ناطقہ، قدسیہ، کلیہ الٰہیہ۔

نامیہ نباتیہ کی پانچ حالتیں ہیں، جاذبہ، ماسکہ، ہاضمہ، دافعہ، مربیہ، دو خصوصیتیں ہیں۔ زیادتی و نقصان حیہ حیوانیہ کی پانچ حالتیں ہیں۔ سامعہ، باصرہ، ذائقہ، شامہ لامسہ دو خصوصیتیں ہیں، غضب و شہوت ناطقہ قدسیہ کی پانچ حالتیں ہیں، علم، فکر حلم، ذکر، نباہت دو خصوصیتیں ہیں، حرّیت اور حکمت، کلیہ الٰہیہ کی پانچ حالتیں ہیں بقار و رضا، صبر در بلا، عزدر ذل، نعیم و رشقار، فقر و رغنا اور دو خصوصیتیں ہیں تسلیم اور رضا۔

ان اختلافات مدارج میں یہ ممکن ہی نہیں کہ نامیہ نباتیہ یا حیتہ حیوانیہ ادراک کر سکے کلیہ الٰہیہ کا یعنی وہ درجہ نفس جس پر اولیا، شہدا، صدیقین اور انبیار فائز ہیں، نفس کلیۂ الٰہیہ کی یہ بزرگی ان انسانوں کی قسم سے بھی بالاتر ہے، جو صرف نامی یا حیوانی ہیں۔ دعوت اسلام کا مقصد وہ ترقی ہے جس کو پیغمبر اسلام انسانوں میں دیکھنا چاہتے تھے۔ یعنی ہر نفس اپنے کمال فضائل پر پہنچے اور کم از کم انسان ناطقہ

قدسیہ کی منزل پر فائز ہوجاتے ہیں۔ عالمِ کون وفساد میں انبیاء کا قتل، اولیاء کی شہادتیں، دوستانِ خدا کی حیرانی و بربادی انہی ہاتھوں سے ہوئی جو بظاہر تو انسان تھے لیکن سبعی و بہیمی تھے۔

اسلام جس کا ہر حکم عین اخلاق ہے۔ انسان کو سبعیت و بہیمیت سے بلند کرتا ہے۔ اور انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں فکر کی وہ ہم آہنگی پیدا کرتا ہے جس سے نوعِ انسانی کی اصلاح ہو۔ فرد کی گھریلو زندگی ہو یا اجتماعی زندگی میں اخلاق کا اثر و نفوذ نہ ہو تو پھر وہی حیوانیت و بربریت ظاہر ہوگی، جس کا نتیجہ صرف انسانی بربادی ہے، مادی انسان صرف دولت کو مثلِ اعلیٰ سمجھتے ہوئے جسم کے آرام کا قائل ہو چکا ہے۔ حالانکہ انسان صرف جسم نہیں، جسم و روح کی ترکیب ہے جسم کی چھ حالتیں ہیں۔ حیات و موت، صحت و مرض، خواب و بیداری، لیکن روح کے لئے حیات علم ہے اور موت جہل اس کے لئے صحت یقین ہے اور مرض شک اس کے لئے خواب غفلت ہے اور بیداری حفاظت، کتنے ایسے بندگانِ خدا ہیں جو روح کی حیات و صحت و بیداری کی فکر نہ کرتے ہوں گے، یعنی علم و یقین و حفاظت کے طالب اور ساعی ہوں گے، نوعِ انسانی بظاہر تو ایک معلوم ہوتی ہے، لیکن ابوجہل اور محمدؐ میں جو فرق ہے ظاہر ہے اور یہی وہ فرق ہے کہ جس کو نامی و حیوانی انسان حسد کی وجہ سے برداشت نہیں کرتا ہے اور کلیہ الٰہیہ فکر اصلاح میں انانیت سے انسانوں کے اثر و اقتدار کو ٹھکرا دیتا ہو۔ ظاہر ہے کہ نفسِ کلیہ الٰہیہ کسی صورت میں نامیہ ہے نباتیہ، اور حسیّہ حیوانیہ کی بیعت نہیں کرسکتا یہی وجہ تھی کہ فرزندِ رسول الثقلین نے حاکمِ شام کی بیعت نہیں کی اور اپنی شہادت سے اپنے کمال اخلاق کا ثبوت دیا۔

علامہ رشید ترابی کی نویں تقریر

سعادتِ شخصی اور سعادتِ اجتماعی کے لئے اکتساب فضائل نفس لازم ہے اور کیفیات نفس میں اعتدال اگر پیدا ہو جائے اور افراط و تفریط سے انسان کو بچا لیا جائے تو حکمت، عفت، شجاعت و عدالت جیسے اعلیٰ ترین منازل اخلاق پر انسان گامزن ہوتا ہے، سارے صفات و فضائل کی بنیاد انہی چار صفتوں پر ہے۔

لیکن فلسفہ اخلاق کا یہ دعویٰ کہ تکرار کے ساتھ جب عمل نہ ہو اچھی عادتیں نہیں پیدا ہوتی ہیں۔ مطالبہ کرتا ہے کہ کوئی قانون ایسا ہو جو انسان کو نیک اعمال کی تکرار پر مجبور کرے۔ اسلام عین اخلاق ہے اسلام کی اوامر و نواہی روحِ اخلاق ہیں۔ اور احکامِ دین کا تقاضہ یہ ہے کہ کسی صورت مسلسل احکام کی پابندی کرتے ہوئے اخلاق کے مدارج بلند پر فائز ہو، پیغمبرِ اسلام وہ کامل معلم اخلاق ہے جس نے سب سے پہلے توحید دے کر نوعِ انسان کو بد اخلاقی سے بچا لیا۔ اخلاقی قوت کا کمال یہی ہے کہ انسان کو ایک ہی خوف ہو۔ وہ ہر ایک سے خائف نہ ہو وہ ایک ہی کو چاہے اور ہر ایک کی محبت اس کو کہیں محبت الٰہی سے باز نہ رکھے یہ وہ معیار ہے جس کو پیغمبرِ اسلام نے قائم کیا تھا۔ لیکن جب ظاہر بہ ظاہر کوئی اسلامی حکومت اگر اس پورے شیرازۂ دین کو بکھیر دینے کی کوشش کرے اور وہ حاکمِ وقت ہونے کی وجہ سے با اثر بھی ہو تو اوامر و نواہی اسلام میں ہر قسم کی تبدیلی کا نہ صرف امکان ہوتا ہے بلکہ خود پسند جابر اور مستبد حاکم اپنے قیاس و رائے کو دخل دے کر حلت کو حرمت اور حرمت کو حلت سے بدل دیتا ہے ایسے وقت پر معلم اخلاق کا یہ فریضہ ہو جاتا ہے کہ صرف سعادتِ شخصی کا خیال نہ کرے بلکہ سعادتِ اجتماعی کا خیال کرتے ہوئے ایسے حاکم کے اثر و نفوذ کو روکے اور ممکنہ جد و جہد فرمائے، یہی وہ منزل ہے جہاں خود اخلاق

جہاد کا حکم دیتا ہے اور حسن خلق اور جہاد کے یہیں ایک ہی معنی ہو جاتے ہیں جنگ کے میدان میں صدق و کذب وفا و عہد اور غداری اور شرافت اور کم ظرفی حکمت اور جہل عفت اور جرم عدل اور ظلم آپس میں ٹکرا جاتے ہیں۔ اور بالآخر فتح اسی کو ہوتی ہے جو عقلانی طاقتوں کا حامل اور نفسی فضائل کی دولتوں سے مالا مال ہوتا ہے تاریخ اسلام میں کربلا وہ منزل ہے جہاں ملّتِ مسلم کی صلاح و فلاح کے لئے فرزندِ رسولؐ الثقلین نے قوتوں کو مجتمع کر کے یزیدی طاقتوں کو برائی سے روکنے کی کوشش فرمائی اور حسن خلق کا راستہ دکھایا، جد کے دین کو بچا لیا بیعت اخلاقی کمزوری تھی اس کمزوری کو ٹھکرا کر آپ نے دین کی پناہی کے لئے اپنا سر دیدیا۔ اور اسلام کو سربلند فرما دیا اور وہ درس توحید جو روح اخلاق بنا کر بطحا کی سرزمین اور مکّہ کی وادیوں سے دیا گیا تھا۔ اس کو پھر ایک مرتبہ اپنے درد کے ذریعہ آنے والی نسلوں کے لئے قابلِ انتقال بنا دیا۔

شاہ ہست حسینؑ بادشاہ است حسینؑ
دین ہست حسینؑ دین پناہ است حسینؑ
سر داد نداد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

سپاسنامہ جنابِ امیرؑ

حضرت علامہ رشید ترابیؒ اپنی تقاریر میں اکثر علامہ اقبال کے یہ اشعار پڑھا کرتے تھے جو اقبال نے مولائے کائنات حضرت علیؑ کی شان میں لکھے ہیں۔

اے محوِ ثنائے تو زبانہا / اے یوسفِ کاروانِ جانہا
اے بابِ مدینۂ محبت / اے نوحِ سفینۂ محبت
اے ماحیِ نقشِ باطلِ من / اے فاتحِ خیبرِ دلِ من
اے سرِ خطِ وجوب و امکاں / تفسیرِ تو سورہ ہائے قرآں
اے مذہبِ عشق را نمازے / اے سینۂ تو امینِ رازے
اے سترِ نبوتِ محمد / اے وصفِ تو مدحتِ محمد
گردوں کہ بہ رفعت ایستادست / اے بامِ بلندِ تو فتادست
ہر ذرۂ درگہت چو منصور / در جوشِ ترانۂ انا الطور
بے تو نتواں باو رسیدن / بے او نتواں بتو رسیدن
فردوس ز تو چمن در آغوش / از شانِ تو حیرت آئنہ پوش
جانم بغلامیِ تو خوشتر / سر بر زدہ ام ز جیبِ قنبر
ہشیارم و مستِ بادۂ تو / چوں سایہ بپا فتادۂ تو
از ہوش شدم مگر بہوشم / گوئی کہ نصیریم خموشم
دانم کہ ادب بضبطِ راز است / در پردۂ خامشی نیاز است
اما چہ کنم مئے تولّا / تند است بروں فتد ز مینا

زاندیشۂ عاقبت رہیدم
جنسِ غمِ آلِ تو خریدم

نگرم چو بہ جستجو قدم زد — در دیر شد و درِ حرم زد
در دشتِ طلب بسے دویدم — دامان چو گرد باد چیدم
در آبلہ خارہا خلیدہ — صد لالہ تہِ قدم دمیدہ
افتادہ گرہ بروئے کارم — شرمندۂ دامنِ غبارم
پویان پَے خضر سوئے منزل — بر دوشِ خیال بستہ محمل
جویائے مَے و شکستہ جامے — چون صبح بباد چیدہ دامے
پیچیدہ بخود چو موجِ دریا — آوارہ چو گرد بادِ صحرا
واماندہ ز دردِ نارسیدن — در آبلہ شکستہ دامن
عشقِ تو دلم ربود ناگاہ — از کار گرہ کشود ناگاہ
آگاہ ز ہستی و عدم ساخت — بت خانۂ عقل را حرم ساخت
چون برق بخرمنم گذر کرد — از لذتِ سوختن خبر کرد
بر باد متاعِ ہستیم داد — جامے ز مَے حقیقتم داد
سرمست شدم ز پا فتادم — چون عکس ز خود جدا فتادم
پیراہنِ ماومن دریدم — چون اشک ز چشمِ خود چکیدم
خاکم بفرازِ عرش بُردی — زان راز کہ با دلم سپردی
واصل بکنار کشتیم شد — طوفانِ جمالِ زشتیم شد
جز عشق حکایتے ندارم — پروائے ملامتے ندارم

از جلوۂ علم بے نیازم
سوزم، گریم، تپم، گدازم

ترابی صاحب کے معنامہ المنتظر سے منتخب اداریے

عالمِ اسلام اور اینگلوامریکن بلاک

مشرق کے دل پر جتنے داغ ہیں ان کی فہرست طویل ہے مغرب نے جتنے مظالم ایشیا اور مشرقی ممالک پر توڑے ہیں ان کا نو فیصدی حصہ مشرقِ وسطیٰ کے حق میں آیا۔ ممالک اسلامیہ پر آج ڈیڑھ سو برس سے اسلام دشمنی کا سہرا برطانوی شہنشاہیت کے سر رہا ہے لیکن اس عمل میں ممالکِ متحدہ امریکہ بالواسطہ فرانس اور ہالینڈ براہِ راست معین جرم رہے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ میں ان مغربی ممالک نے حصول منفعت اور لوٹ کھسوٹ کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جاری رکھا اس کو خوش قسمتی سمجھیئے یا بدنصیبی جہاں اسلامی ملک ہیں وہاں پر قدرتی تیل کے چشمے ہیں۔ اور یہی تیل کے چشمے تحریصوں کے علاوہ مشرقِ وسطیٰ کو غلام بنانے کا باعث بنے، خاص طور پر حجاز، عراق اور ایران میں مغربی سامراجیت نے اپنی سیاسی حکمتِ عملی اور استعدایت کے ہر پہلو کو انہی چشموں پر بلا شرکتِ غیرے قبضہ رکھنے کے لئے اختیار کیا۔ عراق میں بالکل برطانوی جاگیرداری ہے، یہی حال ایران کا بھی تھا لیکن عراق کے کچھ حصہ میں فرانس کا بھی ہاتھ ہے، حجاز کا تیل امریکہ کی علمداری میں ہے اس کے علاوہ ان ممالک کے خام اشیاء کو سستے داموں پر خریدنا اور ان کے معاوضہ میں اپنی مصنوعات کو گراں قیمت پر بیچنا بھی ان شہنشاہی دولتوں کی سیاسی حکمتِ عملی کا پس منظر رہا ہے۔

امریکہ، برطانیہ اور دوسری جمہوری شہنشاہیت رکھنے والی ملکتوں نے اپنی

سیاسی حکمتِ عملی میں دو اصولوں کو پیشِ نظر رکھا۔ ایک یہ کہ جہالت اور افلاس کی حالت میں رکھ کر ان ملکوں کو ہمیشہ اپنا دست نگر رکھا جائے۔ دوسرے چونکہ ممالک اسلامیہ ایک ایسے عقیدے کے لوگوں سے آباد ہیں جنہوں نے یورپ کے قلب تک کسی زمانے میں اپنا اثر پھیلا دیا تھا۔ اور جس کے خلاف مغربی ممالک نے صلیبی جنگیں لڑی تھیں۔ اس لئے اِن ممالک کو دوسرے غلام ممالک سے زیادہ دباؤ میں رکھا جاتا ہے۔

یورپ کی تاریخ کو ذرا پیچھے جا کر دیکھیں تو اس دوسری ذہنیت کو ہم واضح کر سکتے ہیں، پہلی جنگِ عظیم سے پہلے یورپ میں چار طاقتور دول تھیں، برطانیہ، فرانس، جرمنی اور روس، اور انیسویں صدی کے آخر تک ان کی نظروں میں ترکی شہنشاہیت خار کی طرح کھٹکتی رہی۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں زارِ روس نے عیسائی دول کے اتحاد کی کوشش کی جس کا مقصد ترکوں کو یورپ سے نکالنا اور ممالکِ اسلامیہ کو غلام بنانا تھا۔ لیکن چونکہ برطانیہ نے پہلے ہی سے ممالکِ اسلامیہ میں مصر، ایران وغیرہ پر اپنا اثر قائم کر لیا تھا اس لئے اس نے تجویز کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ اس کی جگہ برطانیہ نے ایک اور زبردست حکمت عملی اختیار کی جو حقیقت میں جمال الدین افغانی کی اتحادِ ممالک اسلامیہ کی تحریک کی نفی تھی اس تجویز کو کرنل لارنس کے ذریعہ انہوں نے بڑی کامیابی سے سر کیا۔ اور عربی عصبیت کو ہوا دے کر انہوں نے ہمیشہ کے لئے ترکوں اور عربوں میں ایک خلیج قائم کر دی نہ صرف یہ بلکہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد عراق، حجاز اور شرق اردن نے انہوں نے عربوں کو ایسی حکومتیں بخش دیں جو بالکلیہ ان کے زیرِ اقتدار ہوں یہی نہیں بلکہ بالفوری کی تجویز کو عمل میں لا کر انہوں نے یہودی مملکت محض اس لئے قائم کی کہ مشرقِ وسطیٰ کے قلب میں ہمیشہ جان بل کے قدم جمے رہیں۔

ممالک متحدہ امریکہ کی پہلی جنگِ عظیم تک غیر جانبدارانہ اصول کا پابند رہا، لیکن اس کے بعد اس نے برطانیہ کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی اور حجاز میں اپنی اجارہ داری قائم کرلی۔ دوسری جنگِ عظیم ختم ہوئی تو ان شہنشاہیوں نے محض روس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر اپنی قدیم حکمت عملی کو جدید سانچوں میں ڈھال لیا اور براہِ راست شہنشاہیت کے اصولوں سے دستبردار ہو کر اپنی ہمنوا اور فرمانبردار حکومتوں کے ذریعہ عباسی شہنشاہیت کی طرف قدم بڑھایا۔

اس دوسری حکمت عملی نے مشرقِ وسطیٰ کی حکومتوں کو ان عوام سے جدا کر دیا اور وہ طرزِ عمل جو اس سے پہلے بیرونی حکمرانوں نے اختیار کیا تھا اب خود اپنی حکومتوں نے اختیار کر لیا جس کا نتیجہ وہ خوفناک نتائج ہیں جن کو ہم آئے دن دیکھ رہے ہیں۔ لیکن ان شہنشاہیوں نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود اس کا اندازہ نہیں لگایا کہ عوام کی مایوسی اور بیداری کی وجہ سے ردِ عمل کا خمیازہ دنیا کو بھگتنا پڑے گا۔ ایران کے حالیہ حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ انیسویں صدی کی فرسودہ شہنشاہی سازشوں سے کسی قوم کے متحدہ عزم کو نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اور یہی تجربہ عصر کی حالت میں کیا جا رہا ہے۔ وہ وقت آگیا ہے کہ چرچل اور قدامت پسندوں کی بازی جنگ بازی بھی ان نہتوں کے عزم کو شکست نہیں دے سکے گی۔

مشرقِ وسطیٰ کی موجودہ حالت میں بہت سے ایسے عوامل موجود ہیں جن سے اگر ممالکِ متحدہ امریکہ اور برطانیہ سبق لینا چاہیں تو بہت ممکن ہے آئندہ آنے والی تباہیاں اور خونریزیوں سے دنیا محفوظ ہو جائے۔ برطانیہ کی حد تک تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان چیزوں کو دوسری شہنشاہیت پرست طاقتوں سے زیادہ سمجھتا رہا ہے اور اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں اپنی مردہ شہنشاہی اقتدار کو زندہ رکھنا تنہا اس سے ناممکن ہے لیکن برطانوی حکومت اور برطانوی کارخانہ دار

یہ سب جاننے کے باوجود محض اپنے جھوٹے وقار اور تباہ شدہ شہنشاہیت کو قائم رکھنے کیلئے آخری جد وجہد ضروری سمجھتے ہیں۔ معاشی اور نفسیاتی طور پر برطانیہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ روس سے ڈرکر وہ امریکہ اور دوسری جمہوری مملکتوں کو آسانی سے اپنے ناپاک ارادوں میں حلیف پیدا کرسکتا ہے۔ چنانچہ یہی چیز تھی جس کو مسٹر چرچل اپنی انتخابی مہم میں بار بار پیش کیا کرتا تھا۔ ایک طرف تو اس کی یہ آواز کہ اس دنیا میں وہ اشتراکی بلاک کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر امن زندگی بسر کرسکتا ہے۔ دوسری طرف یہ کہنا کہ مزدور حکومت ایران میں اپنی شہنشاہی طاقت کو برقرار رکھنے میں ناکام رہی صاف طور پر اس امر کا پتہ دیتا ہے کہ وہ پہلا خیال محض امریکہ کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے ظاہر کر رہا ہے اور دوسرے ایران سے اپنے رائے دہندوں کے قومی وقار سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ چنانچہ مسٹر چرچل نے برسر اقتدار آتے ہی ایک طرف ٹرومن سے ملنے کی کوشش کی تو دوسری طرف اسٹالن سے بھی ملاقات کی جد وجہد جاری رکھی۔ ادھر مصر میں اپنی فوجیں بڑھالیں اور اس کی تائید میں امریکہ کی شدت پسند مدبروں کو اپنا ساتھی بنا لیا۔ ممالک متحدہ امریکہ نے روس کے اطراف اپنے حربی خط کو مضبوط کرنے کے شوق میں ایک طرف تو اٹلانٹک پیک کے اندر ترکی کو شامل کرلیا تو دوسری طرف منطقہ سوئز کو مرکز بنا کر مشرق وسطیٰ میں اپنی فوجی اجارہ داری کی ایسی اسکیم پیش کی جس کے معنی سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اب جمہوری دول روس کو بہانہ بنا کر پورے مشرق وسطیٰ کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتے ہیں۔ یہ امر خاص طور پر قابل غور ہے کہ جس تجویز کو مصر نے رد کر دیا، اس پر یمن، حجاز، عراق اور دوسری عربی مملکتیں پیرس میں غور کر رہی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم اسکو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ اب سامراجیت کا جو جادو عوام کی بیداری کی وجہ سے ایران اور مصر میں ناکام ہے وہی دوسرے ممالک میں کامیاب

ہو سکتا ہے کہ وہاں کے عوام اس قدر بیدار نہیں ہیں کہ وہ اپنی حکومتوں کو اپنی مرضی کا پابند بنا سکیں۔

اس تجربہ سے یہ امر واضح ہو جائے گا کہ اگر ممالک امریکہ کوششوں کے باوجود مشرقِ وسطیٰ کی بیداریٔ عوام کی وجہ سے کم از کم دو بڑے ملکوں میں پوری سامراجی قوت نے منہ کی کھائی ہے تو کیا مستقبل قریب میں ممالکِ اسلامیہ کے عوام انہی کے نقشِ قدم پر چل کر آزادی حاصل نہیں کر سکتے؟ اور کیا ایسی صورت میں جب کہ ان کی جائز تمناؤں کو برطانوی فوجیں یا دوسری سامراجی قوت تباہ کرنے کی جدوجہد میں مبتلا نہیں۔ اور ایک خوں ریز امتحان کے بعد ان ممالک کو اپنے عزائم میں کامیابی ہو تو ایسی صورت میں یہ طے ہے کہ جمہوری دول ان آزاد مملکتوں کو کم از کم اپنے دوستوں کی فہرست میں نہیں دیکھ سکتے، اس کے علاوہ یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ اب جب کہ بقول جنرل آئزن ہاور جمہوری دول کی ہر سانس، ہر عمل کو روس کے بڑھتے ہوئے خطرے کو روکنے کے لئے صرف کرنا چاہیے کہ اس توانائی کو مملکتِ اسلامیہ غلام بنانے کی سعی میں صرف کریں۔ تو کیا دنیا کی موجودہ حالت میں جمہوریت کے مستقبل کو بدل سکتی ہے! امریکہ کے لئے ایک کوریا کا تجربہ کافی ہے۔ اگر برطانیہ کی دوستی کو امریکہ عشق کے درجہ تک پہنچا دے اور معاملہ فہمی سے بالکل بے نیاز ہو جائے اس کے عواقب امریکن عزائم کے خلاف بہت دور رس نتائج کے حامل ہوں گے معلوم کب تک انکل سام برطانیہ کی مردہ لاش کے ساتھ مشرقِ وسطیٰ سے رقص کرتا رہے گا۔

۲

جمال الدین افغانی نے آج سے تقریباً ایک سو برس پہلے عالم اسلامی کے جس اتحاد کا خواب دیکھا تھا اور جن کی بیدار زندگی اس خواب کو حقیقت بنانے میں صرف رہی۔ اس تخیل کو علامہ اقبال نے اپنے افکار سے عام کیا۔ زمانے نے اس دور میں بہت سے رنگ بدلے اسلامی ممالک کا تنزل انتہا کو پہنچ چکا تھا اور ان کے تنزل اور بے نوائی نے حالتِ انتشار سے ایک نظم وضبط کا رخ کیا اور آسمانِ سیاست پہ نئے اسلامی ستارے جلوہ گر ہونے لگے۔ پاکستان ابھرا اور انڈونیشیا منظرِ شہود پر آیا۔ اور ممالک اسلامیہ کا ہر خطہ آزادی اور خود مختاری کی جد و جہد میں مسابقت کرنے لگا۔ ایران نے ڈیڑھ صدی بعد بیرونی اقتدار کی آخری لعنتوں کو آبادا سے نکال باہر کیا۔ مصر نے مغربی استعمار کے خلاف موت و زیست کی جد و جہد شروع کر دی۔ مراکش، تیونس اور الجیریا میں کشمکش آزادی از سر نو شروع ہو گئی۔ ممالک عربیہ نے ایک لیگ قائم کر کے فلسطین کے یہودی فتنہ کو ختم کرنے کی سعی کی۔ اس وقت تمام عالم اسلامی بیداری اور آزادی کی ایک طاقتور لہر موجود ہے یہ جذبۂ آزادی اس قدر شدید ہے کہ ممالک متحدہ امریکہ اور برطانیہ میں اس سے تشویش اور بے چینی پیدا ہو گئی ہے۔ عالم اسلام کی موجودہ مشکلات کی وجوہات کو جاننے کے بعد ہی ہم اس علاج کو تجویز کر سکتے ہیں۔ جس سے وہ موجودہ دنیا میں اپنا مقام ایک خود دار ملت کی طرح حاصل کر سکتا ہے۔ اس کا پہلا عیب تخیل ہے جس سے مغرب نے اس کی شیرازہ بندی کی نفی کی ہے۔ یہ تخیل عرف عام میں قومیت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ فرد اپنی اجتماعی زندگی کے احساس کو رنگ، نسل، زبان اور جغرافیائی حدود سے وابستہ کر کے انسانیت کو

انتشار میں اس طرح تقسیم کر کے جو ایک دوسرے سے مسابقت اور رقابت کی کشمکش میں مبتلا ہو جائیں۔ مغرب کی ابتدائی ترقی انہی بنیادوں پر تھی اور اسی فساد آدمیت نے مغربی تہذیب کو دو مرتبہ عالمی قتل گاہ میں پہنچایا اور اب تیسری بار کا اندیشہ لاحق ہے۔ قومیت کا تخیل اسلامی ممالک کو سامراجیت کے لعنتوں میں سے ایک ورثہ کے طور پر حاصل ہو رہے ہیں۔ جس کو ساحر مغرب نے اپنے اغراض کے لیے اور بھی نمایاں کیا چنانچہ اس وقت جو جذبہ ممالک اسلامیہ میں سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ قومیت ہی کا ہے ترکوں نے اس میں اتنا غلو کیا کہ آج ترکوں کا نام بھی بدل گیا کہ جس کو سننے کے بعد اکثر موقعوں پر یہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ کہ یہ کسی مسلمان کا نام ہے۔ یہی مصر بلاد عربیہ ایران، افغانستان اور انڈونیشیا کا ہے سب سے بڑا غضب یہ ہوا کہ یہودیت اور اسرائیل مملکت (جو تمام عالم اسلامی کے لیے ایک مشترک خطرہ ہے) کی مخالفت میں جو جماعت قائم ہوئی اس کا نام بھی عرب لیگ رکھا گیا۔ گویہ فریضہ تمام مسلمانوں سے ہٹ کر صرف عربی بولنے والے مسلمانوں کا ہو گیا ہے عرب لیگ کی وجہ سے خود بخود عجم لیگ کا تصور قائم ہوا۔ جو وجود میں تو نہیں آئی لیکن عملاً اس اہم مسئلہ میں سوائے عرب ممالک کے باقی تمام اسلامی ممالک کے بلاواسطہ شریک ہونے سے رک گئے۔

دوسری بڑی اہم رکاوٹ اتحاد اسلامی میں خود ان مسلم ممالک کی ہیئت ترکیبی ہے، ممالک اسلامیہ میں دو ممالک جمہوری اصولوں پر ہیں۔ پاکستان اور انڈونیشیا لبنان اور شام، ایران، مصر، شرق اردن اور عراق محدود بادشاہت رکھتے ہیں۔ افغانستان اور حجاز میں مطلق العنان بادشاہت ہے۔ بلاد مغرب تونس، الجیریا الیبس اور مراکش آج تک مغربی استعمار کے تحت محکوم ہیں۔ ان کی وجہ سے بیرونی طاقتوں کو اتحاد عالم اسلامی روکنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

سب سے بڑا مرض عالمِ اسلامی کے لئے برطانیہ کی مردہ شہنشاہیت کا تسلط ہے جس کو بالواسطہ ممالک متحدہ امریکہ کی تائید اور طاقت حاصل ہے۔ عالمِ اسلامی کے اتحاد پر غور کرتے وقت یہ تینوں رجحانات کو پیش نظر رکھے بغیر کوئی صحیح راہِ عمل نہیں پیدا کی جاسکتی۔ یہ امر تو بالکل واضح ہے کہ عالمِ اسلامی کے عوام مغربی تسلط سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے بے چین ہیں اور یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ وہ اپنی آزادی کو نہ صرف جمہوری شہنشاہیت سے حاصل کرنا چاہتے ہیں بلکہ اس حاصل شدہ متاعِ عزیز کو اشتراکی لادینی طاقت سے بھی محفوظ رکھنے کیلئے بیتاب ہیں۔

اتحادِ عالمِ اسلامی کے اب تک جو نظریئے پیش ہوئے اس میں بعض حقائق سے چشم پوشی کی وجہ سے کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ سب سے مشہور اور ناکام کوشش چودھری خلیق الزماں کی تھی جو یہ چاہتے تھے کہ ممالکِ اسلامیہ کی حکومتوں کو متحد کر کے ایک اسلامی بلاک پیدا کریں۔ جس زمانہ میں انہوں نے یہ کوشش شروع کی اس وقت اسلامی بلاک کے معنی اس کے سوا کچھ نہ تھے کہ برطانوی اقتدار کے بازوؤں میں بین الاقوامی سیاست کی حد تک از سرِ نو طاقت پیدا ہو جائے اس لئے کہ ان میں سے اکثر حکومتیں برطانوی حکومت کے اشاروں پر چلنے کے لئے آمادہ تھیں۔ باقی ممالک نے کچھ تو فرانس کچھ اسپین اور کچھ ایک آدھ امریکہ کی ہمنوائی کو قبول کیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ چودھری صاحب نے اپنی کامیابی کے لئے تمام ممالک اسلامیہ کا دورہ ختم کرنے کے بعد لندن کے وائٹ ہاؤس کا بھی طواف فرمایا۔

دوسرا رخ موتمر عالمِ اسلامی کا ہے جو معاشی اور ثقافتی اتحاد کے ذریعہ ممالک اسلامی میں اتحاد پیدا کرنے کی جدوجہد کر رہی ہے۔ یہ راستہ گو منزل کے رخ پر ہے لیکن اتنا پُر پیچ اور طویل ہے کہ زمانہ کے موجودہ تقاضوں سے کسی طرح ہم قدم نہیں ہو سکتا۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ موجودہ حالت میں حکومتوں کی متنوع اشکال کو بدلنا ممکن ہے۔ اور اسلامی فکر سیاست میں اس کی وہ اہمیت نہیں ہے جو مغرب میں ہے۔ اسلامی سیاست تو صرف ایک ہی شرط پر اجتماعی زندگی کے انصرام کو دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ یہ کہ شکل وصورت سے ہٹ کر جو بھی اقتدار اعلیٰ ہے۔ وہ تو خدا کے ان تقاضوں کو پورا کرتا ہے یا نہیں جس پر اسلامی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیاد ہے۔ یعنی خدا کی حاکمیت میں اس کے بندوں کا ایسا انتظام جو عمل صالح اور فکرِ صالح پر مبنی ہو اس لحاظ سے ہم آسانی کے ساتھ اس رکاوٹ سے عاری ہو سکتے ہیں۔

سب سے بڑی بیماری قومیت کی ہے۔ مسلمان کلمہ حق کے فیض سے ایک ایسا عالمی انسان ہے جس کی اخوت کی بنیاد نسل، رنگ اور وطن کے لات ومنات پرستش سے بالاتر ہو کر انسانیت کے ایک ایسے صالح طبقہ کی پرورش کرتی ہے جو اس دنیا کو آخرت کی کھیتی بنائے۔ اس لئے اب عالم اسلامی کو بیدار ہو کر اس لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔ مغربی استعمار سے ہمیں جو چیزیں اپنے تلخ تجربوں سے حاصل ہوئی ہیں اس کو نہ بھولنا چاہیے۔ برطانیہ سب سے بڑی اسلام دشمن شہنشاہیت ہے۔ اسلام کے ساتھ اس کی دشمنی ڈیڑھ سو برس کی خونیں داستان ہے جس کے لئے ایک ضخیم کتاب بھی کافی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان میں لارڈ کلایو سے لے کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن تک جو مظالم مسلمانوں پر ہوئے وہی کافی دردناک ہیں۔ ایران، مصر، بلادِ عرب ترکی غرض ہر جگہ برطانیہ ہی کی سنگینیں مسلمانوں کے دلوں میں پیوست نظر آتی ہیں۔ برطانیہ اب اپنی مرتی ہوئی شہنشاہیت کو اپنے چچا سام کی پشت پناہی اور ڈالر کے زور پر اسلامی ممالک قائم رکھنا چاہتا ہے۔ مملکت متحدہ امریکہ اپنی

انفرادی حکمتِ عملی اور مشرقِ وسطیٰ کی تجارت کے خاطر برطانیہ کی پشت پناہی لازمی سمجھتا ہے۔ ایران کے معاملہ میں اس کا طرزِ عمل اور اب مصر کے مشکلات میں انگلستان کے ساتھ اس کی ہم آہنگی واضح ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ کی حیثیت ممالک اسلامیہ کے سامنے ایک کھلے ہوئے دشمن کے حلیف کی ہے۔ یہ ایسے حقائق ہیں جس سے ممالک اسلامیہ کے عوام تو واقف ہیں لیکن اکثر حکومتیں باوجودِ واقفیت کے مصالحِ ملکی و مالی کی چکر میں مبتلا ہیں۔

اسلامی ممالک کی حکومتیں ابھی اس سے پوری طرح سے آگاہ نہیں ہوئی ہیں کہ ان کے عوام اب برطانیہ یا برطانیہ کا براہِ راست تسلط اور امریکہ کا بالواسطہ تسلط برداشت نہیں کر سکتے۔ ایران، مصر نے یہ ثابت کر دیا کہ ایک بیدار قوم کی حکومت کتنی ہی بربریت پرست کیوں نہ ہوں۔ عوام کی آواز کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ ایسی مثالیں، جو جلد یا بدیر تمام اسلامی ممالک میں اپنا اثر پھیلا کر رہیں گی۔

اس لئے اب ممالک اسلامیہ کی حکومتوں کے لئے اس کے سوا کوئی راہِ عمل نہیں ہے کہ وہ ہر اس جرأت کو جو امریکہ، برطانیہ یا دوسری مغربی شہنشاہیت کی وجہ سے ممالک اسلامیہ کے کسی ملک کو پہنچے تو اس کو خود پر براہِ راست حملہ سمجھیں اور بغیر کسی جھجک کے اپنی تائید کا اظہار کریں۔ عقل کا تذبذب دنیادارانہ دور اندیشی، مادی وسائل پر تکیہ کرنے کی خو اور سب سے زیادہ انفرادی خود غرضیاں ممکن ہے کہ اس عمل میں حائل ہو جائیں۔ لیکن حکومتوں کو اس روزِ بد سے بچنا ہے جبکہ ان کے عوام ایران اور مصر کی طرح ان کے قابو سے باہر ہو جائیں گے۔

اس وقت سوڈان، منطقہ، سویز، ایران، عراق، فلسطین، کشمیر، نیوگنی اور بلادِ عرب سے متعلق جتنے مسائل ہیں ان میں سے ہر ایک میں یہی چیز دکھائی دے گی کہ چونکہ ممالک اسلامیہ

متحدہ آواز نہیں رکھتے اس لئے اسلام دشمن عناصر کو یہ آسانی حاصل ہے کہ ان کو فرداً فرداً تباہ کر دیں۔ ہمارا اتحاد فرد اور جماعت کی زندگی ہو گی۔ ہماری انفرادیت ہمارے ملک و ملت دونوں کے لئے پیغام فنا۔

مسلم بلاک

تمام اسلامی ممالک کے مفکرین حکومتیں اور عوام کے ذہنوں میں مسلم بلاک کا تصور دھندلے نقوش کے ساتھ رفتہ رفتہ نمایاں ہو رہا ہے مشرق قریب اور وسطیٰ سے لے کر پاکستان اور انڈونیشیا تک ایک برقی رو اتحاد عالم اسلامی کے لئے بیدار ہو رہی ہے۔ اس رو کا عملی مظاہرہ مختلف مسلم ممالک کے سیاسی حالات اور بین الاقوامی حدود کی بنا پر مختلف مدارج رکھتا ہے۔ کہیں پر یہ تحریک بالکل نمایاں ہو چکی اور کہیں زیر لب گنگناہٹ کی صورت میں اور کہیں پس پردہ ہے لیکن اس حقیقت سے مخالفین بھی انکار نہیں کر سکتے کہ ایک زندہ اور ترقی پذیر تحریک کی شکل میں یہ تصور تخیل کی منزل سے نکل کر حقیقت کے زینے طے کر رہا ہے۔

حال ہی میں وزیر اعظم نحاس پاشا نے مصر کی جانب سے اور وزیر اعظم مصدق نے ایران کی جانب سے جو فشتر کریمان دیا ہے اس نے اس عالمگیر تحریک کی ابتدا کر دی جس طرح ایران آج بھی اسلامی تہذیب اور ثقافت کا مرکز ہے اسی طرح مسلم ممالک کی عربی شاخ کا رہبر مصر ہے ان دونوں ملکوں کا اتحاد اسلامی تمدن کے عرب و عجم کا اتحاد ہے اور صدیوں کے بعد ایک ایسی مبارک ابتدا ہوئی ہے جس کے تصور اور تخیل میں اسلامی مفکرین مدت سے معروف تھے۔

سیاسی حالات میں حقیقت پسند توازن کے بغیر کوئی کامیاب اقدام نہیں کیا جا سکتا اتحاد عالم اسلامی کرنے کی اب تک جتنی کوششیں ہوئیں ان پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے

سے ہمیں یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ہمیں اس نیک عمل کے لئے اتنی مدت کیوں درکار ہوئی۔

سب سے پہلی بالغ نظر کوشش اس سلسلے میں ایک مردِ واحد نے کی تھی اسد آباد کے جمال الدین افغانی نے تنہا اس تحریک کو ہندوستان، ایران، بلاد عربیہ، مصر اور ترکی تک پہنچایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مغربی دول اسلامی ممالک کو ہمیشہ کے لئے غلام بنانے کی تدبیروں میں مصروف تھے۔ بظاہر جمال الدین کی تحریک بارآور نہ ہو سکی۔ ممالک اسلامیہ مغربی شہنشاہیتوں کے دست برد میں آ گئے لیکن جمال الدین افغانی نے جو روحِ اتحاد اپنی مقناطیسی شخصیت سے مسلمانوں میں پھیلائی وہ ہر مسلم ملک میں مختلف شکلوں میں ظہور پذیر ہونے لگی۔ جمال الدین افغانی کے بعد مصر میں محمد عبدہ کی تحریک آزادی ایران میں اتحادِ ملی کی تحریک شام میں شکیب ارسلان کی جد و جہد مراکش میں امیر عبد الکریم اور طرابلس میں شیخ سنوسی ترکیہ میں اتحاد و ترقی کی جماعت ہندوستان میں مسلم لیگ اور انڈونیشیا میں شراکت المسلمین کی جماعتوں نے مسلم ممالک کی قومی آزادی کی جد و جہد شروع کی جس کا مقصد واحد یہ تھا کہ ہر ملک اپنے غیر ملکی آقاؤں سے چھٹکارا حاصل کرے۔ یہ تحریکیں اس ایک سو سال کی مدت میں سیاسی اتار چڑھاؤ کے گرم و سرد کو برداشت کرتے ہوئے اپنے ماحول کے لحاظ سے ترقی کرتی رہیں جس کا نتیجہ موجودہ عالم اسلام کی مملکتیں ہیں۔ ان تحریکوں کے سامنے جو مشکلات رہی ہیں ان کی فہرست میں سب سے نمایاں مشکل خود اس کی حکومت سے جد و جہد تھی۔ اس لئے کہ مغربی استعمار نے حکومتی مشینری کے ذریعہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے اس تحریک کو ختم کرنے کی سعی کی۔ باوجود اس کے ہندوستان میں مسلمانوں نے پاکستان حاصل کیا۔

انڈونیشیا نے ہالینڈ کا براہ راست غلبہ اور برطانیہ کے بالواسطہ ریشہ دوانیوں سے گلو خلاصی حاصل کی ترکی نے اپنے دست بازو کے زور سے ہمیشہ کے لئے مغربی تسلط کے ہر اندیشے کو مٹا دیا لیکن دو مملکتیں ایسی ہیں جنہوں نے صحیح معنوں میں وہ کامیابی حاصل

کی جس کے نتیجہ کے طور پر اسلامی بلاک کا وجود ہو سکتا ہے ایک ایران دوسرا مصر۔ یہاں پر حکومتیں بالکلیہ ملک کے عوام کی ترجمانی پر قائم ہیں اور عوام صحیح معنوں میں ایسی سیاسی جماعتوں کی نشاۃِ ثانیہ چاہتے ہیں جن کا رجحان اسلامی ہے۔ سوائے دو ملکوں کے ابھی تک ایسی مثال دوسرے اسلامی ممالک میں نظر نہیں آتی۔

دوسری جنگِ عظیم سے پہلے ایک کوشش اس قسم کے اتحاد کی مصطفیٰ کمال پاشا نے کی تھی اور مصر، ایران، افغانستان اور ترکیہ کے درمیان "میثاق سعد آباد" کے نام سے ایک معاہدہ کیا تھا جو حقیقی معنوں میں اتحادِ عالم اسلامی کی ترقی کی رفتار میں نشانِ منزل ہے گو اس میثاق کے عملی پہلو بالکل ناکام رہے۔ لیکن ایک ابتدا کے طور پر اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ اس میثاق کی ناکامی کے پیچھے بیرونی ریشہ دوانیاں اور اندرونی کمزوریاں کارفرما تھیں۔ ہم نے بار بار اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ممالک عالم اسلامیہ کے اتحاد پر عملی تجاویز پیش کرنے سے پہلے تین باتوں پر پوری ذمہ داری کے ساتھ نظر رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ عالم اسلامی کا ہر ملک اپنی سیاسی حیثیت میں یکساں نہیں ہے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابھی تک اسلامی ممالک کا کوئی ملک بھی ایسا نہیں ہے جو روس اور ممالک متحدہ امریکہ کی طرح اپنی مرضی کا بالکلیہ مختار ہو۔ دوسرے یہ کہ عالم اسلامی کے ہر ملک کا سیاسی شعور اپنی بیداری مدارج میں مختلف ہے۔ عام تعلیم کا فقدان اور معاشی بدحالی جو مغربی سامراجیت کا نتیجہ ہے۔ مسلم ممالک کے عوام اب تک وہ بیداری حاصل نہ کر سکی جو آزاد اور فارغ البال اقوام میں پائی جاتی ہے۔ تیسری یہ حقیقت کہ باوجود مغربی تحریکوں کے تمام مسلمانوں میں اخوت اسلام بھائی چارہ اور تبلیغی تعلق کا گہرا اثر موجود ہے۔

ان تینوں حقائق کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد جس طرح یہ کوششیں بے معنی بے مقصد خطرناک ہوں گی۔ ان ممالک کی حکومتوں کو اسلامی بلاک کے قیام کے لئے متحد کیا جائے اسی طرح یہ تجویز بھی خطرناک ہے کہ موجودہ صورت پر پورے عالم اسلام کے عوام کو ایک عالمی اسلامی

بلاک کی تحریک کو منسلک کیا جائے۔ پہلی تحریک کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چونکہ ابھی مختلف کمزور ممالک کی حکومتیں غیروں کے اثر سے نہیں بچ سکتیں اور ایسے ہی ملکوں کی اکثریت ہے۔ اس لئے اسلامی بلاک کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ وہ سامراجی اغراض کی تکمیل کا ایک اور طاقت ور حربہ ہے۔ دوسری تحریک اس لئے اندیشوں سے خالی نہیں ہے کہ چونکہ ہر اسلامی ملک کی سیاسی بیداری یکساں نہیں ہے۔ ہر ملک میں جو اسلامی ادارے ہیں ان کا مختلف اثر ہے۔ اس لئے ان کی موجودگی میں ایک واحد ادارہ کی تخلیق انتشار ذہنی انتشار عمل اور فساد کا باعث ہوگا۔

نزاع میں آنے کا احسان جتانے والے

ہاں کسی غیر کو میں نے بھی پکارا کب تھا!

علامہ رشید ترابیؒ کی دو یادگار مجالسِ شامِ غریباں

صبر آزما منزل

علامہ رشید ترابی

دنیا کی سب سے بڑی حقیقت اور سب سے بڑی سچائی جس کو دلائل سے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی وہ دنیا کے گوناگوں مصائب ہیں جن کو سمجھنا اور ان کے وجود پر فلسفہ و منطق سے روشنی ڈالنا کسی مفکر کا کام نہیں رہا۔۔۔ زندگی عام ہے اور زندگی کے ساتھ درد بھی عام۔ مسرت آنی و فانی ہے اور مصیبت باقی و دائم۔ انسانوں کی اکثریت اس زحمت و تکلیف میں مبتلا ہے جس کا اظہار ناممکن ہے۔

بیماریوں سے فراش ہزاروں انسان۔ فاقوں کی تکلیف سے جاں بلب لاکھوں آدمی تن ڈھانکنے کی استطاعت نہ رکھنے والے کروڑوں بندے اسی سرزمین پر رہتے اور تڑپ تڑپ کر اسی زمین کے اندر پناہ لیتے ہیں۔

ماں باپ کے لئے سب سے زیادہ محبوب تحفے ان کے بچے ہیں جن کا فاقوں میں مبتلا ہونا سردی میں اکڑنا دھوپ میں تلملا اٹھنا بیماریوں میں سسکنا اور پھر ان سب پر ماں باپ کی مجبوری وہ قیامت خیز مناظر ہیں جو شب و روز ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ گھر کی بربادی شوہر کی موت، یتیم بچوں کی در بدری۔ دنیا کی نعمتوں کو دیکھ کر ان کا ترسنا اور محروم رہنا یہ سب کچھ وہ حقائق ہیں جس سے انکار کی مجال نہیں۔ صحت و بیماری کی دونوں صورتوں میں غریب انسانوں کا صبح سے شام تک محنت کرنا اور پھر بچوں کو پیٹ بھر روٹی نہ دے سکنا کچھ کم مایوس کن نہیں۔ اور پھر اس مزدور کا ضعیف و مفلوج ہو کر ناامید ہو جانا اور پیٹ بھر کے

انسانوں کی طرف غضب آلود نگاہوں سے دیکھنا افسانہ نہیں حقیقت ہے۔

کیا یہ سب اسی لئے ہے کہ قدرت نے ان کو متمول اور آسودہ گھرانوں میں نہیں پیدا کیا کیا یہی صورت حال باقی رہتی اگر ان کے پاس بھی وسائل دولت فراہم ہو تے۔ ؟ پھر دنیا کیوں بگڑا لٹھتی ہے۔ جب یہ پریشان روزگار انسان احتیاج کے لئے تیار ہوتے ہیں جب ان مصیبت زدوں کو اس کا یقین ہے کہ سب آدم کی اولاد ہیں۔ مگر مراعات اخوت سے محروم ہیں۔

ذی استطاعت خاندانوں پر بھی ایک وحشت کا دور گزرا ہو گا۔ لیکن وہ مقدر سے ہمیاں کا دماغ کے کاوش کا نتیجہ مکاری و فریب دہی کی وجہ سے ہو یا فطرت فیاض کا عطیہ بہر حال وہ آج دولت مند اور یہ پریشاں حال ہیں۔

محلوں کے مقابل ان کے خستہ حال جھونپڑے عیش و تنعم کے مقابل ان کی فاقہ کشی تیز رفتار سواریوں کے مقابل ان کے تھکے ہوئے پاؤں اور پھر کسمپرسی کے عالم میں ان کی صورت یہ خاموش جلتے ہوئے پُر سکوت بد دعائیں سامان قہر بنتی جا رہی ہیں جس سے اہل دولت کی نیند اُڑ چکی ہے لیکن اپنے کو حق بجانب سمجھتے ہوئے وہ بھی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ یہ سب کھیل قدرت کے ہیں جس میں صلاحیتیں دے کر انہیں دولت سے محروم کر دیا۔ اور حسب ظرف کسی کو دولت دے کے مالا مال کر دیا ہے۔ کیسی اچھی تسلی اور بے حس زندگی بسر کرنے کے لئے کیا اچھا استدلال۔

لیکن واقعی دولت مندوں کی خطا کیا ہے۔ ؟ جاگیردار طبقہ نے کیا غلطی کی ہے ؟ ایک نے ذاتی کاوشوں سے روپیہ حاصل کیا۔ دوسرے نے آبائی دولت ورثہ میں پائی۔ ان کا دولت مند ہونا یا دولت مند رہنا ان کی کیا غلطی ہے۔ ؟ کیوں وہ مورد الزام و طعن ہیں۔ ؟ اس لئے کہ روپیہ ان کے پاس ہے یا اس لئے کہ روپیہ کا مصرف درست نہیں۔ اگر دنیا اس بات پر ان کو مطعون کر رہی ہے کہ وہ صاحب ثروت ہیں تو یہ فکر کی غلطی اور نفس کا فریب

ہے۔ خود مفلس رہ کر تونگر کو بُرا کہنا حسد ہے۔ اور اگر دولت کے غلط مصرف پر اعتراض ہے تو وہ انسان جو واقعی معدن کے سانپ ہیں اور خازنِ دولت کے دربان اس طعن و تنقید کے یقینی مستوجب ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کو مصرفِ زر کے اصول بتلانا چاہیئے اور ان کی کوتاہ بینی سے آگاہ کر دینا چاہیئے۔ کسی کے ملک کو چھین لینا امن کے منافی ہے اور ایسا مشورہ جاہلانہ مشورہ ہوگا۔ اس لئے کہ امیر یا غریب زندگی کا وقت سب کا معین ہے۔ اور سب کی ملکیتوں میں "وارث و حوادث دو برابر کے شریک ہیں"۔ اسی لئے دولت کے مصرف کو پہلے واضح کر دینا عقل والوں کا شعار رہا ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی خود فریبی میں مبتلا رہے تو انقلابِ مدت اور زوالِ نعمت کے قانون کی زد میں آ پڑے گا۔

نظامِ جاگیرداری حکومتوں کی ضرورتوں پر پیدا کیا ہوا ایک ادارہ ہے کہ ان ضرورتوں کے ختم ہو جانے پر اس ادارے میں قوت و طاقت نہیں ہوتی۔ اس ادارے میں وہ انسان بھی ہیں جن کی قربانیاں جن کے ایثار و فدویت کے کارنامے جن کی سرفروشیاں اس امر کی مستحق تھیں کہ حکومت ان سے مناسب سلوک کرتی اور ان کو مصائبِ دنیا کے خوفناک شکنجوں سے دور رکھا جاتا ان جری اور بہادر انسانوں کی نسلوں میں یقیناً آج بھی انسانی ہمدردی، فرض شناسی کا درد مند دل ہے۔ ان کو صرف یہ بتلانے کی ضرورت ہے کہ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں۔ ۱۔ فکر کا انقلاب۔ ۲۔ سائنس کا صنعت پر اثر۔ ۳۔ مواصلات کی وجہ سے بیرونی دنیا کا ربط و ضبط۔ ۴۔ رائے عامہ کی طاقت۔ ۵۔ فرد کی صلاحیتوں کو جمہور میں ختم کر دینے کی کوشش۔ یہ وہ صورتیں ہیں کہ جن سے حکومتوں کے نظام متزلزل ہو رہے ہیں۔ تو انفرادی زمینداری اور شخصی دولت کا کیا مقام ہے۔

عام انسانوں کا درد اگر ان کو بے چین نہ کر دے فاقہ کشوں کی بھوک سے اگر یہ متاثر نہ ہوں مجبوروں کی فریاد اگر ان کے کانوں تک نہ پہنچے اور یہ علاوہ اپنے فرائض سے غافل ہو کر قانونِ حق کے معین کردہ ٹیکس کو بھی ادا نہ کریں تو ان کی تباہی قریب سے قریب تر ہو جائے گی اور ایسے

ہی انسانوں کے تقسیم زر کے وہ نظریات قائل ہو جائیں گے۔ جو ہر انسان کو ذاتی ملکیت سے محروم کر دینا چاہتے ہیں۔

لیکن صاحب زر و دولت مندوں کا وہ طبقہ جو اپنے عمل کو "قل العفو" کی تفسیر بنا کر پیش کر رہا ہے یعنی۔ جب یہ پوچھا گیا کہ کتنا انفاق کیا جائے تو یہ جواب ملا کہ جو بچے تقسیم زر کے ہر غلط نظریہ کی دست برد سے بچا رہے گا۔

آمدنی کے ذرائع جب موجود ہیں تو بچے ہوئے روپے کا بڑی صنعتوں میں لگا دینا اور ان صنعتی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو اس کے نفع و نقصان میں برابر کا شریک رکھنا اور ان ہی مزدوروں کی رائے پر افسروں کا انتخاب یہی وہ چند امور ہیں جن سے مزدور بھی مطمئن ہو گا اور دولتمند بھی۔ بچے ہوئے روپے سے مدرسوں، عبادت گاہوں، دواخانوں اور اسی قسم کے فلاحِ عامہ کے کاروبار اگر جاری کئے جائیں تو پھر تقسیم زر کے مطالبہ کا کیا مقام رہ جاتا ہے۔

مارکس ماحول سے مجبور تھا۔ اس لئے ماحول کی تخلیق تھا۔ اس نے تو مزدوروں کی بے اعتنائی بھی دیکھی اور بے کسوں کی موت بھی۔ اس کی نگاہوں میں اس کا اپنا ملک تھا۔ اور اس ملک کے دولتمندوں کی عیش پسندیاں تھیں جب کہ غریب سسک سسک کر مر رہے تھے لیکن اگر ان کو یہ معلوم ہوتا کہ قل العفو کا بھی ایک الہامی نظریہ موجود ہے تو پھر وہ یا اس کے ماننے والے اور اس کے نظریات پر نظامِ حکومت کی بنیاد رکھنے والے خونیں انقلاب نہ پیدا کرتے مقصد سب ہی کا یہی ہے کہ دولت سیال رہے جامد نہ ہو مگر اس کے لئے کیا وسائل اختیار کرنا چاہیئے۔ وہ فطرت انسانی کے کسی کامل معلم سے پوچھیے جو نفسِ انسانی کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس مسئلہ کا حل نکالے۔ دولت کو ہمیشہ چند ہاتھوں میں رہنا ہے اور دولت ایک نشہ آور چیز ہے۔ کوشش یہی کرنی ہے کہ نشہ نہ چڑھے۔ طبیعت اعتدال پر ہو تو وہی دولت جو گناہوں کا مرکز ہے۔ نیکیوں کی بنیاد بن جاتی ہے۔ جس زینت دنیا کو باقیات الصالحات بنانے کی

کوشش ہر فتنہ و شر اور ہر دشمنی و بغاوت کا خاتمہ کر سکتی ہے۔

کون ہے وہ درد بھرا دل جو ان تجاویز پر عمل کرے جو اپنی آمدنی میں خرچ کا تعین کر کے باقی سب بندگانِ خدا کے لئے صرف کر دے جو خود آرام سے رہے مگر دوسروں کے درد دکھ سے غافل ہو کون ہے وہ تونگر جو اپنے کو امین جانے اپنی ذات کو ذریعہ تقسیم دولت قرار دے اور اپنے ہاتھوں کو خزانے کی سمت بنائی نالیاں فرض کرے کہ جس سے دولت سیال ہو کر بہتی نکل جائے

حقوق العباد کا ادا کرنے والا سب سے بڑا عبادت گزار ہے اور بندگانِ خدا کی پریشانیوں پر بے چین ہو جانے والا دل سب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔

”مارکس کا معاشی نظام انسانی زندگی کے کسی اور پہلو کے پہچاننے کی صلاحیت نہیں رکھتا“ وہ مزدوروں کی مصیبت و تکلیف کا تو اندازا کرتا ہے لیکن اپنے ماحول سے مجبور ہو کر چند دولتمندوں کے دلوں میں درد اور تڑپ پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ وہ انسان کی نیکی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن اس کو یہ نہیں معلوم کہ انسان کی نیکی سے قطعاً انکار کرنا بھی فکر کی غلطی ہے۔ نوع بشر کا ہر فرد بدنیت نہیں اور اگر ایسا ہی ہے تو پھر زار کی نیک نیتی پر حملہ کر کے دنیا کے سارے مزدوروں کو بھلا نیک نیت سمجھا جائے۔؟

فطرت قیامت تک جہاں ہر ایک انسان کو دیکھنے والی آنکھ اور سمجھنے اور محفوظ کرنے والا دل و دماغ عطا کرتی ہے تو ہر فرد کے باطن میں وہ احساس درد بھی مقدر کر دیا جاتا ہے جو اگر بے علمی سے کسی ایک انسان میں مردہ ہو جائے تو معاشرہ، حکومت، رائے عامہ اس کا احتساب کرے۔ لیکن اس کے باوجود کہ انسان کے باطن میں کچھ نیکیاں بھی ہیں، قدرت اور اس کا قانون، حکومت اور اس کا نظام سزا و جزا کے خوف و طمع سے ان نیکیوں کو ابھارنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح وہ نیکیاں سرزد بہ عمل آتی ہیں۔

تقسیم زر کے بہانے دولت مندوں کو فوری ختم کر دیا گیا۔ ملک کے خزانہ ہائے اب کو یکایک توڑ دیا ہے۔ ان کو باقی رکھتے ہوئے ان خزانوں کی شہر کی آبادی کو متصل

رکھنے کی کوشش کرنا۔ ایک اچھے نظام حکومت کی دلیل ہے۔

روٹی کے مسئلہ کا حل یہ نہیں کہ دنیا میں خونیں انقلاب برپا کئے جائیں۔ حکومت کو چند ہاتھوں سے نکال کر دوسرے چند ہاتھوں میں منتقل کر دیا جائے۔ اکثریت کے بر مناسب و نامناسب مطالبہ کو قبول کر لیا جائے۔

روٹی کے مسئلہ کا حل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ درسِ اخلاق کو عام کیا جائے۔ مرد کو قابل اکتساب بنایا جائے۔ مفلس کو عزم اور تونگر کو ایثار کا سبق دیا جائے۔ حاکم و محکوم کی درمیانی خلیج کو پاٹا جائے۔ معیار تکریم و بزرگی کو بدل دیا جائے اور یہ بھی واضح رہے کہ لاکھوں کو نیک بنانا اتنا آسان نہیں جتنا کہ چند انسانوں کو۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ساری دنیا کا معاشی نظام کبھی یکساں نہیں رہ سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔ کہ دنیا کا کوئی انسان کبھی بھوکا ہی نہ رہے۔ لیکن حتی الامکان معاشی دشواریوں کو دور کرنا ہمارے لئے لازم ہے اور ایک عام حالتِ اطمینان کا پیدا کرنا ہمارا فرض۔ مذہب حق کے اصول و قوانین آج بھی انسانیت کے لئے وجہ سکون ہیں۔ جہاں اکتساب معیشت کے طریقوں کو یکساں نہیں بلکہ حق معیشت کو یکساں قرار دیا گیا ہے کہ جو جتنا چاہے حاصل کرے مگر سب کو ملے۔

روٹی کا حل نکالنے کے لئے مذہب کو ختم کر دینے کی کوشش سب سے زیادہ خطرناک ہوگی۔ اس طرح سے لاکھوں اور کروڑوں انسان اس باہمی احساس درد و محبت کو بھی کھو دیں گے جس کو چند دولت مند انسانوں کے دلوں میں منزہ دیکھ کر ایک عالمگیر انقلاب کی بنا پر رکھی گئی تھی۔

انسانی ترقی صرف معاشی نظام کی نشو و نما نہیں معاشرتی نظام کی نشو و نما ہے جہاں معاشرے کو زندگی کی راہ پر لگانا مفکر کا فرض ہو جاتا ہے۔ اور معاشرے کی نشو و نما کا ایک جز اس کا معاشی پہلو بھی ہے۔ اس حالئے معاش کی زندگی کے ہر پہلو پر محیط سمجھنا زندگی کو اس کی اعلیٰ قدروں

سے محروم کر دیتا ہے۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ فکر انسانی کی نشو و نما صرف تقسیم زر کے مسائل پر منحصر ہے۔ تو پھر ۱۸۴۸ء سے پہلے دنیا میں جتنے عظیم المرتبت مفکر گزرے جن کے افکار پر ہمارے تمدن و تہذیب کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ کیا وہ سب اسی معاش کے تعلق خاطر ہی سے سوچ رہے تھے۔ وہ مفکرین کی زندگیاں مزدوروں کی زندگیوں سے پریشان تر گذریں۔ وہ مفکر جنہوں نے قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں اور مفکرین کو شہر بہ شہر دیار بہ دیار جلاوطن ہو کر پھرنا پڑا۔ مگر جنہوں نے صرف اپنے افکار سے انسانی رجحانات کے دھارے کو بدلنے کی کوشش کی اصلاح کا پرچار کیا۔ انقلاب کا نہیں اور اسی میں ان کی زندگیاں ختم ہو گئیں کہ نوع انسان کو نیک بنایا جائے۔

اگر یہ حقیقت ہے کہ انسان سے اولین باپ کے گناہ کا بدلہ لیا جا رہا ہے اور اسی پاداش میں اس کو فطرت بد ملتی ہے تو پھر اچھائی کی ہر کوشش بے سود ہوگی۔ اور اچھائی کی کوشش کون کرے۔ وہ جو گناہ گار باپ کا گناہ گار بیٹا۔ اور اگر ایسا نہیں تو پھر انسان کی سوئی ہوئی فطرت نیک کو بیدار کرنا، اس کو نیک منازل تک پہنچانا اس کے لئے نیک ماحول پیدا کرنا ہر ایک انسان کا اولین فریضہ ہوگا۔

نوعِ انسانی کے اصلاح کی ہر کوشش قابلِ مبارکباد ہے۔ لیکن کسی خاص نظریے کے ساتھ جب کوئی دارادارہ یا انجمن یا سوسائٹی ظہور پذیر ہوتی ہے تو یہ سمجھنا سخت دشوار ہو جاتا ہے کہ اس ادارہ کا قیام نوعِ انسانی کی محبت پر ہے۔ یا اس خاص ادارے کے دشمنوں کی عداوت پر۔ اور پھر یہ طے کرنا ہوگا کہ کون سا اچھا کام ہے۔؟ وہ جس کی بنیاد محبت پہ ہے یا وہ جس کی بنیاد عداوت پہ رکھی گئی ہے۔

وقت ہے کہ فکر کی ساری توانائیوں کو عصبیت و حقارت کے جذبات سے پاک کر کے نوعِ انسانی کی عام اصلاح کے لئے صرف کیا جائے اور اچھے اصولوں کو صرف اس لئے نہ ٹھکرایا جائے کہ کسی مذہب سے منسوب ہیں۔

قتل سے میرے ملا مجھ کو شہادت کا مقام
اور اسی بات سے قاتل میرا محسن بن جائے

صبر آغاز — صبر انجام

علامہ رشید ترابی کی ایک یادگار تقریر

شرافتِ انسان کا اعلان کرتے ہوئے قرآن نے بعض ایسے فضائل معین کر دیئے اور بعض ایسی خصوصیتوں کا انسان کے لئے وجوب ثابت کیا کہ جن فضائل و خصوصیات کی بناء پر انسان کی انسانیت ساری موجودات میں محلِّ ذکر و فکر بن گئی، ان تمام فضائلِ نفسی، ان تمام حسنات و کمالاتِ نفسِ انسانی میں ایک اہم منزل، ایک اہم منزلت ایک اہم مقام شرافت صبر قرار پایا۔ صبر صرف انسان ہی کے لئے ہے، نہ حیوان کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، نہ فرشتوں کے لئے۔ حیوان کے لئے یہ استعمال اس لئے نہیں ہو سکتا کہ صبر بدون تعقل نہیں، صبر بغیر علم نہیں، جتنا علم کمال پر جائے گا اسی قدر صبر منزلِ تکمیل پر پہنچے گا۔

اور پھر صبر قیام ہے یعنی ایک لشکر کا دوسرے لشکر کے مقابل میں قیام کرنا صبر ہے، یعنی باطل کے مقابل میں حق کا قیام صبر ہے۔ کذب کے مقابل میں صدق کا قیام صبر ہے، ظلم کے مقابل عدل کا قیام صبر ہے، ناحق کے مقابل میں حق کا قیام صبر ہے، کیونکہ حیوانیت کے لئے، بہیمیت کے لئے نہ علم ہے اور نہ قیام تصور میں آسکتا ہے۔ اس لئے حیوانیت کے واسطے یہ صفت کبھی مذکور نہیں ہوئی۔

اور ملائکہ کے لئے لفظ صابر اس لئے نہیں آیا کہ ملائکہ ہر آن مقام تقرب میں

ل حضرت احدیت میں فیضیاب و فیض کام ہیں۔ وہاں نہ شہوات ہیں نہ خواہشات
مں کران پر قابو پانے کے لیئے صبر کی ضرورت پڑے، اس لئے ملائکہ سے صفت
خواہش کو لے کر اس صبر کو ضروری نہ جانا۔ یہ فقط ایک انسان ہی ہے جس کے
لئے صبر لازم قرار پایا۔ اور اس لیئے لازم قرار پایا کہ اگر مصیبت پر مردوں کی طرح
صبر نہیں کرتا ہے تو احمقوں کی طرح مصیبت کو بھلانا پڑتا ہے۔

ایک عظیم منزل ہے صبر کی یہ عجیب صفت ہے۔ قرآن مجید نے ۷۰ سے
زیادہ مقامات پر صبر کا ذکر کیا ہے۔ انبیاء کے ساتھ اس صفت کو موصوف کیا
ور ہر نبی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی بزرگی کی صفت صبر کو ظاہر کرتے ہوئے کہا
(ترجمہ) ہم نے اس کو صابر پایا۔ ختمی مرتبت کے لیئے ارشاد ہوا: "(ترجمہ) اسی طرح
صبر کرو جس طرح اولی العزم انبیاء نے صبر کیا۔ تو آپ نے دیکھا کہ فقط انسان
کی شرافت صبر نہیں ہے، بلکہ انبیاء اولی العزم کا کمال اور ان کے پہچانے جانے
کی ایک صفت صبر ہے۔ انبیاء پہچانے جاتے ہیں صبر سے۔

باپ نے بیٹے کو خواب سے آگاہ کیا، بیٹا بھی نبی باپ بھی نبی، بیٹا نبوت
کی اس منزل پر فائز ہے کہ فرمایا (ترجمہ) "ہم نے بچپن ہی میں اسے قوت فیصلہ
عطا کر دی تھی"۔ جب باپ نے بیٹے سے کہا (ترجمہ) "میں نے خواب میں دیکھا ہے
کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ بتاؤ تم کیا سمجھتے ہو تمہاری رائے کیا ہے، بتاؤ تمہاری
مرضی کیا ہے"۔ تو بیٹے نے کہا کہ (ترجمہ) جو حکم ملا ہے اس پر عمل کیجیے اللہ نے چاہا تو آپ
مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔ کوشش تو میری ہو گی مگر صبر میں چاہنا اس
کا ہے اگر (ترجمہ) یہ نبی کی زبان ہے اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں سے

پائیں گے

صبر کی دو قسمیں ہیں، دو صورتیں ہیں ایک

یہ کہ صبر کرے۔ اس چیز پر جو تجھے پسند نہ ہو بات تکلیف دہ ہو اور وہ بات سامنے
آئے تو صبر کرے، دوسری یہ کہ کوئی چیز جسے تو بہت پسند کرتا ہے نہ ملے تو ملنے پر صبر
کرے۔ فرمایا (ترجمہ) یاد رکھو صابر کے لیے ظفر لازم ہے، صابر کی فتح اور کامیابی لازم ہے
اگرچہ زمانہ طول کھینچ جائے زمانہ طولانی ہو جائے مگر جب بھی صابر کا ذکر ہو گا، ظفر اور
فتح کے لیے ہو گا۔ نصرت و کامیابی کے ساتھ ہو گا۔ اس کی نصرت و کامرانی ہمیشہ خود
اس کے صبر میں رہے گی۔ فرمایا۔ (ترجمہ) یاد رکھو مردانہ وار صبر کرنا سیکھو ورنہ گزرتا
ہوا زمانہ خود مصیبتوں کو بھلا دیتا ہے۔ جب بھولنا ہی ہے مصیبت کو تو ایک حق کیوں
نہیں پیدا کرتے صبر کر کے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں معصوم صبر کو سمجھانا چاہتا ہے، صبر
کی تعریف فرما رہا ہے کہ صبر جوہرِ انسان ہے۔ قرآن مجید میں عجیب مقامات میں صبر کا
تذکرہ کیا۔ سورۃ بقرہ سے مسلسل صبر کی آیتیں شروع ہوتی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے (ترجمہ)
مدد طلب کرو صبر سے اور صلواۃ سے اور اللہ صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے۔ مع المصلین
نہیں کہا۔ عجیب منزل ہے۔ معنیٰ یہ نہیں کہ صلواۃ کا درجہ کچھ کم ہے۔ نہیں، آغازِ صلواۃ صبر
ہے۔ قیامِ صلواۃ صبر ہے، نماز کو قائم نہیں کر سکتا مگر صابر۔

اب جو کوئی کسی کے لئے کہے (ترجمہ) میں گواہی دیتا ہوں کہ تم نے نماز کو قائم
کیا تو اس کے معنیٰ ہی یہ ہیں کہ تو صابر تھا تجھ سے بڑھ کر صابر نہیں ہو سکتا۔ اللہ صابرین
کے ساتھ ہے اس کی معیت قیومیہ لیں تو ساری کائنات کے ساتھ ہے مگر یہ کہنا کہ ہم
صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہیں اس کے معنیٰ ہی یہ تھے کہ اس کی مخالفت میں قیام کرے گا۔
جو صبر کی مخالفت میں اعلانِ جدال کرے گا ہم اسے پسند نہیں کریں گے، ہم اس کو محبوب
نہیں رکھیں گے۔ ہم کبھی نہیں چاہیں گے کہ ہمارا بندہ توہین اٹھائے، ذلت پائے، ہمارا
بندہ ننگا، مخلوق میں ... کر ...
ہے۔ مؤمن ہے تو شہید ...

اور فوراً کہا (ترجمہ) اور خبردار یہ نہ کہنا کہ مردگان راہِ خدا کشتگان راہ خدا مردہ ہیں۔ نہیں وہ زندہ ہیں، لیکن تم کو شعور نہیں ہے، تم نہیں جانتے ہو اور یہ طے ہو چکا ہے کہ ہم امتحان لیں گے، ہم بغیر امتحان کے کسی کو نہیں چھوڑیں گے، ہم نے کسی کو بھی بغیر امتحان کے نہیں چھوڑا ہے۔ (ترجمہ) ہم امتحان لیں گے خوف سے رجوع سے نقص اموال سے نفس ثمرات ہم امتحان کی منزل پر جب پہنچا دیں گے تو خوشخبری سنا دو صبر کرنے والوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو ان کو دو باتوں کا احساس ہو گا، ایک یہ امر کہ میں کسی کی ملکیت میں ہوں۔ صابر کا یہ احساس ہوتا ہے کہ مجھے یہاں رہنا نہیں ہے۔

پہلے احساس کے لئے کہا اِنّا لِلّٰہ

ملکیت اس کی ہے اور چونکہ رہنا نہیں ہے، اس لئے کہا وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون یہ وہ منزل ہے جہاں صابروں کو بشارت ہو (ترجمہ) انہی پر صلواۃ انہی پہ درود ان کے رب کی طرف سے اور رحمتوں کا نزول ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے جائیں تو آپ نے دیکھا کہ ان کا مقامِ صبر یہ ہے کہ معیتِ خداوندی سے صابر ممتاز ہیں۔

صبر شانِ نبوت ہے۔ اولوالعزم انبیاؑ کی فضیلت صبر ہے۔ اور آگے بڑھیئے، (ترجمہ) ہم نے ان کو امام بنایا ہے تاکہ وہ ہدایت کریں اس لئے کہ وہ صابر تھے۔ تو صبر نبوت کے لئے بھی لازم ہے، صبر امامت کے لئے بھی لازم ہے، صبر نہیں تو نہ نبوت ہے صبر نہیں تو نہ امامت ثابت ہے، مقامِ نبوت و امامت کے لئے ضرورت ہے صبر کی اور اس لئے راہِ حق میں قیام کرنے والا حق کا اعلان کرے کہ ہر مصیبت کو جھیلوں گا، اعلان کو واپس نہیں لوں گا۔ قدم پیچھے نہیں ہٹیں گے، جو کہہ رہا ہوں، یہی کہوں گا، مرجاؤں گا، یہی کہوں گا یہ ہے منزلِ صبر۔ !

یہی نہیں کہ انسان چپ ہو جائے، یہی نہیں کہ خاموشی اختیار کرے، یہ صبر کی ایک

صورت ہوگی۔ مگر نہیں جس راہ کو طے کیا اور سوچ سمجھ کر طے کیا اور کہا نہیں امت کے لئے، ملت کے لئے یہی راہ مناسب ہے۔ تو اس راہ پر رک جانا اڑ جانا صبر ہے، غور سے سمجھ لیجئے کہ جنگ میں بھی صبر ہے، صلح میں بھی صبر ہے، صلح حدیبیہ پر مسلسل اعتراضات ہو رہے تھے کیا کیا آپ نے! آج ہم قوی ہیں مگر صابر تھے حضورؐ۔ وہ نبوت کا صبر تھا۔ صلح حسنؑ پر ہزاروں اعتراضات ہو رہے تھے مگر حسنؑ نے راہ متعین کر دی تھی کہ اس راہ سے جانا ہے کربلا کو۔ دنیا جو چاہے کہے مگر اس قافلہ کو اس راہ سے ہی کربلا جانا ہے یہ امامت کا صبر ہے۔

ظاہر ہے کہ دنیا جانتی ہے صابر حسینؑ محمدؐ کے نواسے کون۔ وہ جس نے اپنے صبر کی طاقت سے دنیا پر یہ واضح کر دیا کہ ہم نہ اپنے قول کو بدلتے ہیں، نہ اپنے کلام میں تغیر پیدا کرتے ہیں۔ نہ اپنے ثباتِ قدم میں لغزش کو آنے دیتے ہیں، یہ کہہ دیا کہ اطاعتِ رسولؐ کا قلادہ گلے میں ہے، اب کسی کی بیعت ممکن نہیں۔ رسول زندہ ہے اس کا کلمہ پڑھ رہے ہیں۔ اب کسی اور کا کلمہ کیا پڑھا جائے گا، انکار کر دیا، انکار پر اڑے رہے اور اس قیام کا نتیجہ کربلا ہے اور اس قیام کا نتیجہ شہادتِ حسینؑ ہے۔

اس معرکہ میں اس صبر کے مظاہرے نے یہ تبلا دیا فرزند رسولؐ کا جب نام آئے گا تو صابرین کی فہرست میں کسی ایسی منزل پر آئے گا جہاں آدابِ بندگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ عرض کروں کہ اگر ختمی مرتبتؐ کا نام آرہا ہے صابرین میں آپ نے فرمایا کہ (ترجمہ) جو تکلیف مجھے دی گئی وہ تکلیف کسی نبی کو نہیں دی گئی، تو پھر اس کا یقین رکھیے کہ ختمی مرتبتؐ کے ساتھ ساتھ حسینؑ کا بھی نام آئے گا۔

میرے پاس استدلال ہے علمائے اسلام نے لکھا کہ نواسے کو دیکھ کر کہتے تھے کہ یہ میّت کی منزل پر ہے، حسینؑ مجھ سے ہیں اور میں حسینؑ میں سے ہوں۔ تو

س مینت کی منزل پر صبر رسولؐ صبر حسینؑ ہے۔ میں اور آگے بڑھوں۔ نہیں صبر حسینؑ اسی لئے ہے کہ تقاضائے رسالت یہی ہے' دنیا سے جاتے ہوئے کہا۔ (ترجمہ) بیٹا میں دیکھ رہا ہوں کہ لوگ تیرے سر کو تخت گہ یزید کے پاس لے جا رہے ہیں۔ حسینؑ صبر کرنا"۔ فاطمہؑ کے لال نے صبر کیا۔ اولین و آخرین میں سے کسی نے اس طرح صبر نہیں کیا۔ محمدؐ کے نواسوں کو ہی اس کا حق پہنچتا تھا۔ کہ وہ صبر کریں اور بقائے اسلام کی فکر کریں علائے کلمہ حق کا انتظام کریں۔

صبر کی تین منازل ہیں۔ معارف احوال اور افعال میں معارف کی شکل یہ ہے کہ اصولِ احوال کی صورت یہ کہ اصول پر یقین افعال عمل کی منزل میں یعنی معارف شجر احوال ڈالیاں افعال اس کے پھل۔ صبر کا عالم یہ ہے کہ معارف کی منزل پر اصول سے لپٹا ہوا ہے۔ احوال کی منزل پر یقین سے لپٹا ہوا، اور افعال کی منزل پر عمل کر کے دکھلا رہا ہے کہ دیکھو تیر تیغ یوں ہوتے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ اولوالعزم پیغمبر ہیں انہوں نے خضرؑ سے پوچھا آپ مجھے تعلیم دیں گے خضرؑ نے جواب دیا تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے نبی اولوالعزم نے کہا کیوں میں صبر نہ کر سکوں گا۔ جواب دیا وہ صبر کیا کرے گا، جس کو علم نہ ہو۔ جس کو عواقب و انجام کا علم نہ ہو، وہ صبر کیا کرے گا۔ صبر کامل ہوتا جاتا ہے۔ علم کے کمال کے ساتھ حسینؑ نے محمدؐ کی زبان چوس کر پرورش پائی، اس لئے حسینؑ جان رہے تھے کہ انجام شہادت کیا ہے۔

اس شہادت کا ماحصل کیا ہے، اس شہادت کا اثر تاریخ پر کیا پڑے گا، آنے والے مسلمانوں پر کیا پڑے گا۔ قیامت تک یہ شہادت کس طرح محفوظ رہے گی، ذکر فکر اور شعور کے اعتبار سے بہرحال حسینؑ نے جو سوچا وہی ہوا۔ یہ صابر کا علم تھا...... آخری منزل یہ ہے کہ صبر کا آغاز اور صبر انجام، آخری سجدہ کیا، نینوا کی سرزمین

پر ذاتِ واجب کی بارگاہ میں۔ یہ منزل ہے دیکھئے آپ نے پہلے صبر پھر صلوٰۃ صابر نے سجدہ کیا تو سر رکھتے ہی آواز دی "یاغیاث المستغیثین" تیرے امتحان میں صابر ہوں۔ تیری مشیت کو تسلیم کر رہا ہے۔ تیرے حکم کو مان رہا ہوں، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ اے بے پناہوں کو پناہ دینے والے حسینؑ تیری بارگاہ میں آ رہا ہے۔ تاریخ یہ لکھتی ہے کہ آخری سجدہ میں یہ آخری الفاظ ادا کئے۔ محرم کی دسویں سالہ ھ ہے، عصر کا وقت ہے، آفتاب ڈوبنے کے قریب ہے۔ ایسے میں معلوم ہوا کہ زمین لرزتی چلی گئی، کائنات میں تہلکا پڑا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ہوائیں تُند ہو گئیں، ایسا معلوم ہوا کہ آفتاب کو گہن لگ گیا، ایسا معلوم ہوا کہ اندھیرا چھا گیا۔

گھبرا کر علیؑ کی بیٹی نے عابد بیمار سے کہا کہ بیٹا یہ کیا ہو رہا ہے۔ جواب دیا پھوپھی اماں ذرا میرا ہاتھ تھام کر مجھے خیمے کے دروازے تک لے جائیے۔ پہنچایا۔ پردہ اٹھایا۔ عابد بیمار نے سر بلند کر کے کہا بابا عابد بیمار کا سلام ہو۔ مظلوم نے، بیمار نے، صابر نے صابر کو سلام کیا۔ قیامت کی شام ہے شامِ غریباں، اردو ادب میں لفظ عام ہے۔ مگر جہاں جا کر اطلاق انطباق پا گیا وہ نینوا کی زمین تھی۔ کربلا کی سرزمین پر دنیا نے دیکھ لیا کہ حقیقت میں صبر کرنے والے ایسے ہوتے ہیں۔

(مجلسِ شامِ غریباں سے خطاب)

علامہ رشید ترابی کے روزنامے

المنتظر

کا

عکس اور اس کے منتخب اداریے

روزنامہ المنتظر کراچی

دنیا کی بے ثباتی اور صبح عاشورہ

یا دھر اف لک من خلیل — کم لک بالاشراق والاصیل

[illegible]

من صاحب او طالب قتیل — والدھر لا یقنع بالبدیل

[illegible]

وانما الامر الی الجلیل — وکل حی سالک السبیل

[illegible]

فرزند رسول الثقلین

اہلبیت رسول کی مدینہ کو واپسی

[illegible]

شہاب الدین صوبہ سرحد کے گورنر مقرر کر دیئے گئے

[illegible]

مسٹر عبدالحق چودھری کو ... مجرم قرار دیدیا گیا

[illegible]

... بھارتی جاسوس گرفتار ...

[illegible]

روزنامہ
منتظر کراچی

حسین ابن علی علیہ السلام

مسعود حیدری

عالم اسلام اور اینگلو امریکن بلاک

بی بی سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا اسوۂ کاملہ است
برائے نساء اسلام

آسام کے پہاڑی علاقوں میں ایک بھی مسلمان خوب بستے ہیں

اعلانات

سانحۂ کربلا
تصور کی نگاہ میں

بقیہ شذرات

متروکہ املاک سے متعلق پاکستانی ...

بھارتی قانون کے مطابق بنایا جائے گا

موسمی حالات

بازار کے بھاؤ

پہلا منتخب اداریہ اور ایک خبر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
روزنامہ
المنتظر کراچی
مدیر — معاون مدیر
سید ساجد حسین ★ باقر رضوی
یوم دوشنبہ ۶ محرم الحرام ۱۳۷۰ھ [illegible]

کراچی اور اعلیٰ تعلیم

کراچی کی اعلےٰ تعلیم کا جو حال ہے اس کے متعلق ایک سے زیادہ مرتبہ ہم نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ موجودہ خرابیوں کے متعلق کراچی کے وہ ماہرین تعلیم جو مدتوں یہاں کی اعلےٰ تعلیم کا تجربہ حاصل کر چکے ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ خرابیاں کراچی کو گذشتہ دور غلامی کے ورثہ کے طور پر ملی ہیں۔ اور اسی نقطہ نظر سے وہ اصلاحات پر بھی خیال آرائی کرنے کے عادی ہیں۔ ہم اس کو مانتے ہیں کہ تقسیم کے پہلے جو خرابیاں شہر کراچی کی اعلےٰ تعلیم میں ایک غیر حکومت نے اپنی روش سے اور یہاں کے ساہوکار منتظمین نے اپنے مصالح کی بنا پر پیدا کر دی تھیں وہ ایک حد تک آج بھی باقی ہیں۔ لیکن تقسیم کے بعد زمانہ گذشتہ کی خرابیاں ہی بحال نہیں بلکہ ان میں کئی وجوہ سے اضافہ ہو گیا۔

جو خرابیاں اعلیٰ تعلیم میں پہلے سے موجود تھیں وہ مختصراً دو بنیادی چیزوں پر مبنی تھیں۔ ایک یہ کہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح حکومت وقت نے اعلےٰ تعلیم کو اپنی توجہ کا مرکز نہیں بنایا۔ نہ سندھ ہی اس صوبہ کی اعلیٰ تعلیم کے معاملہ میں کوئی خاص دلچسپی لی۔ دوسرے یہ کہ کراچی چونکہ ہندو ساہوکاروں کے ہاتھ میں تھا۔ اس لئے انھوں نے یہاں کی اکثریت کو اعلیٰ تعلیم سے محروم رکھتے ہوئے اکثریت بھی اعلیٰ تعلیم کو یہاں تک جا سکے گراں خرچ اور تجارتی بنیاد پر قائم رکھا۔ یہاں کی اکثریت کے اس کے رد عمل کے طور پر یہ طے کیا کہ اپنے افلاس اور بیچارگی کو دیکھتے ہوئے ملازمت کے خواہاں طالب علموں کو زیادہ سے زیادہ سہولت دینے ہی میں انکی نجات ہے۔ نتیجہ میں وہ تمام خرابیاں پیدا ہو گئیں جن کا ذکر اکثر اخبار، رسائل، اعلیٰ تعلیم کیا کرتے ہیں۔ کالجوں کا گراں خرچ بنیاد پر قائم ہونا۔ اساتذہ کی تنخواہوں اور تعداد کی قابلیت کے معیار سے بے نیازی، جامع تعلیم کی

فضا، مواقع اور تربیت کے لئے کافی وقت کا فقدان سماج کی حاضری اور شرکت دونوں میں بے اعتدالی اور ضبط و نظم کی کمی یہ وہ عناصر ہیں جن کا اثر اعلیٰ تعلیم کے معیار اور ڈگری کے حصول کے بعد طالب علموں میں ڈگری کے لحاظ سے قابلیت کا فقدان بھی وہ چیزیں ہیں جن کو بار بار دہرایا جاتا ہے۔

تقسیم کے ساتھ ہی جامعہ سندھ قائم ہوئی اور ہنگامی حالات کا لحاظ کرتے ہوئے اس جامعہ کو صرف امتحانی جامعہ قرار دیا گیا۔ اس چار سال کی مدت میں یہ ہوا کہ بعض کالجوں کو حکومت نے اپنے انتظام میں لے لیا۔ لیکن نہ پرانی خرابیاں دور ہو سکیں اور نہ جامعہ کے قیام سے اعلیٰ تعلیم میں وہ یکسانیت پیدا ہو سکی جس کی توقع کی جا سکتی ہے۔ جامعہ کے قیام کے زمانہ میں جو حالات تھے اس کے تحت حکومت نے جو بھی افراد میسر آسکے اس کام پر مقرر کر دیا۔ اس وقت معیار اور انتخاب کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

چار سال میں حالات بالکل ہی بدل گئے کراچی ایک تین لاکھ کی چھوٹی سی آبادی کی جگہ پندرہ لاکھ نفوس کا دارالحکومت بن چکا ہے اور آبادی میں زیادہ تر ایسے عنصر کا اضافہ ہو گیا، جو ہندوستان کے زیادہ تعلیمی ترقی پانے والے صوبوں سے آئے تھے۔ یہاں کے حالات نے ان کو اپنے نوجوانوں کے مستقبل سے تقریباً مایوس بنا دیا۔ جن کے دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ مالی لحاظ سے تباہی یہاں کی اعلیٰ تعلیم کی گراں خرچی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی، دوسرے یہ کہ اکثر خاندانوں کی معاشی بدحالی مجبور کر رہی تھی۔ اپنے ہر نوجوان کو کسب معاش میں مصروف کر دے۔ موجودہ حالات تعلیم اور دوسرے برے حالات پر اس کا اثر پڑا لیکن اگر [illegible] تعلیم کو استوار کرنے کی کوشش کی جاتی [illegible]

مشکل نہ تھا۔

اس چار سال کی مدت میں صرف یہ ہوا کہ جامعہ سندھ کو حیدرآباد میں منتقل کر دیا گیا اور جامعہ سندھ کے فرسودہ نظام کو بحال رکھ کر دارالحکومت میں ایک وفاقی جامعہ قائم کر دی گئی جو جامعہ سندھ سے بھی زیادہ سست رفتاری سے کام کر رہی ہے۔

ہم نے اس سے پہلے بھی توجہ دلائی ہے کہ تعلیم ان مدات میں سے ہے جو کسی ترقی یافتہ حکومت کے موازنہ میں صرف خرچ کا باعث ہوتی ہے اور چونکہ یہ خرچ ملک کے مستقبل کی تعمیر میں لگایا جاتا ہے۔ اس لئے اس خرچ سے زیادہ اہمیت کسی اور مد کو نہیں دی جا سکتی۔ لیکن ہر معائنہ ہمیں یہی بتلاتا ہے کہ حکومت کے پاس اس اہم ترین مد کے لئے وہ رقم نہیں ہے جس کی اس کو ضرورت ہے۔ کیا تعجب خیز بات نہیں ہے کہ ملک کا [illegible] ترقی دکھلاتا ہوا اور تعلیم کے جیسے اہم شعبہ کیلئے ضرورت کے موافق رقم مختص نہ کی جا سکے۔ رقمی گنجائش کے بعد دوسری اہم کوتاہی قومی تعمیر کے نقطۂ نظر سے اعلیٰ تعلیم کی منصوبہ بندی میں نظر آتی ہے۔ جب تک دو چیزیں حکومت کے منصوبوں میں شامل نہ ہوں۔ اعلیٰ تعلیم کا فرسودہ معیار مستحکم نہیں ہو سکتا۔ ایک یہ کہ ملک کی ہر ضرورت کے لئے صحیح فردی و ذہنی تربیت کا انتظام جو تعداد کے لحاظ سے کافی ہو دوسرا اس انتظام کے ساتھ ساتھ نظم و نسق میں ایسی تبدیلیاں جو اعلیٰ تعلیم پانے والوں کے لئے مستقبل کو درخشاں بنا دیں۔ ان دونوں امور میں ہم کوئی ایسی حرکت حکومت کی جانب سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔ جو تقاضائے وقت کو پورا کر سکتی ہو۔ ماہرین تعلیم اور وہ ذمہ دار

[illegible]

امداد کی طرف نہ توجہ ہے نہ حالات کے لحاظ سے مستقبل قریب میں اس طرف توجہ کی امید پیدا ہوتی ہے۔

اس وقت حکومت کو اس فرض کی ادائی کے لیے ایک جرأت آزمانہ قدم بڑھائے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ پنج سالہ منصوبہ شروع ہو رہا ہے اس کے لئے تربیت یافتہ ماہرین کی ضرورت ہے حکومت اور زندگی کے ہر شعبہ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی کمی ہے اور اگر جلد از جلد ان کی تکمیل کی طرف توجہ نہ ہو تو مشرق وسطیٰ کے اور ممالک کی طرح ہم بھی اپنی صنعتوں میں دوسروں کے محتاج ہو کر معاشی غلامی کا شکار ہو جائیں گے۔

دارالحکومت میں حکومت کی جانب سے پالی ٹکنیکل کالج، طبیہ کالج، سائنس کالج کی شدید ضرورت ہے۔ ضرورت اور تعداد کے لحاظ سے ایک سے زیادہ ہر فن کے معیاری کالج قائم کیے جائیں۔ ساتھ ہی طلبا کی امداد فیسوں میں کمی اور اعلیٰ قابلیت کے استادوں کے مشاہروں میں معقول اضافہ ضروری ہے جن کے بغیر ایسا منصوبہ بار آور نہیں ہو سکتا۔ ہم جانتے ہیں کہ ان منصوبوں کی تکمیل میں حکومت کو بہت زیادہ زیر بار ہونا پڑے گا لیکن ایک مملکت کے لئے یہی زیر باری اور جرأت سے اس کی ذمہ داریوں کو قبول کرنا ہی مستقبل کی کی درخشانی کا ضامن ہوتا ہے۔

ہم نے سنا ہے کہ مرکزی حکومت اس طرف متوجہ ہے اور قریب میں اہم تبدیلیاں ہونے والی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہے کہ ابھی ٹیکنیشنوں کے انتخاب سے ملک کی تعلیمی حالت بہتر ہو سکے۔

---

۴۸ ہفتوں کا سال

لندن ۳۰ اکتوبر۔ برک شائر کونسل کے مکانوں کے کرایہ دار چھٹیوں کے زمانہ میں کرایہ دینے میں ہمیشہ پیچھے رہ جاتے ہیں اب کونسل کا ادارہ ایک منصوبہ بنا رہا ہے تاکہ انہیں سال میں صرف ۴۸ ہفتوں کا کرایہ دینا پڑے۔ اس کی رو سے کسی شخص کو کرسمس اور دوسری چھٹیوں کے موقع پر کرایہ کی ادائیگی کے لئے پریشان نہ ہونا پڑے گا۔ باقی چار ہفتوں کا کرایہ وصول کرنے کے لئے باقی ۴۸ ہفتوں کے کرایہ میں معمولی سا اضافہ کر دیا جائیگا۔

دوسرا منتخب اداریہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

روزنامہ المنتظر کراچی

مدیر: سید ساجد حسین

معاونین مدیر:- اکبر وفا قانی، احمد الدین انجم

یوم چہارشنبہ ۲۷ صفر المظفر ۱۳۷۱ھ م ۲۸ نومبر ۱۹۵۱ء عیسوی!!

بس ٹرانسپورٹ کو قومی بنایا جائے

[illegible]

[illegible]

کی حالت نہایت ابتر ہے۔

کراچی کے دور دراز فاصلوں کو طے کرنے کے لئے اہل شہر ان بسوں کے سوائے کوئی اور تیز رفتار ذریعہ نہیں رکھتے اور پوری آبادی انھیں کے رحم و کرم پر ہے لیکن اوقات کا عدم تعین مقامات پر ٹھہرنے اور چلانے میں بے ضابطگی، کرایہ میں عدم موافقت اور مالکان کمپنی کا اپنے کنڈکٹروں اور ڈرائیوروں کو کمیشن کی لالچ دے کر مسابقت اور تیز رفتاری پر مجبور کرنا زیادہ مسافروں کو حاصل کرنے اور زیادہ سے زیادہ دوڑ لگانے کے جنون میں معینہ مقام سے پہلے ہی بس کو روک دینا یا منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی بس کو واپس کر لینا کر مسافروں کو دیگر [illegible] راہ میں دوسری بسوں میں منتقل کرنے کی کوشش ایسی چیزیں ہیں جن سے اہل شہر سخت پریشان ہیں۔

خود پولیس ٹریفک کے انتظامات میں ان حالات سے دوچار ہے۔ حادثات کی کثرت اور بس کمپنیوں کی بے اعتدالیوں کو روکنا ان کے بس سے بھی باہر ہے بعض امور پر تو پولیس کا دسترس ہی نہیں ہے۔ اجازت ناموں کو دینا اور ان کو خاص شرائط کا پابند بنانا محکمہ نظم و نسق کا کام ہے یہی وجہ ہے کہ جہاں اچھی قسم کی بسیں موجود ہیں وہاں بدترین قسم کے ناکارہ چھکڑے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

بس کمپنیاں اس وقت سب سے زیادہ ذریعہ آمدنی ہیں اور سرمایہ دار اس سے کافی سے زیادہ فائدہ اٹھا رہے ہیں لیکن چند مستثنیات کو چھوڑ کر باقی تمام کمپنیاں صرف ایک ہی فکر میں لگی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ منفعت حاصل کی جائے۔ ان کو اس سے کوئی تعلق نہیں کہ آیا کمپنی پبلک کی خدمت کر بھی رہی ہے یا نہیں اسی کی وجہ سے وہ نہ صرف عوام سے روپیہ گھسیٹ رہے ہیں بلکہ جن لوگوں کی محنت کی وجہ سے روپیہ پیدا کر رہے ہیں ان کو بھی نہایت قلیل تنخواہیں دے رہے ہیں۔ نتیجتاً کنڈکٹر، ڈرائیور، انسپکٹر سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور سب کے پیش نظر یہ ہے کہ کسی طرح مالک کی آمدنی میں اضافہ کریں تاکہ ان کو بھی کچھ کمیشن حاصل ہو۔

ان حالات پر قابو پانے کیلئے صرف ایک ہی تجویز ہو سکتی ہے کہ حکومت انفرادی سرمایہ داروں کے چنگل سے اہل شہر کو نجات دلائے اور بسوں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے۔ موجودہ حالت میں جتنی کمپنیاں ہیں ان کو ایک سنڈیکیٹ کے تحت لایا جائے اور ہر کمپنی کی بسوں کی قیمتوں کا تعین کر کے اس رقم کی حد تک اس کمپنی کو سنڈیکیٹ کے منافع کا حصہ دار بنایا جائے۔ موجودہ ملازمین کو بحال رکھا جائے۔ کو کہ آئندہ ایسے اضافے کئے جائیں کہ ہر راستہ پر جتنی بسوں کی واقعی ضرورت ہے ان کا تعین کر کے بسوں کو پابندی اوقات کے ساتھ چلایا جانے کا انتظام کیا جائے۔ کنڈکٹر اور ڈرائیور کی موجودہ تنخواہوں پر شہر کی گرانی خوراک زندگی کے پیش نظر نظرثانی کی جائے۔ پراویڈنٹ فنڈ اور بونس مقرر کیا جائے ہر ڈرائیور اور کنڈکٹر کی جان کا بیمہ کرایا جائے۔ اس طرح بس ٹریفک میں یکسانیت اور نظم و ضبط پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی اصلاحات کے بعد سنڈیکیٹ کے حصہ داروں کو موجودہ صورت میں جو آمدنی ہے اس سے کم ہرگز نہ

کرنا پڑے گا۔ لیکن انتظام کی مشکلات سے نمٹ کر ان کو یہ آمدنی نصیب ہوگی۔

سنڈیکیٹ کا قیام گویا پہلا قدم ہوگا۔ بس تمام موٹروں کو بنانے کے لئے ہم نے یہ تجویز بہت سی عملی مشکلات کو دیکھ کر حکومت کے سامنے پیش کی ہے۔ اس ابتدائی مرحلہ کو کامیاب طریقہ سے سر انجام دینے کے بعد دوسرا قدم یہ ہوگا کہ اس تمام سرکاری سنڈیکیٹ کو مکمل سرکاری انتظام کے تحت لے لیا جائے۔ اس طرح ایک ایسی اصلاح کی داغ بیل پڑ سکے گی۔ جو حقیقی معنوں میں مفید ہوگی۔

ہم حکومت سے پھر اپیل کرتے ہیں کہ وہ اہل کراچی کی موجودہ مشکلات کو دور کرنے کی طرف پہلا قدم اٹھائے اور بس کمپنیوں کو قومی بنانے میں عجلت سے کام لے۔

پاکستان کی بدیسی کمپنیاں!

ہمارے ایک معزز معاصر نے کل اپنے مراسلات میں ایک پاکستانی کا خط شائع کیا ہے۔ جس میں کراچی کے ایک یورپین کمپنی کے اس اشتہار پر توجہ دلائی گئی ہے جو بمبئی کے ٹائمز آف انڈیا میں شائع ہوا ہے۔ اس اشتہار میں ایک یورپین کمپنی نے اعلان کیا ہے کہ ان کے پاس چند آسامیاں خالی ہیں۔ جن پر صرف پارسی کرسچین اور اینگلو انڈین امیدوار درخواست کر سکتے ہیں۔

اس مراسلت میں حکومت کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی گئی ہے کہ پاکستان کی یورپین کمپنی کا یہ عمل کھلا نہ صرف مسلمانوں کو اپنی کمپنی میں لینے سے انکار کر رہی ہے۔ بلکہ پاکستان میں جہاں پہلے ہی سے بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ غیر پاکستانیوں کو مدعو کیا جا رہا ہے۔ موجودہ سیاسی فضا میں غیر پاکستانیوں کا یورپین کمپنیوں کے سایۂ عاطفت میں رہنا سیاسی لحاظ سے بھی بہت سے خطرات کا حامل ہے۔

اس مراسلے کے متعلق معزز معاصر نے ایک اداریہ بھی شائع کر کے پر زور اپیل کی ہے کہ حکومت پاکستان اہل پاکستان کے حقوق کی حفاظت اور پاکستان کے اندرونی دفاع کی طرف متوجہ ہو اور ان یورپین کمپنیوں کو مخالف پاکستان روش سے باز رکھے۔

ہماری نظر میں یہ مسئلہ کسی ایک یورپین کمپنی کا نہیں ہے بلکہ جتنی یورپین اور امریکی کمپنیاں پاکستان میں اس وقت اپنی تجارت کے مراعات حاصل کر رہی ہیں ان سب کا طرز عمل پاکستانیوں اور خاص طور پر مسلمانوں کے خلاف بڑی حد تک مخالفانہ رہا ہے۔

یورپین کمپنیوں کا یہ عام شعار ہے کہ ایک ہی خدمت کے لئے ایک یورپین اور اینگلو انڈین کی جو تنخواہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں کچھ کم کرسچین کو دیا جائے اور اسی جگہ پر ایک پاکستانی کو نسبتاً کم مشاہرہ پر لیا جائے۔ اس کے علاوہ پاکستانیوں کے ساتھ یورپین کمپنیوں کا عام برتاؤ اب بھی بہت سخت اور معاندانہ ہے۔ حکومت کی بار بار اس بارہ میں اخبارات نے توجہ دلائی ہے۔ لیکن ہمیں حیرت ہے کہ آج تک کوئی عملی اصلاح نہ ہو سکی۔

تیسرا منتخب اداریہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روزنامہ

المنتظر کراچی

مدیر: سید ساجد حسین ★ معاون مدیر: باقر رضوی

یوم پنجشنبہ یکم محرم الحرام ۱۳۷۱ھ

غریب اردو

بھارت نے اپنے ملک سے اردو کو منظم طور پر ختم کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ بھارت پارلیمان نے ہندی کو قومی زبان بنایا اور اپنے دستور میں علاقائی زبان کی حفاظت کا یقین دلایا ہے۔ بھولے مسلمان یہ سمجھنے لگے تھے کہ دستور کی اس گنجائش سے کم از کم یو۔ پی۔ اور حیدرآباد میں اردو علاقائی زبان بن کر قائم رہے گی۔ لیکن کچھ وقت بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ اردو کی وہ واحد جامعہ جس نے تیس سال سے اردو کو علوم و فنون کا ذریعہ بنا کر یہ ثابت کیا تھا کہ اردو برصغیر ہند میں ایک زبان ایسی ہے جو انگریزی کی جگہ پر ہر علم کی ابتدائی تعلیم دینے کی طاقت رکھتی ہے بھارت کی مسلم دشمنی سے ختم کر دی گئی۔ پہلے جامعہ عثمانیہ کے ذریعہ تعلیم کو انگریزی کیا گیا تھا۔ اور اب قانوناً جامعہ عثمانیہ کے ذریعہ تعلیم کو ہندی، مرہٹی، کنڑی اور تلنگی قرار دیا گیا ہے۔ جمعیت العلماء حیدرآباد نے سخت احتجاج کیا لیکن اس کی آواز صدا بصحرا ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد اس صوبے پر دست درازی کی گئی جہاں کی اکثریت کی زبان اردو ہے۔ یو۔ پی کی اسمبلی نے باوجود احتجاج کے اردو کو علاقائی زبان قرار دینے سے بھی انکار کیا اور اب ہندی کو یو۔ پی کی سرکاری زبان کی حیثیت سے قانوناً مان لیا گیا۔ پنڈت پنتھ وزیر اعلیٰ یو۔ پی نے تو یہاں تک جسارت کی کہ انھوں نے اردو کو یو۔ پی کی زبان بھی ماننے سے انکار کر دیا۔ حال ہی میں بمبئی کی مقننہ نے بھی ہندی کو سرکاری زبان قرار دینے کی کوشش شروع کر دی گئی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب کہ تمام بھارت کے صوبوں میں ہندی سرکاری زبان تسلیم کر لی جائے گی اور سوا اردو کے بھارت کی ہر زبان کو علاقائی زبان کی حیثیت سے مان لیا جائے گا۔ اب بھارت کے ۴ کروڑ مسلمان جن کی مادری زبان اردو ہے ابتدائی تعلیم علاقائی زبان میں پائیں گے۔ اور اعلیٰ تعلیم ہندی زبان میں حاصل کریں گے۔ اردو کے سوائے باقی بھارتی زبانیں تہذیباً ہندومت کی روایات سے معمور ہیں اس لئے صرف ایک ربع صدی میں بھارت کے مسلمان صرف نام کے مسلمان رہ جائیں گے۔ مسلم تہذیب اور ثقافت کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا۔ اور اگر جیسا کہ رجحان ہے آئندہ چل کر انتہا پسند ہندو سیاسی طبقوں کا غلبہ ہوا تو ہندی کے ذریعہ یہ ظاہری اسلامی علامات بھی مٹا دی جاکر ۴ کروڑ کی اقلیت کو اکثریت میں ضم کر لیا جائے گا۔

بھارت کے ان مسلم کش اعمال کے مقابلہ

ہیں پنڈت جواہر لال نہرو کی حالیہ تقریر کو جب ہم دیکھتے ہیں تو پنڈت جی کی موشگافیوں پر جہاں حیرت بھی ہوتی ہے اور رنج بھی۔ پنڈت جی فرماتے ہیں کہ "اردو یوپی، اور دلی کی زبان ہے یہ پاکستانی زبان نہیں ہے۔ پاکستانی تو اسے اردو بول بھی نہیں سکتا اس لئے ہم اس زبان کو پاکستان کے حوالے نہیں کر سکتے۔" بجا ارشاد ہے، آپ کے پنڈت پنتھ تو اردو کو یوپی اور دلی کی زبان بھی نہیں مانتے، اور یوپی، کی مقننہ نے تو اس کو آپ کی نظروں کے سامنے ختم ہی کر دیا ہے لیکن آپ اس چیز کو جو اپنی نظروں میں جو عملاً ختم ہو چکی ہے پاکستان بھیجنا نہیں چاہتے۔ محض اس لئے ایسا ہو رہا ہے کہ برصغیر ہند کی یہ واحد زبان ہے جو دور جدید کے ترقی یافتہ زبانوں کا کامیاب مقابلہ کر سکتی ہے۔ آپ اس زبان کو اس لئے پاکستان کو نہیں دینا چاہتے کہ صرف اسی زبان کو یہ قدرت حاصل ہے کہ ملت اسلامیہ پاکستان کو متحد، منظم اور ترقی یافتہ بنا دے۔ آپ اس زبان کو پاکستان اس لئے بھیجنا نہیں چاہتے کہ اس نے صرف اسی زبان نے اعلیٰ تعلیم کو جس برس تک برصغیر ہند میں پھیلانے کا امتیاز حاصل کیا ہے اور اب اگر یہ زبان انگریزی کی جگہ لے کر اپنی صلاحیتوں کو پاکستان کے لئے صرف کرے گی تو اس کے مقابلے میں باوجود بھارت کی لامحدود دولت کے ہندی کے قدم نہ جم سکیں گے۔ پنڈت جی دراصل اپنی اردو دشمنی کا اظہار محض اس لئے کر رہے ہیں کہ اس لاوارث زبان کو بھارت اسی طرح ختم کر دے جس طرح ۴ کروڑ مسلمانوں کو سیاسی اور معاشی شکنجوں میں کس کے وہ ختم کر رہا ہے اور اس خطرے کو آج ہی سے وہ روکنا چاہتے ہیں کہ کہیں طائر اردو بھارت کے قفس سے اڑ کر پاکستان کے چمنستان میں آباد نہ ہو جائے۔

پنڈت جی یا پنتھ جی، ٹنڈن یا ساورکر اردو کے متعلق جو کچھ بھی دشمنی کر رہے ہیں وہ ہمارے لئے اس قدر تکلیف دہ نہیں ہے جس قدر اردو کے ساتھ خود پاکستان میں بے اعتنائی اور بے توجہی برتی جا رہی ہے۔ قائد اعظم علیہ الرحمۃ نے بارہا اپنے ارشادات میں پاکستان کی اردو کی حیثیت کے متعلق فرمایا تھا کہ یہ ملت پاکستان کی زبان ہے لیکن آج اس مرد اعظم کو دنیا سے رخصت ہوئے تین سال گزر گئے۔ پاکستان نے ایک قدم بھی اردو کی اس حیثیت کو قائم کرنے کے لئے نہیں اٹھایا۔ یوں انفرادی طور پر ناکام کوششیں جاری ہیں۔ سردار عبدالرب نشتر نے پنجاب میں اردو کو دفاتر کی سرکاری زبان قرار دیا۔ سابق ایڈمنسٹریٹر ہاشم رضا صاحب کی کوششوں سے کراچی کے بعض دفاتر میں اردو کو رواج دینے کی کوشش کی گئی۔ کراچی کی پولیس میں اردو کو دفتری زبان قرار دیا گیا۔ لیکن خود کراچی ہی میں یہ کوشش بار آور نہ ہو سکی۔ اور تنگ نظری اور ناعاقبت اندیشی نے اس کو آگے بڑھنے نہیں دیا۔

اصل مصیبت کیا ہے؟ انگریز چلے گئے لیکن انگریزیت بھوت کی طرح ہمارے سروں پر سوار ہے۔ اور ارباب حل و عقد یہ سمجھتے ہیں تاہم ہے کہ پاکستان کی سالمیت کے لئے کسی ایک زبان کا ملی زبان کی حیثیت سے قبول کرنا ضروری ہے۔ پاکستان کے پانچوں صوبوں کا اتحاد اور اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک ملی زبان کا وجود ہماری اجتماعی سکھ کے لئے ناگزیر ہے۔ یہ تو کوئی کہہ نہیں سکتا کہ انگریزی کو پاکستان میں لنگوا فرینکا (مشترکہ زبان) کی حیثیت دی جائے گی اور نہ یہ کہنے کی کسی میں جرأت ہے کہ اردو کے سوا کوئی اور زبان یہ حیثیت حاصل کر سکتی ہے۔ ڈر صرف اس قدر ہے کہ کہیں اردو زبان کی لامحدود وسعتیں پاکستان کے بچے

طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کا موقع نہ دے اور وہ ابھر کر جوہر اقتدار سنبھالنے کی قابلیت نہ پیدا کرے۔

خود پاکستان کے متعلق پنڈت جی کا یہ کہنا کہ یہاں کا باشندہ اردو بول نہیں سکتا۔ یہ یا تو ان کی لاعلمی کی بات ہے یا جان بوجھ کر حقائق سے چشم پوشی کر لی گئی ہے۔ اس وقت دہلی کا ہندو پریس اردو ہی میں کام کر رہا ہے۔ لاہور اور مغربی پنجاب کے ہندو صحافیوں کے ہاتھ میں ہے۔ مشرقی پنجاب میں پنجابی کے علاوہ جو زبان عام ہے وہ اردو ہے۔ پنڈت جی خوب جانتے ہیں کہ صحافت اور اردو طباعت کا تقسیم سے قبل بھی لاہور مرکز رہا ہے پنڈت جی یہ بھی جانتے ہیں کہ پنجاب اور سندھ اس امر کے دعویدار ہیں کہ اردو زبان ان کے صوبوں ہی میں پیدا ہوا ہے۔ ان کو ان کے سندھی دوستوں نے بتلایا ہوگا کہ آج بھی سندھی زبان اسی رسم الخط کی پابند ہے۔ جس رسم الخط کو اردو نے اختیار کیا ہے۔ پنڈت جی اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ کشمیر وزیرستان سے پاکستان کے عام لوگ اپنی زبان کے علاوہ اردو زبان میں اپنے اظہار خیال پر قادر ہیں۔ ایسی صورت میں پنڈت جی کا قول محض ایک مبالغہ آمیز بے حقیقت بات کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

بھارت کی موجودہ اردو دشمنی کے مقابلہ میں پاکستان کا کیا فرض ہونا چاہئے۔ اگر پاکستان کو واقعی اپنے مستقبل کو بنانا ہے تو سب سے پہلے آئندہ پارلیمان میں اردو کو سرکاری زبان قرار دینا چاہئے اور قانوناً اس کی حیثیت کو مستحکم کرنا ہوگا۔ اس کے بعد دفاتر میں اردو ہی کا رواج انفرادی کوششوں سے نہیں بلکہ قانون کے توسط سے ہونا چاہئے اور پاکستان کی تمام جامعات میں اعلیٰ تعلیم کے لئے اسی زبان کو رفتہ رفتہ ذریعۂ تعلیم قرار دینا چاہئے۔ پنجاب اور کراچی کی وفاقی جامعہ میں آج ہی سے اس کو مروج کیا جا سکتا ہے اردو جو مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی صدیوں محافظ رہی ہے۔ بغیر پرعزم اقدامات کے اب زندہ نہیں رہ سکتی اور اگر اب اس کے ساتھ بھی تغافل روا رکھا جائے تو اردو کی تباہی کی ذمہ داری بھارت سے زیادہ ہم اور ہماری حکومت پر ہوگی

کلامِ ترابی سے چند مقبول اشعار

کس کی عطا ہے کس کی یہ دولت دی ہوئی
آیا جہاں اندھیرا وہیں روشنی ہوئی
جن کو خزاں میں صبر و سکوں سے ملا قرار
آئی بہار اُن کا پتہ پوچھتی ہوئی

تلخ گھونٹ اس مئے عشرت کا گوارا کب تھا
یہ بھی منظور تھا ساقی کا اشارہ کب تھا
نزاع میں آنے کا احسان جتانے والے
ہاں کسی غیر کو میں نے بھی پکارا کب تھا

وہ جو اک قطرہ ہے پانی کا ہوا سے خالی
دلِ دریا میں ہے اور فکرِ فنا سے خالی

ہے باغباں کی یہی مصلحت تو حیرت ہے
جلا ہے میرا نشیمن تو سب کا سب نہ جلے

نگاہِ لطف تھی مجھ پر تو بزم میں یہ کہا
یہ اک چراغ زیادہ جلا ہے اب نہ جلے

ہوائے دوست میں فکرِ صراط کیا کرتے
زمیں پہ پاؤں نہ تھے احتیاط کیا کرتے

شراب نام ہے خود ساختہ تغافل کا
خرد کو آگ لگی تھی، نشاط کیا کرتے

پھر اس کو غرض کیا ہے بہارِ گزراں سے
جس پھول کی تکمیل ہوئی زخمِ خزاں سے

کیا جانئے کیا حشر ہو گلشن کا سحر تک
اچھا ہے سرِ شام نکل جاؤں یہاں سے

نظر شناس رفیقوں کا ساتھ جب چھوٹا
چمن کا ذکر جو کرتے تھے روز شب چھوٹا

ہمارے اور بھی ساتھی تو اس قفس میں تھے
ذرا سی دیر کو سوچو کہ کون کب چھوٹا

زمانہ ساز جو یہ پیرہن پہن کے چلے
نمی ہوا میں جو آئی تو رنگ سب چھوٹا

ہم منکرِ تسلیم تھے آغازِ سفر میں
انجام غریبی، وہی تسلیم، وہی ہم
صحرا کے بگولے کی یہ گردش بھی ہے آوازِ
اور اس کو سمجھتے رہے بے راہروی ہم

قتل سے میرے ملا مجھ کو شہادت کا مقام
اور اسی بات سے قاتل مرا محسن بن جائے

کیا سحر تک کوئی جلنے کی تمنا کرتا
بجھتے دیکھے ہیں اسی دل نے سرِ شام چراغ
کارواں جاتا ہے صبح ہوئی چونک رشید
اب کہیں اور جلا جا کے سرِ شام چراغ

ہر انسان ایک قصہ ہے ترا بیاں کیا سنے کوئی
سلیقے کی کہانی ہو تو دل مشتاق ہوتا ہے

اپنی اضافتوں سے ہے کچھ تازگی رشید
انسان سن رہا ہے کہانی سنی ہوئی

رشید شمع کے بجھتے ہی یہ بھی ممکن ہے
بہت قریب جو آیا تھا اجنبی ہو جائے

کچھ اندھیرا ہٹے تو حال کھلے
ہے یہی تو چراغ کا مصرف

ہر آن خوشی کی جستجو میں
غم سے غم کا مقابلہ ہے
اے رسمِ حیات تھک گیا ہوں
اب کتنے نفس کا فاصلہ ہے

کیا دورِ ستم آیا رہا دہر بدل کر
سمجھے تھے کہ آرام سے ہیں شہر بدل کر
افکار سے ہشیار کریہ وقت یہ موجیں
پیغام بدل دیتی ہیں خود لہجہ بدل کر
کس کس سے رہیں دور تو کس قرب کو ڈھونڈیں
دیتے ہیں محبت میں یہاں زہر بدل کر

درد اندازۂ درماں سے سوا ہوتا ہے
اے وہ عقل جو نرغے میں ہو ناداروں کے
پردۂ رونقِ بازار الٹ کر دیکھو
حسرتیں دوڑتی ہیں بھیس میں انسانوں کے

مولائے کائنات حضرت علیؑ کا خط۔ مالکِ اشتر کے نام

عربی سے۔ جس کا انگریزی ترجمہ علامہ رشید ترابی نے کیا

(نوٹ) انگریزی ترجمہ اگرچہ الٹے ہاتھ سے شروع ہونا چاہیے تھا لیکن امید ہے کہ قارئین اکرام اس اردو کتاب کی ترتیب اور نمبر شمار کا خیال کرتے ہوئے اردو صفحات نمبروں کو ملحوظ رکھ کر زیر نظر ترجمہ مطالعہ فرمائیں گے۔ شکریہ

CONTENTS

Dos and Don'ts for SUCCESSFUL ADMINISTRATION

HAZRAT ALI'S

famous epistle to

MALIK ASHTAR

Governor of Egypt

A GREAT HISTORIC DOCUMENT

translated from Arabic

by

ALLAMA RASHEED TURABI

I have given below a translation from Arabic into English of Hazarat Ali' famous letter of instructions addressed as Khalif to the then Governor of Egypt Malik Ashtar. This letter according to Fehrist-i-Tusi (p. 33) was first copied in the time of Hazrat Ali himself by Asbagh bin Nabata and later on reproduced or referred to in their writings by various Arab and Egyptian scholars, chief of them being Nasr Ibin Mazahim (148 A.H.), Jahiz Basari (255 A.H.) Syed Razi (404 A.H.) Ibn-i-Abil Hidaid (655 A.H.) and Ibn-i-Abduh the reformer of Egypt, and Allama Mustafa Bek Najib, the great living scholar of Egypt. The last named regards this letter "as a basic guide in Islamic adminstration."

Rasheed Turabi

19/20, Federal 'B' Area
KARACHI-38

Note by the Translator

Hazrat Ali, the Great Khalif o Islam and the first in the line of Imamate apart from his abiding contribution to spiritual thought, is known to the Arabi world as a great jurist and man of letters According to the historian Masudi (Murooj uz-Zahab Masudi Vol. II, p. 33. Egypt) Hazrat Ali is credited with not less than 480 treaties, lectures and epistles on a variety of subjects dealing with philosophy religion, law and politics, as collected by Zaid Ibn Wahab in the Imam's own life time. So highly valued are the contributions both for their intrinsic literary worth that some of his master-pieces have formed throughout the course of Islamic history subjects of study in centres of Muslim learning. Indeed, his reputation seems to have travelled into Europe at the time of the Renaissance; for, we find that Edward Powcock, (1604-1691) a professor at the University of Oxford published the first English translation of his 'Sayings' and delivered in 1639 a series of lectures on his "Rhetoric."

THE RICHEST TREASURE

Be it known to you, O, Malik' that I am sending you as Governor to a country which in the past experienced both just and unjust rule. Men will scrutinize your action with searching eye, even as you used to scrutinize the actions of those before you, and speak of you even as you did speak of them. The fact is that the public speak well of only those who do good. It is they who furnish the proof of your actions. Hence the richest treasure that you may covet should be the treasure of good deeds. Keep your desires under control and deny yourself that which you have been prohibited from, for, by such abstinance alone, you will be able to distinguish between what is good to them and what is not.

Develop in your heart the feeling of love for your people and let it be the source of kindliness and blessing to them. Do not behave with them like a barbarian, and do not

appropriate to yourself that which belongs to them. Remember that the citizens of the state are of two categories. They are either your brethern in religion or your brethern in kind. They are subject to infirmities and liable to commit mistakes. Some indeed do commit mistakes. But forgive them even as you would like God to forgive you. Bear in mind that you are placed over them, even as I am placed over you. And then there is God even above him who has given you the position of a Governor in order that you may look efter those under you and to be sufficient unto them. And you will be judged by what you do for them.

Do not set yourself against God, for neither do you possess the strength to shield yourself against His displeasure, nor can you place yourself outside the pale of His mercy and forgiveness. Do not feel *sorry over* any act of forgiveness, nor rejoice over any punishment that you may mete out to any one. Do not rouse yourself to anger, for no good will come out of it.

Do not say: "I am your overlord and dictator, and that you should, therefore, bow to my commands", as that will corrupt your heart, weaken your faith in religion and create disorder in the state. Should you be elated by power, ever feel in your mind the slighest symptoms of pride and arrogance, then look at the power and majesty of the Divine governance of the Universe over which you have absolutely no control. It will restore the sense of balance to your wavered intelligence and give you the sense of calmness and affability. Beware! Never put yourself against the majesty and grandeur of God and never imitate His omnipotence; for God has brought low every rebel of God and every tyrant of man.

Let your mind respect through your actions the rights of God and the rights of man, and like wise, pursuade your companions and relations to do likewise. For, otherwise, you will be doing injustice to yourself and injustice to humanity. Thus both man and God will turn unto your enemies There is no hearing anywhere for one who makes an

enemy of God himself. He will be regarded as one at war with God until he feels contrition and seeks forgiveness. Nothing deprives man of divine blessings or excites divine wrath against him more easily than cruelty. Hence it is, that God listens to the voice of the oppressed and waylays the oppressor."

THE COMMON MAN

Maintain justice in administration and impose it on your own self and seek the consent of the people, for, the discontent of the masses sterilises the contentment of the privileged few and the discontent of the few looses itself in the contentment of the many. Remember, the privileged few will not rally round you in moments of difficulty: they will try to side-track justice, they will ask for more than what they deserve and will show no gratitude for favours done to them. They will feel restive in the face of trials and will offer no regret for their short-comings. It is the common man who is the strength of the State and of Religion. It is he who fights the enemy. So live in close contact with the

masses and be mindful of their welfare.

Keep at a distance him who peers into the weaknesses of others. After all, the masses are not free from weakneisses. It is the duty of the ruler to shield them. Do not bring to light that which is hidden, but try to remove those weaknesses which have been brought to light. God is watchful of everything that is hidden from you, and He alone will deal with it. To the best of your ability cover the weaknesses of the public, and God will cover the weaknesses in you which you are anxious to keep away from their eyes. Unloose the tangle of mutual hatred between the public and the administration and remove all those causes which may give rise to strained relations between them. Protect yourself from every such act as may not be quite correct for you. Do not make haste in seeking confirmation of tale-telling, for the tale-teller is a deceitful person appearing in the garb of a friend.

THE COUNSELLORS

Never take counsel of a miser, for, he will vitiate your magnanimity and frighten you

of poverty. Do not take counsel of a coward also, for, he will cheat you of your resolves. Do not take counsel of the greedy too : for he will instill greed in you and turn you into a tyrant. Miserliness, cowardice and greed dep-rive man of his trust in God.

The worst of counsellors is he who has served as a counsellor to unjust rulers and shared their crimes. So, never let men who have been companions of tyrants or shared their crimes be your counsellors. You can get better men than these, men gifted with intelligence and foresight, but unpolluted by sin, men who have never aided a tyrant in his tyranny or a criminal in his crime. Such men will never be a burden on you. On the other hand, they will be a source of help and strength to you at all times. They will be friends to you and strangers to your enemies. Choose such men alone for companionship both in privacy and in the public. Even among these, show preference to them who have a habitual regard for truth however trying to you at times their truth may prove to be, and who offer you no encourage-

ment in the display of tendencies which God does not like his friends to develop.

Keep close to you the upright and the God-fearing, and make clear to them that they are never to flatter you and never to give you credit for any good that you may not have done: for, the tolerance of flattery and unhealthy praise stimulates pride in man and makes him arrogant.

Do not treat good and the bad alike. That will deter the good from doing good, and encourage the bad in their bad pursuits. Recompence every one according to one's deserts. Remember that mutual trust and good will between the ruler and the ruled are bred only through benevolence, justice and service. So, cultivate good-will amongst the people; for, their good-will alone will save you from troubles. Your benevolence to them will be repaid by their trust in you, and your ill-treatment by their ill-will.

Do not disregard the noble traditions set by our forbearers which have promoted

harmony and progress among the people; and do not initiate anything which might minimise their usefullness. The men who had established those noble traditions have had their reward; but responsibility will be yours if they are disturbed. Try always to learn something from the experience of the learned and the wise, and frequently consult them in state matters so that you might maintain the peace and good-will which your predecessors had established in the land.

THE DIFFERENT CLASSES OF PEOPLE

Remember that the people are composed of different classes. The progress of one is dependent on the progress of every other; and none can afford to be independent of the other. We have the Army formed of the soldiers of God, we have our civil officers and their establishments, our judiciary, our revenue collectors and our public relation officers. The general public itself consists of Muslims and Zimmis and among them of merchants and craftsmen, the unemployed and the indigent. God has prescribed

for them their several rights, duties and obligations. They are all defined and preserved in the Book of God and in the traditions of his Prophet.

The Army, by the grace of God, is like a fortress to the people and lends dignity to the state. It upholds the prestige of the Faith and maintains the peace of the country. Without it the state cannot stand. In its turn, it cannot stand without the support of the state. Our soldiers have proved strong before the enemy because of the privilege God has given them to fight for Him; but they have their material needs to fulfil and have therefore to depend upon the income provided for them from the state revenue. The military and the civil population who pay revenue, both need the co-operation of others—the judiciary, civil officers and their establishment. The Qazi administers civil and criminal law; the civil officers collect revenue and attend to civil administration with the assistance of their establishment. And then there are the tradesmen and the merchants who add to the revenue

of the state. It is they who run the markets and are in a better position than others to discharge social obligations. And then there is the class of the poor and the needy, whose maintenance is an obligation on the other classes. God has given appropriate opportunity of service to one and all; and then there are the rights of all these classes over the administration which the administrator has to meet with an eye on the good of the entire population, a duty which he cannot fulfil properly unless he takes personal interest in its execution and seeks help from God. Indeed, it is obligatory on him to impose this duty on himself, and to bear with patience the inconvenience and difficulties incidental to the task.

THE ARMY

Be particularly mindful of the welfare of those in the army who in your opinion, are staunchly faithful to their God and Prophet and loyal to their chief, and who in the hour of passion can restrain themselves and listen coolly to sensible remonstrance, and who can succour the weak and smite the strong, whom

violent provocation will not throw into violent temper and who will not falter at any stage.

Keep yourself in close contact with families of established reputation and integrity with a glorious past, and draw to yourself men brave and upright in character, generous and benevolent in disposition; for such are the salt of society.

Care for them with the tenderness with which you care for your children, and do not talk before them of any good that you might have done to them, nor disregard any expression of affection which they show in return; for, such conduct inspires loyalty, devotion and goodwill. Attend to every little of their wants not resting content with what general help that you might have given to them, for sometimes, timely attention to a little want of theirs brings them immense relief. Surely these people will not forget you in your own hour of need.

It behoves you to select for you Commander-in-chief one who imposes on himslf, as a duty, the task of rendering help to his men,

and who can excel in kindness every other officer who has to attend to the needs of the men under him, and look after their families when they are away from their homes; so much so, that the entire army should feel united in their joys and in their sorrows. This unity of purpose will give them added strength against the enemy. Continue to maintain a kindly attitude towards them so that they might feel ever attached to you. The fact is that the real happiness of the administrators and their most pleasant comfort lies in establishing justice in the state and maintaining affectionate relations with the ptople. Their sincerity of feeling is expressed in the love and regard they show to you, on which alone depends the safety of the administrators.

Your advices to the army will be of no avail, unless and until you show affection to both men and officers, in order that they might not regard the Government as an oppressive burden or contribute to its downfall.

Continue to satisfy their needs and praise them over and over again for what ser-

vices they have rendered. Such an attitude, God willing, will inspire the brave to braver actions and induce the timid to deeds of bravery.

Try to enter into the feelings of others and do not foist the mistake of one over another and do not grudge dispensing appropriate rewards. See to it you do not show favours to one who has done nothing but merely counts on his family position; and do not withhold proper rewards from one who has done great deeds simply because he holds a low position in life.

THE REAL GUIDANCE

Turn to God and to His Prophet for guidance whenever you feel uncertain as to what you have to do. There is the commandment of God delivered to those people whom He wishes to guide aright: "O people of the Faith! Obey God and obey His prophet and those from among you who hold authority over you. And refer to God and His prophet whenever there is difference of opinion among you." To turn to God is in reality to consult

the book of God; and to turn to the prophet is to follow his universally accepted traditions.

CHIEF JUDGE

Select for your chief judge one from the people who is by far the best among them—one who is not obsessed with domestic worries, one who cannot be intimidated, one who does not err too often, one who does not turn back from a right path once he finds it, one who is not self-centered or avaricious, one who will not decide before knowing full facts, one who will weigh with care every attendent doubt and pronounce a clear verdict after taking everything into full consideration, one who will not grow restive over the arguments of advocates and who will examine with patience every new disclosure of fact and who will be strictly impartial in his decision, one whom flattery cannot mislead or one who does not exult over his position. But it is not easy to find such men.

Once you have selected the right man for the office, pay him handsomely enough, to let him live in comfort and in keeping with his

position, enough to keep him above temptations. Give him a position in your court so high that none can even dream of coveting it and so high that neither back biting nor intrigue can touch him.

SUBORDINATE JUDICIARY

Beware! The utmost carefullness is to be exercised in this selection: for it is this high office which adventurous self-seekers aspire to secure and exploit in their selfish interests. After the selection of your chief judge, give careful consideration to the selection of other officers. Confirm them in their appointments after approved apprenticeship and probation. Never select men for responsible posts either out of any regard for personal connections or under any influence, for, that might lead to injustice and corruption.

Of these, select for higher posts men of experience, men firm in faith and belonging to good families. Such men will not fall an easy prey to temptations and will discharge their duties with an eye on the abiding good of

others. Increase their salaries to give them a contented life. A contented living is a help to self-purification. They will not feel the urge to tax the earnings of their subordinates for their own upkeep. They will then have no excuse either to go against your instructions or misappropriate state funds. Keep to watch over them without their knowledge, loyal and upright men. Perchance they may develop true honesty and true concern for the public welfare. But whenever any of them is accused of dishonesty, and the guilt is confirmed by the report of your secret service, then regard this as sufficient to convict him. Let the punishment be corporal and let that be dealt in the public at an appointed place of degradation.

REVENUE ADMINISTRATION

Great care is to be exercised in revenue administration, to ensure the prosperity of those who pay the revenue to the state; for it it is on their prosperity depends the prosperity of others, particularly the prosperity of the masses. Indeed, the state exists on its revenue. You should regard the proper upkeep of the

land in cultivation as of greater importance than the collection of revenue, for revenue cannot be derived except by making the land productive. He who demands revenue without helping the cultivator to improve his land, inflicts unmerited hardship on the cultivator and ruins the State. The rule of such a person does not last long. If the cultivators ask for reduction of their land cess for having suffered from epidemics or drought or excess of rains or the barrenness of the soil or floods damaging to their crops, then, reduce the cess accordingly, so that their condition might improve. Do not mind the loss of revenue on that account for that will return to you one day manifold in the hour of greater prosperity of the land and enable you to improve the condition of your towns and to raise the prestige of your state. You will be the object of universal praise. The people will believe in your sense of justice. The confidence which they will place in you in consequence will prove your strength, as they will be found ready to share your burdens.

You may settle down on the land any number of people, but discontent will overtake them if the land is not improved. The cause of the cultivator's ruin is the rulers who are bent feverishly on accumulating wealth at all costs, out of the fear that their rule might not last long. Such are the people who do not learn from examples or precedents.

CLERICAL ESTABLISHMENT

Keep an eye on your establishment and your scribes; and select the best among them for your confidential correspondence such among these as possess high character and deserve yaur full confidence, men who may not exploit their privileged position to go against you and who in the drafting of treaties may not succumb to external temptation and harm your interests, or fail to render you proper assistance and to save you from trouble, and who in carrying out their duties can realise their serious responsibilities, for he who does not realise his own responsibilities can hardly appraise the responsibilities of others. Do not

select men for such work merely on the strength of your first impressions of your affection or good faith; for as a matter of fact, the pretensions of a good many who are really devoid of honesty and good breeding may cheat even the intelligence of rulers. Selection should be made after due probation—probation which should be the test of righteousness. In making direct appointments from people, see to it that those selected possess influence with the people and who enjoy the reputation of being honest; for such selection is agreeable both to God and the Ruler. For every department of administration, let there be a head, whom no trying task might cause worry and no pressure of work annoy.

And remember that every weakness of any one among your establishment and scribe which you may overlook will be written down against you in your scroll of deeds.

TRADE AND INDUSTRY

Adopt useful schemes placed before for those engaged in trade and industry and help

them with wise counsels. Some of them live in towns, and some move from place to place with their ware and tools and earn their living by manual labour. Trade and Industry are sources of profit to the State. While the general public is not inclined to bear the strain, those engaged in these professions take the trouble to collect commodities from far and near, from land and from across the sea, and from mountains and forests and naturally derive benefits.

It is this class of peace loving people from whom no disturbance need be feared. They love peace and order; indeed they are incapable of creating disorder. Visit every part of the country and establish personal contact with this class, and enquire into their conditions. But bear in mind that a good many of them are intensely greedy and are inured to bad dealings. They hoard grain and try to sell it at a high price; and this is most harmful to the public. It is a blot on the name of the ruler not to fight this evil. Prevent them from hoarding; for the Prophet of God—

Peace be on him—had prohibited it. And see to it that trade is carried on with the utmost ease, that the scales are evenly held and that prices are so fixed that neither the seller nor the buyer is put to a loss. And if inspite of your warning, should any one go against your commands and commit the crime of hoarding, then deal him appropriately with severe punishment.

THE POOR

Beware! Fear God when dealing with problem of the poor who have none to patronise, who are forlorn, indigent and helpless and are greatly torn in mind—victims to the vicissitudes of Time. Among them there are some who do not question their lot in life and who notwithstanding their misery, do not go about abegging. For God's sake, safeguard their rights; for on you rests the responsibility of protection. Assign for their uplift a portion of the state exchequer (Baitul-mal), wherever they may be, whether close at hand or far away from you. The rights of the two should be equal in your eye. Do not let any preoccupa-

tions slip them from your mind; for no excuse whatsoever for the disregard of their rights will be acceptable to God. Do not treat their interests as of less importance than your own, and never keep them outside the purview of your important considerations, and mark the persons who look down upon them and of whose condition they keep you in ignorance.

Select from among your officers such men as are meek and God-fearing who can keep you properly informed of the condition of the poor. Make such provision for these poor people as shall not oblige you to offer an excuse before God on the day of judgement; for, it is this section of the people more than any other which deserves benevolent treatment. Seek your reward from God by giving to each of them what is due to him and enjoin on yourself as a sacred duty the task of meeting the needs of such aged among them as have no independent means of livelihood and are averse to seek alms. And it is the discharge of this duty that usually proves very trying to rulers, but is very welcome to societies which are gifted

with foresight. It is only such societies or nations who truly carry out with equanimity their covenant with God to discharge their duty to the poor.

OPEN CONFERENCES

Meet the oppressed and the lowly periodically in an open conference and, conscious of the divine presence there, have a heart-to-heart talk with them, and let none from your guard or civil officers or members of the police or the Intelligence Department be by your side, so that the representative of the poor might state their grievances fearlessly and without reserve. For I have heard the Prophet of God saying that "no nation or society will occupy a high position in which the strong do not discharge their duty to the weak." Bear with compsure any strong language which they may use, and do not get annoyed if they cannot state their case lucidly, even so, God will open for you his door of blessings and rewards. Whatever you can give to them, give it ungrudgingly, and whatever you cannot

afford to give, make that clear to them in utmost sincerity.

There are certain things which call for prompt action. Accept the recommendations made by your officers for the redress of the grievances of the clerical staff. See to it that petitions or applications submitted for your consideration are brought to your notice the very day they are submitted, however much your officers might try to intercede them. Dispose off the day's work that very doy, for the coming day will bring with it its own tasks.

COMMUNION WITH GOD

And then do not forget to set apart the best of your time for communion with God, although every moment of yours is for Him only, provided it is spent sincerely in the service of your people. The special time that you give to prayer in the strict religious sense is to be devoted to the performance of the prescribed daily prayers. Keep yourself engaged in these prayers both in the day and in the night, and to gain perfect communion, do not

as far as possible, let your prayers grow tiresome. And when you lead in congregational prayer, do not let your prayer be so lengthy as to cause discomfort to the congregation or raise in them the feeling of dislike for it or liqujdate its effect: for in the congregation there may be invalids and also those who have to attend to pressing affairs of their own.

When I had asked of the Prophet of God on receiving an order to proceed to Yaman, how I should lead the people over there in prayer, he said "perform your prayers even as the weakest among you would do; and set an example of considerateness to the faithful."

ALOOFNESS NOT DESIRABLE

Alongside of the observance of all that I have said above bear one thing in mind. Never for any length of time keep yourself aloof from the people, for to do so is to keep oneself ignorant of their affairs. It develops in the ruler a wrong perspective and renders

him unable to distinguish between what is important and what is not, between right and wrong, and between truth and falsehood. The ruler is after all human; and he cannot form a correct view of anything which is out of sight. There is no distinctive sign attached to truth which may enable one to distinguish between the different varieties of truth and falsehood. The fact is that you must be one of two things. Either you are just or unjust. If you are just, then you will not keep yourself away from the people, but will listen to them and meet their requirements. On the other hand, if you are unjust, the people themselves will keep away from you. What virtue is there in your keeping aloof? At all events aloofness is not desirable specially when it is your duty to attend to the needs of the people. Complaints of oppression by your officers or petitions for justice should not prove irksome to you.

Make this clear to yourself that those immediately about and around you will like to exploit their position to covet what belongs to

others and commit acts of injustice. Suppress such a tendency in them. Make a rule of your conduct never to give even a small piece of land to any of your relations. That will prevent them from causing harm to the interests of others and save you from courting the disapprobation of both God and man.

Deal justice squarley regardless of the fact whether one is a relation or not. If any of your relations or companions violates the law, mete out the punishment prescribed by law however painful it might be to you personally: for it will be all to the good of the State. If at any time people suspect, that you have been unjust to them in any respect disclose your mind to them and remove their suspicions. In this way, your mind will get attuned to the sense of justice and people will begin to love you. It will also fulfil your wish that you should enjoy their confidence.

PEACE AND TREATIES

Bear in mind that you do not throw away the offer of peace which your enemy

may himself make. Accept it, for, that will please God. Peace is a source of comfort to the army; it reduces your worries and promotes order in the State. But Beware! Be on your guard when the peace is signed; for, certain types of enemies propose terms of peace just to lull you into a sense of security only to attack you again when you are off your guard. So you should exercise the utmost vigilence on your part, and place no undue faith in their protestations. But, if under the peace treaty you have accepted any obligations, discharge those obligations scrupulously. It is a trust and must be faithfully upheld and whenever you have promised any thing, keep it with all the strength that you command, for whatever differences of opinion might exit on other matters, there is nothing so noble as the fulfilment of a promise. This is recognised even among the non-muslims, for they know the dire consequences which follow from the breaking of convenants. So never make excuses in discharging your responsibilities and never break a promise; nor cheat your enemy. For breach of promise is an act against God, and

none except the positively wicked acts against God.

Indeed divine promises are a blessing spread over all mankind. The promise of God is a refuge sought after even by the most powerful on earth; for there is no risk of being cheated. So, do not make any promise from which you may afterwards offer excuses to retract; nor do you go back upon what you have confirmed to abide by; nor do you break it, however, galling it may at first prove to be. For, it is far better to wait in patience for wholesome results to follow than to break it out of any apprehensions.

Beware! Abstain from shedding blood without a valid cause. There is nothing more harmful than this which brings about one's ruin. The blood that is wilfully shed shortens the life of a state. On the day of judgement it is the crime for which one will have to answer first. So, beware! Do not wish to build the strength of your state on blood; for, it is this blood which ultimately weakens the

state and passes it on to other hands. Before me and my God no excuse for wilful killing can be entertained.

Murder is a crime which is punishable by death. If on any account the corporal punishment dealt by the state for any lesser crime results in the death of the guilty, let not the prestige of the state stand in any way of the deceased's relations claiming blood money.

LAST INSTRUCTIONS

Do not make haste to do a thing before its time, nor put it off when the right moment arrives. Do not insist on doing a wrong thing, nor show slackness in the rectifying a wrong thing. Perform every thing in its proper time, and let everything occupy its proper place. When the people as a whole agree upon a thing, do not impose your own view on them and do not neglect to discharge the responsibility that rests on you in consequence. For, the eyes of the people will be on you and you are answerable for whatever you do to them. The slightest deriliction of duty will bring its

own retribution. Keep your anger under control and keep your hands and tongue in check. Whenever you fall into anger try to restrain yourself or else you will simply increase your worries.

It is imperative on you to study carefully the principles which have inspired just and good rulers who have gone before you. Give close thought to the example of your prophet (Peace be on him), his traditions, and the commandments of the Book of God and whatever you might have assimilated from my own way of dealing with things. Endeavour to the best of your ability to carry out the instructions which I have given you here and which you have solemnly undertaken to follow. By means of this order, I enjoin on you not to succumb to the promptings of your own heart or turn away from the discharge of the duties entrusted to you.

I seek the refuge of the might of the Almighty and of His limitless sphere of blessings, and invite you to pray with me that He

may give us together the grace willingly to surrender our will to His will, and to enable us to acquit ourselves before Him and His creation; so that mankind might cherish our memory and our work survive. I seek of God the culmination of his blessings and pray that He may grant you and me His grace and the honour of martyrdom in His cause. Verily, we have to return to Him. I invoke His blessing on the Prophet of God and his pure progeny.



میں اور ہمارا خاندان عزیز القدر امیر حسین کا ممنون احسان ہے کہ انہوں نے مرحومہ مہ جبیں ناز (مینا کماری) کی دردناک موت کو "صحافتی فلمی اسکینڈل" بننے سے بچالیا، انہوں نے "مینا کماری میری بھابی" کے عنوان سے میرے انٹرویو کی جو قسطیں چھاپی ہیں وہ میری کتاب زندگی کے ایک اہم باب کی حیثیت رکھتی ہیں

(رئیس امروہوی)

عزیزم امیر حسین صرف نام کے امیر نہیں بلکہ امیر شہر صحافت بھی ہیں۔ مستقبل کے صف اول کے ادیب و صحافی۔ ادب عالیہ کا ایوان ابھی سے ان کے قدموں کی چاپ سن رہا ہے۔

(ابراہیم جلیس)

نوجوان لکھنے والوں میں حرف سے حکایت پیدا کرنے میں امیر حسین کمال رکھتے ہیں۔ وہ بڑی آسانی اور روانی سے ایک لمحے کی بات کو برسوں کی ملاقات پر پھیلا سکتے ہیں اور یہ کتنی بڑی بات ہے!۔

(احمد فراز)

امیر حسین کو میں حقیقتاً ایک گوہر یگانہ سمجھتا ہوں ان کے مضامین پڑھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ اس نوجوان نے اتنی چھوٹی سی عمر میں تجربات و مشاہدات کی ایک وسیع دنیا کس طرح اپنی روح میں سمیٹ لی ہے، امیر حسین کی سب سے اچھی بات جو مجھے بطور خاص متاثر کر رہی ہے یہ ہے کہ وہ جذبات کی رو میں کہیں بھی نہیں بہتے بلکہ فکر اور جذبے کے بھرپور توازن کے ساتھ اپنے تجربات و مشاہدات کو نہایت مناسب الفاظ میں پیش کر دیتے ہیں! مجھے امیر حسین کے تابناک مستقبل کا پورا یقین ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کی قلمکاریوں سے ادب اور صحافت دونوں کو بڑا فائدہ پہنچے گا اور ان کی وقیع ادبی خدمات یاد رکھی جائیں گی۔

(میرزا ادیب)

